زندگی

رضیہ بٹ

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 22934
19.12.82

نازکتاب گھر، شاندار مارکیٹ، دہلی ۶

891.4393
ز ۳۰۱

بار اوّل : ستمبر ۱۹۸۲ء
ناشر : محمد انوار
طباعت : جے۔ کے آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶
قیمت : بتیس روپے ۔/۳۲

ہماری کتابیں ★ خوبصورت کتابیں

عرض ناشر

رضیہ بٹ کا نیا ناول" زندگی " پیشِ خدمت ہے۔

اس میں رضیہ بٹ نے انسانی زندگی کے اہم پہلو
" انتقام" پر قلم اٹھایا ہے۔ زندگی کا یہ پہلو کوئی ایسا قابلِ تحسین
تو نہیں مگر اٹل اور ناگزیر ضرور ہے۔" زندگی" کے کردار
دراصل حقیقی زندگی کے کردار ہیں۔

محمد انوار

انتساب

نیلی، خالد اور دانی کے نام

رضیہ بٹ

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی
زندگی بن کے چھپا بیٹھا ہے

مدتوں پہلے کی بات ہے۔

ابتدائی تاریخوں کے چاند کی پھانک تھوڑی دیر کے لئے کیکر کی نوکیلی شاخوں کی پھننگ میں اٹکی اور پھر آہستہ آہستہ کاتک کی رات کے خنک اندھیروں میں ڈوب گئی۔ آسمان پر ستارے پوری طرح روشن تھے۔ شام کو دُھل دُھلا کر نکھرا ہوا نیلا آسمان ہی مائل ہو گیا تھا۔ سیاہی کے حوالے سے ستاروں کی چمک زیادہ ہی ہو گئی تھی۔

پیلاں والی گاؤں پر تاروں کی چھاؤں اتر رہی تھی۔ دُور دراز تک پھیلے کھیتوں اور ان کے کنارے اُگے قطار در قطار درختوں پر خنک اندھیرے پھیلے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی —— چاولوں کی فصل کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔ کچھ فصلوں کی حفاظت کے لئے درختوں تلے چارپائیاں ڈالے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ ہیر وارث شاہ اور سیف الملوک کے پڑھنے والے بھی موجود تھے۔ اپنی دلسوز اور

مترنم آوازوں میں معرفت کے کلام پڑھ کر خاموش فضا میں کیف و سرور کی لہریں دوڑا رہے تھے۔ کچھ لوگ ابھی ڈھور ڈنگروں کو ٹھکانوں پر باندھ رہے تھے۔ ان کے گلے میں پڑی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

عورتیں کام کاج ختم کر کے کچے دلانوں میں مٹی اور سرسوں کے تیل کے دیئے جلائے چرخے کاتنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں گھروں سے نکل نکل کر گاؤں کے مغربی کنارے والے میدان میں جمع ہو رہی تھیں —— کلی کلیر۔ —— لکن میٹی اور جھومر ڈالنے کو وہ ہر شب یہاں جمع ہو جاتی تھیں —— یہاں سب لڑکیاں صرف لڑکیاں ہوتیں۔ چوہدریوں کی بیٹیاں مزارعوں کی بیٹیاں کامیوں کی بیٹیاں سب یہاں ایک ہوتیں۔ گاؤں کی الھڑ بیٹیاریں جب مل کر جھومر ڈالتیں۔ تو فضا میں نغمگی رچ جاتی —— تالیوں کی گونج۔ قدموں کی دھمک اور قہقہوں کی بوچھاڑ کائنات کا سارا حسن یہیں جمع ہو جاتا ——

دھما چوکڑی بھی خوب مچاتیں۔ لکن میٹی میں جب کوئی لڑکی پکڑی جاتی تو شور شرابے سے فضا گونج اٹھتی ——

یہ روز کا معمول تھا —— گھنٹے دو گھنٹے کے لئے اس میدان میں رونقیں آباد ہو جاتیں —— دن بھر گھروں میں کھیتوں میں باپوں بھائیوں کے ساتھ مشقت کر لڑکیاں اندھیرے اترتے ہی اس میدان کا رخ کرتیں۔ اپنے اپنے گلی محلے کی سکھیاں جمع ہو کر دو دو چار چار کی ٹولیوں میں یہاں آجاتیں اور جب سب جمع ہو جاتیں تو پھر جوانی پر بھی جوانی

آجاتی ——

کچھ ہی فاصلے پر منچلے نوجوان بھی پہنچ جاتے۔ کوئی بانسری کی رہوش کن لے پر مست ہوتا۔ کوئی ماہیئے کے بول الاپتا —— کوئی اونچی نیچی آوازیں اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتا — تاکہ اپنے ہونے کا احساس ان الڑمٹیاروں کو دلا سکے۔

ستاروں کی جھلملاتی روشنی خنک اندھیروں میں گھل کر چاروں اور پھیل گئی تھی —— لڑکیاں کھیل کود میں مصروف تھیں۔ اپنی اپنی سہیلیوں کے ٹولے تھے — چوہدری رحمت علی کی بیٹی نازو کے ہاتھ میں کوٹلا تھا۔ اور وہ دائرے کی صورت بیٹھی پندرہ بیس لڑکیوں کے گرد گھومتے ہوئے کوٹلہ چھپاکی جمعرات آئی ہے " الاپ رہی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر جیراں اور بیگی کلی کلیردی۔ بھابو میرے ویردی .... بے ڈھنگے پن سے گاتے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ سختی سے پکڑے ہوئے ککلی ڈال رہی تھیں۔ وہ دونوں زوروں سے دائرے میں گھوم رہی تھیں —— [illegible] ٹے کرتے تہمند اور دوپٹے بھی اڑ رہے تھے۔ اردگرد [illegible] سے تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ کچھ [illegible] ہیں۔ شادو درخت کے ساتھ [illegible] سے کھڑی کہہ رہی تھی۔

[illegible] چھپ جانا مکٹی کا دانا۔ راجے کی بیٹی آگئی —— "

لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگ کر چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ کوئی بھی تو نہ چاہتی تھی۔ کہ شادو جب ڈھونڈنے آئے تو اس کے ہاتھ لگ جائے۔ چھپتے چھپتے لڑکیاں دور دور بھی چلی جاتیں۔ درختوں کی آڑ

لینے۔ کھڑی فصلوں میں دب کر [illegible]
پیچھے اپنے آپ کو چھپانے کی کو[illegible]
کھیل ہی کھیل میں زندگی کے [illegible] کھیل بھی شروع ہو جاتے۔
لُکن میٹی ان مستانی جوانیوں کا پسندیدہ کھیل تھا۔ جو اپنا مرکز تلاش کر چکی تھیں ان کے محبوب چشم براہ اردگرد منڈلاتے رہتے۔ اور وہ چھپنے کے بہانے ان کی مضبوط بانہوں اور چوڑی چکلی چھاتیوں میں آن چھپتیں۔ یہی تو وقت ہوتا جب وہ بے دھڑک اپنے چاہنے والوں سے مِل سکتی تھیں۔

شادو نے آخری بار زور زور سے کہا

"لک چھُپ جانا مکٹی دا دانا۔ راجے کی بیٹی آگئی جے ——"

"آجائے" کہیں دُور سے آواز آئی —— شادو پلٹی اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے تلاش کرنے لگی ——

روز کی طرح اسے زیادہ تگ و دَو نہ کرنا پڑی —— مٹی کی منڈیر کے پاس ہی اتو کھڑی تھی۔ اس نے لپک کر اسے پکڑ لیا ——

"چور چور ——" شادو [illegible] اور چھپی ہوئی لڑکیاں قہقہے لگاتے دوڑ دوڑ کر ادھر آئیں

"اتو چور —— اتو چور ——" سب نے شور مچا دیا۔

"نہیں جی ——" اتو جی "میں تو چھُپی نہیں تھی ——"

"نہیں چھُپی تھی تو ہمیں کیا" صاحباں بولی۔

"اب باری دے —— چل" شادو نے کہا۔

"نہیں بھئی" اتو مچلی۔

"کیوں جی" نوراں نے پوچھا۔
"آجا" باری دو سیدھی طرح سے" رحمتے نے اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر کھینچی
"میں کہتی ہوں۔ میں چھپی نہیں تھی۔ تو باری کیوں دوں" اس نے
رحمتے جھٹکے سے چھڑاتے ہوئے کہا۔
"قصور ہمارا تو نہیں ——" برکت بی بی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا
"نہ سہی —— پر میرا بھی نہیں —— میں تو جا رہی تھی" اتو بولی۔
"کہاں" سب نے پوچھا
"بنجو کو بلانے" اتو نے کہا "خدا جانے وہ کیوں نہیں
آئی آج"
"ہاں۔ بنجو کیوں نہیں آئی۔ ہم نے تو خیال ہی نہیں کیا" سب
سہیلیں۔
"میری تو سہیلی ہے نا پکی پکی ——" اتو نے کہا "مجھے تو خیال
آنا ہی تھا۔ میں تو اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ آئی نہیں ——"
"آئی ہوگی" شادو نے شوخی سے اتو کے کان میں کہا۔ پھر ہاتھ
سے درختوں کی طرف شوخ سا اشارہ کیا۔
اتو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آہستگی سے کہا "بانسری بج رہی
ہے بند تو نہیں ہوئی ——"
دونوں نے اک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
"کیوں ہنس رہی ہو۔ ہمیں بھی تو بتاؤ ——" صاحبان ان کے
قریب آگئی۔
"اپنی بات ہے" دونوں ہنس پڑیں۔

"اچھا ہم سے چھپ چھپ کر باتیں کر رہی ہو" — جی نے غصہ
تڑی دی۔ باقی بھی اس کی تائید کرنے لگے۔
"نہیں بھئی۔ نہیں" شادو نے جلدی سے کہا "نہ
آئی — پتہ نہیں کیا بات ہے
"کوٹلہ چھپاکی کھیل رہی ہو گی
"نہیں وہاں بھی نہیں ہے
"کِکلی ڈال رہی ہو گی"
"وہاں بھی نہیں ہے"
"جھومر ڈالنے کا اسے بڑا
"نہیں ہے نہیں ہے وہاں
آج وہ آئی نہیں"
"پتہ کرنا چاہیئے"
"میں جا تو رہی تھی۔ شادو نے پکڑ کر چھوڑ دیا۔
"چلو چلتے ہیں — اس کے بغیر کو کھیلا نہیں"
"چلو —"
"چلو"

پانچ چھ لڑکیاں رتو کے ساتھ نجو کو لینے اس کے گھر پڑیں۔ باقی جھومر ڈالنے والے ٹولے کی طرف چلی گئیں۔ گِدّا اور لوک ناچ اس گاؤں کی الہڑ دوشیزاؤں کو بہت مرغوب تھے۔

"ہاں"

"ماسی ابھی تک میرا ویر نہیں آیا"

"آجائے گا نجو رانی — شہر گیا ہوا ہے۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے اور ابھی تو شام ہی ڈھلی ہے —"

"شام ڈھلے بھی بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرے جی کو کچھ ہو رہا ہے ڈر لگ رہا ہے"

"پگلی — ادھر آجا میری چارپائی پر — میرے ساتھ لیٹ جا۔ ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں — تو کیسی ملکوں کی دھی ہے — تجھے تو ڈر لگنا ہی نہیں چاہئے —"

"یہ بات نہیں ماسی"

"تو پھر"

"بس بھائی جی کو دیر ہو جائے نا — تو پھر مجھے ہول آنے لگتا ہے —"

"بھائی کی دیوانی بیٹی۔ تیرا بھائی شیر ہے شیر ——"
"میرا بابا بھی تو پپلاں والی کا شیر مشہور تھا"
"ہاں"
"پھر ظالموں نے کیسے ذرا سی بات پر مار ڈالا ——"
"اسے دھوکے سے مارا —— دشمن کمینہ تھا نا —— سامنے سے ا
چھوڑ دس آدمی بھی وار کرتے تو وہ کوئی مات کھانے والا تھا ——"
"ماسی"
"جی رانیے"
"میرا بابا بہت بہادر تھا"
"ہاں نڈر بے باک اور بہادر۔ [illegible] پہ اڑ جانے والا ——"
"میں کتنی تھی۔ جب بابا قتل
"یہی دو [illegible] سال کی ہو گی"
"دشمنی کس سے تھی"
"اس کی تو کسی سے نہیں تھی بیٹی —— پرخار باری [illegible]
خاندان چل رہی تھی —— پچھلی صدی میں ان کے خاندان کا کوئی [illegible]
ہمارے خاندان والوں نے مار ڈالا تھا ——"
"پھر"
"پھر ان کے خاندان والوں نے ہمارا آدمی مار ڈالا ——"
"اور پھر ہمارے دادا کے بھائی نے سکھیروں کا لڑکا قتل کر دیا۔
"ہاں ——"
"پھر میرے بابا کی باری آگئی ——"

"نجو رانی"

ماسی اپنی چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ کھیس ٹھیک کیا۔ پھر گاڑھے کی چادر کی بکل ماری — اور موٹے رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر لیٹی نجو کو دیکھا۔ سرخ کنی دار کھیس اور پھول پتیوں والے کڑھے سرہانے پر سر رکھے نجو لیٹی تھی — وہ پٹی سے چمٹی ہوئی تھی — لالٹین کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی — سندور گندھے میدے کی سی رنگت۔ سیاہ گھنے بال۔ کالی بڑی بڑی آنکھیں چھوٹی سی کومل ناک گلابی بھرے بھرے ہونٹ اور کالے کُرتے سبز اوڑھنی میں لپٹا خوبصورت جسم۔ ملک رحمت علی کی یہ اکلوتی بیٹی اب ملک فضل علی کی اکلوتی بہن تھی۔ باپ قتل ہو گیا تھا۔ ماں چند سال پہلے مر گئی تھی۔ بھائی نے ماں اور باپ کا پیار دیا تھا۔ اتنی بڑی حویلی میں اکیلی نجو کا رہنا مشکل تھا۔ اس لئے دُور کی ایک رشتہ دار جس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا — عمر رسیدہ اور نیک عورت تھی۔ اسے نجو کے لئے حویلی میں بلا لیا گیا تھا۔

ماسی رابو فضل اور نجو دونوں کی ماں نہیں تھی۔ لیکن ماں کا پیار دیتی تھی۔ دونوں بہن بھائی بھی اس سے مانوس تھے — بہت پیار کرتے تھے۔ ماں ہی سمجھتے تھے۔ گھر میں اس کی موجودگی دونوں کے لئے تسلی کا باعث تھی۔ ورنہ اب تو وہ خاصی عمر کی ہو رہی تھی — نظر بھی ٹھیک طرح سے نہ آتا تھا — پھر بھی گھر میں ہونا غنیمت تھا۔

کام کاج کے لئے تو بہتیرے لوگ تھے۔ بکّو مراثی اور اس کی بیوی حویلی کے پچھلے کمروں میں رہتے تھے۔ ان کی تینوں بیٹیاں گھر کا سارا کام

کرتی تھیں۔ فضل نے انہیں فکر معاش سے بھی آزاد کر دیا تھا۔ میراثی تھے۔ لیکن وہ انہیں گھر کے افراد ہی کی طرح سمجھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی حیثیت نہیں بھولے تھے۔ مالک کو مالک ہی سمجھتے تھے — اور مالک کی خدمت بڑی دلجوئی اور تن دہی سے کرتے تھے۔

ڈھور ڈنگروں کو سنبھالنے والے اور بھی کامے موجود تھے۔ پھر گاؤں کے نائی دھوبی میراثی سبھی کام کرنے کو موجود ہوتے۔ ان کی بہو بیٹیاں بھی ضرورت پڑنے پر حویلی آجاتیں — اور ماسی رالو ان سے کام کروا لیتی۔

ملک فضل علی کی چار مربعے زمین تھی۔ زمین تو کافی تھی۔ لیکن کچھ باپ کے مقدمے کی نذر ہو گئی تھی۔ کچھ پر سوتیلے چچا کے بیٹوں نے قبضہ کر لیا تھا — وہ فطرتاً رحمدل اور صلح جو آدمی تھا۔ اس لئے کچھ زیادہ باز پرس نہ کی تھی۔ اسی زمین کے سینے سے سونا اگلتی فصلیں اگاتا تھا

سکھیروں سے خاندانی دشمنی چلی آتی تھی۔ لیکن فضل نے اس دشمنی کو دل سے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ دشمنی تباہی کی طرف لے جاتی تھی۔ اس لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ سکھیروں سے باوجود اس کے کہ وہ اس کے باپ کے قاتل تھے۔ کوئی پرخاش نہ رکھے گا۔

سکھیرے ساتھ والے گاؤں ہڑیالہ کے باسی تھے۔ کئی مربعے زمین کے مالک تھے۔ اونچے شملے والی پگڑیوں اور آگ نکالتے ٹاپوں والے گھوڑوں کے لئے ارد گرد کے کئی گاؤں پر اثر انداز تھے۔ کبھی کسی زمانے میں ایک سکھیرا خاندان یہاں آباد ہوا ہو گا۔ لیکن اب پھیلتے پھیلتے کئی

خاندان بن گئے تھے۔ زمینیں بٹ بٹ کر کم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی ایک ایک خاندان کے پاس پانچ پانچ دس دس مربعے زمین تھی ــــ

انہی خاندانوں میں چوہدری نذر کا خاندان تھا۔ اسی خاندان نے ملک رحمت علی کو کئی برس پہلے پانی کے جھگڑے کا بہانہ بنا کر قتل کر دیا تھا۔ اب چوہدری نذر کے تین جوان بیٹے تھے۔ نذر کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ دو بڑے بیٹے زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لیکن تیسرا بیٹا تاج شروع ہی سے پڑھنے کے لئے شہر چلا گیا تھا۔ اپنے حصے کی دولت پر خوب عیش کرتا تھا۔ تعلیم تو بہانہ تھی۔ شہری بن کر چند اوباش لوگوں کی صحبت مل گئی تھی۔ جو اس کی دولت سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور دوستی کے پردے میں لوٹ رہے تھے۔ تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی تھی ــــ لیکن کوٹھی خرید رکھی تھی ــــ اور زیادہ وقت وہ وہیں گزارتا تھا۔ کبھی کبھی گاؤں آتا تھا ــــ

سکھیرے اور ملک آپس میں ملتے جلتے بھی تھے۔ بہت سے خاندانوں کی آپس میں شادیاں ہو چکی تھیں۔ صرف نذر کا خاندان تھا۔ جس کی ملکوں سے کوئی رشتہ داری نہ تھی ــــ دشمنی اب دب چکی تھی۔ ملک فضل علی کا رویہ دیکھتے ہوئے سکھیرے بھی اپنے رویے میں تبدیلی لے آئے تھے۔ لیکن دشمنی کا بیج تھا ضرور۔

اسی لئے جب بھی ملک فضل کو شہر سے آتے دیر ہو جاتی۔ تو نجو کو ڈر محسوس ہونے لگتا ــــ کبھی کبھی تو یہ ڈر دل ہی میں دبا لیتی۔ لیکن کبھی کبھی جب برداشت نہ کر سکتی تو ماسی رابو سے کہہ دیتی۔

ماسی سے آج بھی وہ اپنے ڈر کا اظہار کر بیٹھی ــــ ماسی نے اسے

تسلی و تشفی دی۔

"میرے پاس آجا بیٹی" ماسی نے نجو کو بلایا۔

نجو اٹھ بیٹھی — سبز ریشمی دوپٹہ ٹھیک طرح سے لپیٹا — پاؤں میں جوتی پہنی اور مٹی کے پلے ہوئے فرش پر آہستہ آہستہ چلتی ماسی رابو کے پاس آ بیٹھی۔

ماسی نے حقے کی نے منہ میں لگا کر حقہ گڑگڑایا۔

"نہیں — ٹھیک ہے —" ماسی نے دھواں نگلتے ہوئے کہا "لیٹ جا میرے پاس"

"میں بیٹھوں گی ماسی"

"کھیلنے بھی نہیں گئی — چلی جاتی تو وقت گذر جاتا —"

"جب تک ویر جی نہیں آجاتا — میں کھانا کھاؤں گی نہ کھیلوں گی —"

"تسلی رکھ — کوئی کام پڑ گیا ہوگا — تیرے لئے چیزیں بھی تو ڈھیر ساری لانا ہوتی ہیں اسے —"

"بڑی سڑک سکھیروں کے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے ماسی — کہیں بابا کی طرح —"

"خیر مانگ رانیئے — سکھیروں کے ساتھ اب ہماری کون سی دشمنی ہے۔ باری تو اب ہماری ہے — اور فضل نے انہیں دل سے معاف کر دیا ہے — وہ — تو —"

ماسی کی بات ادھوری رہ گئی — اتو اور چاروں دوسری لڑکیاں در در کرتی صحن میں آگئیں۔

"نجو — نی نجو —" انہوں نے آوازیں دیں۔
"کیا ہے" نجو اُٹھ کر دالان سے باہر آگئی۔
"تیرا ستیاناس" رتو نے اس کے — مارا "آئی کیوں نہیں کھیلنے تیرے بغیر تو مزہ ہی نہیں آتا — چل جلدی"
"ہاں نجو — جلدی کرو — بڑا مزہ آئے گا لکن میٹی کا" شادو بولی
"میں نہیں جاؤں گی" نجو نے کہا۔
"کیوں"
"میرا ویر شہر سے نہیں آیا ابھی"
"نہیں آیا تو آجائے گا۔ فکر کی کیا بات ہے —"
"بھائی فضل جیسے جیالے کے لئے فکرمند ہونا حماقت ہی ہے"
"بالکل — کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"
"چل آ —"
"بھئی نہیں — میں ویر کے آنے کے بعد آؤں گی —"
نجو نے کہا تو رتو اس کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے آہستگی سے بولی "اور وہ جو بنسری بجا بجا کر پاگل ہو رہا ہے —"
"ہائے رتو۔ چپ رہ" وہ شرما کر ہولے سے بولی۔
"رب دی قسم" — کب سے بانسری بجا رہا ہے راجو — بیچارہ —"
رتو اور شادو دونوں نجو کی ہمراز تھیں۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔ باقی لڑکیاں اندر ماسی رابو کو سلام کرنے چلی گئیں —
رتو اور شادو کے اکسانے پر بھی نجو نہ گئی۔ اسے اپنے پیارے بھائی

کا انتظار تھا۔ جان اٹکی ہوئی تھی ـــــ کیسے جاتی ۔
سکھیاں چلی گئیں ۔
نجو گلی میں کتنی دیر کھڑی بھائی کی راہ دیکھتی رہی ۔ راجو کا خیال بھی آرہا تھا ۔ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گذارنا اس کے لئے کتنا مشکل ہوگا لیکن یہ سوچ کر بھی وہ رتو وغیرہ کے ساتھ نہ گئی ـــــ

تانبے کی سی تپتی رنگت بھاری بھاری مونچھیں اونچا لانبا قد
بھاری بھاری۔ بھرا بھرا جسم۔ خوش مزاج ہنس مکھ اپنوں کا کیا غیروں
کا بھی دوست دُکھ سُکھ میں کام آنے والا — یہ تھا ملک فضل علی
نجو کا پیارا پیارا ایک اکلوتا بھائی۔ جس کے انتظار میں وہ کبھی دالان
میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی صحن میں کھڑی ہو جاتی۔ کبھی حویلی کے صدر دروازے
پر جا کھڑی ہوتی — حویلی کی پکی بیٹھک میں تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔
اور حویلی اور زمینوں پر کام کرنے والے تینوں چاروں افراد دری پر
لیٹے لیٹے سو رہی تھے —

"یا اللہ میرے بھائی کو خیریت سے لے آ" کھُلے آسمان تلے نجو نے
اپنا دوپٹہ پھیلا کر آسمانوں اور زمینوں کے مالک سے استدعا کی۔

"نجو رانئے" ماسی رابو نے دالان سے آواز دی۔

"جی ماسی"

"ادھر آ۔ میرے پاس بیٹھ جا"

"کتنی دیر تو بیٹھی رہی ہوں"

"فکر کیوں کر رہی ہے پگلی ـــ کام پڑ گیا ہوگا ـــ اس ـــ"

ماسی رابو کی بات ادھوری رہ گئی ـــ گلی میں فضل کی گھوڑی کے نیچے تُلے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں میں پڑی کڑیاں چھنک رہی تھیں۔ فضل کی گھوڑی جب سینہ تانے ٹھمک ٹھمک چلتی تو زمین کے سینے میں دل دھڑکنے لگتا تھا۔ گھوڑی اور گھوڑی کے سوار کو لوگ گردنیں موڑ موڑ کر دیکھتے تھے۔

ٹاپوں کی آواز دروازے پر رک گئی۔ گھوڑی مخصوص انداز میں ہنہنائی۔ نجو دوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا اس نے فضل کو گھوڑی سے اتر کر اس کی گردن تھپتھپاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ویر ـــ پیارا ویر بخیریت واپس آگیا تھا۔ تسلی کو اتنا ہی کافی تھا ـــ نجو بھاگ کر ماسی رابو کے بستر میں آگھسی۔

"لے آگیا نا تیرا ویر"، ماسی رابو نے حقے کو گڑگڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ماسی"

"تو اب یہاں کیوں آگھسی ہے۔ جا کر دیکھ تو اسے"

"میں نہیں بولوں گی اس سے۔"

"کیوں"

"بس ـــ اتنی دیر سے کیوں آیا ہے ـــ"

"اتنی بڑی ہوگئی ـــ پر پگلی کی پگلی ہی ہے۔ کہاں تو اس کے انتظار میں اتنی پریشان ہو رہی تھی۔ اور ـــ"

"سلام ماسی" فضل گھوڑی صحن میں باندھ کر کمرے کے دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے بنڈل تھے۔

"جیتے رہو۔ جگ جگ جیو ——"

"نجو کہاں ہے ماسی ——"

ماسی کو نجو نے کمر میں پھتپھا کر چُپ رہنے کو کہا۔

"اندر آجا" ماسی نے فضل سے کہا۔

وہ اندر آگیا۔ ہاتھ میں پکڑی چیزیں نجو کے پلنگ پر ڈال دیں۔ خود بھی پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا ——

نجو ماسی کے کھیس میں چھپی لیٹی تھی۔ دئے کی روشنی میں وہ نظر بھی تو نہ آرہی تھی۔

فضل نے پھر پوچھا "ماسی نجو کہاں ہے۔ کھیلنے گئی ہے ——"

"تو ہی بتا —— بھلا وہ جا سکتی ہے کھیلنے"

"تیرے پاس سو گئی ہے"

"سو سکتی ہے۔ جب تک تو نہ آئے ——"

"ہوں —— تو رُوٹھ کر پڑ گئی ہے"

"ہاں روٹھ گئی ہوں" کھیس پرے ہٹا کر نجو چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ فضل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ادھر آ ——" اس نے بڑے پیار سے نجو کو بلایا۔

"نہیں آتی۔ نہیں آؤں گی"

"ناراض"

"ہاں"

"گھاٹے میں رہے گی۔ دیکھ تو کیا کچھ لایا ہوں شہر سے تیرے لئے"
"مجھے نہیں چاہئیں چیزیں۔ بس وقت پہ گھر آجایا کرو۔ اتنا ہی کافی ہے"
وہ چارپائی سے نکل کر آہستہ آہستہ فضل کی طرف آگئی —— نہ بسورے اس کے پاس آن کھڑی ہوئی ——
فضل نے اسے پیار سے اپنے قریب بٹھالیا — اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور بولا "کتنی بار کہا ہے مجھ سے روٹھا نہ کر"
"میں نے بھی تو کتنی بار کہا ہے کہ دیر سے نہ آیا کرو —— شہر سے تم جلدی نہیں آسکتے تھے؟"
"روٹی کھالی ہے"
"نہیں"
"چل پھر لا روٹی — کھانیں —"
"پہلے بتاؤ کیا کچھ لائے ہو ——"
فضل ہنس کر بولا "چالاکو ماسی — جا پہلے روٹی لا —— بہت بھوک لگ رہی ہے"
بخو اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی باہر نکل گئی ——
"ماسی کو کھلا دی تھی۔ یا اسے بھی ابھی تک بھوکا مارا ہے"
"میں نے تو کھالی تھی پترا — یہی تیری چہیتی بھوکی بیٹھی ہے اب تک — تھوڑی دیر اور نہ آتا تو — تو بس رو رو کر بے حال ہو جانا تھا اس نے ——"
"ماسی کام بہت تھے — شہر روز روز تو جانا ہوتا نہیں —

اسے کہہ کر بھی گیا تھا۔ "

"دِل کی بات ہے نا — اس کی تو جان ہے تجھ میں "

مجھے بھی تو جان سے زیادہ عزیز ہے یہ — بہن سے زیادہ مجھے تو بیٹی لگتی ہے — اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اب بھی بچی لگتی ہے — جی چاہتا ہے اسے کندھوں پر اٹھائے پھروں جیسے بچپن میں اٹھائے پھرتا تھا — "

ماسی رابو نے حقہ گڑگڑایا۔ پھر ہنس کر بولی "اب ذرا پیار کم کیا کر — جوان ہوگئی ہے — بیاہ کرنا ہے — جدا کرنا ہے اسے —"

"جانتا ہوں ماسی — "

دونوں باتیں کرنے لگے — نجو کے لئے دو تین جگہ سے پیغام آچکے تھے — لیکن فضل نے ابھی تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا — ماسی رابو اکثر احساس دلاتی رہتی تھی — آج بھی وہ نجو کے بیاہ کی باتیں کرنے لگی۔

"کرنا ہی ہے ماسی — دیکھتی جاتو — انشاءاللہ اپنی بہن کا اس دھوم دھام سے بیاہ کروں گا۔ کہ دُنیا دیکھے گی — "

میری مرضی تو یہ ہے۔ کہ پہلے اپنا کر گھر میں وہٹی آجائے پھر نجو کو پرائی کردیں گے — "

"اوں ہوں "

"کیوں "

"پہلے نجو کی ڈولی اُٹھے گی۔ پھر بیگاں اس گھر میں آئے گی "

"بچیا — بیگاں تیری بچپن کی منگ ہے۔ سکینہ کئی بار

مجھے کہہ چکی ہے اشاروں اشاروں میں ——"

"پھوپھی کی بھلی کہی تو نے —— مجھے بھی کہتی ہے —— لیکن میں نے دِل میں عہد کر لیا ہوا ہے —— نجو کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی ہو گی ——"

"یہ کیا بات ہوئی"

"بس ——"

"چار دن نجو کو بھی بھابھو کے ساتھ مل جل کر رہ لینے دے —— تو اسے جتنا پیارا ہے بیگاں بھی اتنی ہی عزیز ہے"

"ہاں ماسی میں جانتا ہوں —— اسی لئے تو کہتا ہوں۔ کہ نجو کی شادی کر کے اپنی شادی کروں گا —— ڈرتا ہوں۔ پہلے بیگاں یہاں آگئی —— تو کہیں نند بھابی والا چکر نہ شروع ہو جائے"

ماسی رابو کے پوپلے سے منہ سے قہقہہ پھیل گیا "اچھا یہ بات ہے۔ سیانا ہے تو واقعی ——"

"شک ہے کوئی ماسی۔ میرے سیانا ہونے میں ——"

"ہاں ہے" ماسی کی جگہ نجو بولی جو بھائی کے لئے کھانا لے کر آگئی تھی ——

"ٹھہر تو۔ کیا کہا تو نے —— کان مروڑ دوں گا ——" فضل نے دھونس جمائی۔

"ہائے ہائے ہائے ——" اٹھلاتے ہوئے نجو بولی۔

فضل اُٹھ کر ہاتھ دھونے چلا گیا۔ نجو نے چنگیر میں روٹی ساگ کی تھالی اور مکھن کا پیالہ رکھا —— دُودھ کا کٹورہ پلنگ کے قریب

زمین پر رکھ دیا۔
فضل آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے نجو بھی بیٹھ گئی ——
دونوں کھانا کھانے لگے۔
"کیا کچھ لائے ہو ویر جی" نجو نے نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔
"ابھی دیکھ لینا" فضل مکھن نوالے میں لپیٹتے ہوئے بولا۔
"بتاؤ نا ——"
"روٹی نہیں کھائی جائے گی۔ جب تک جان نہ لے گی کہ کیا کچھ آیا ہے"
"بالکل ——"
"بتاؤں"
"ہاں"
"تیرے لئے لال جوڑا لایا ہوں"
"لال کیوں میں نے تو پیلے پھولوں والا کہا تھا"
"لال جوڑا تیرے بیاہ کے لئے ——"
"جھوٹ —— اپنی بیگاں کے لئے لائے ہو گے نا"
"بیگاں سے پہلے تجھے پہناؤں گا"
"میں نہیں بولتی" نجو نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فضل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نوالہ تھماتے ہوئے کہا "پگلی کھانا کھالے۔ پھر روٹھنا ——"
وہ ہنس پڑی۔
فضل اسے شہر سے لائی ہوئی چیزوں کی تفصیل بتانے لگا۔ نجو

خوش ہوگئی — پیار سے بھائی کو دیکھا — کتنا اچھا تھا اس کا دیر — اس کے دل سے بھائی کے لئے دُعائیں نکل رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ برتن اٹھا کر لے گئی۔ فضل بھی اپنے کمرے میں چلا گیا واپس آکر نجو ایک ایک چیز کھول کر دیکھنے لگی۔

زیور کا جڑاؤ سیٹ — لال جوڑا — کانچ کی چوڑیاں اس کے علاوہ گھر کے استعمال کی کئی چیزیں تھیں۔

سب چیزیں اٹھا کر اس نے سنبھال دیں —

پھر بستر میں لیٹ گئی۔

جڑاؤ زیور اور لال جوڑا — وہ جھلمل جھلمل کرتی آرزوؤں کی حسین دنیا میں کھو گئی — اسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ جاگتی رہی —

وہ

تو

اس وقت بھی جاگ رہی تھی۔ جب راجو بنسری پر دلگداز نغمہ گنگناتے ہوئے گلی سے گزرا تھا —

"بیچارہ" وہ پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ اور پھر اسی مسکراہٹ میں ڈوبی ڈوبی سو گئی تھی۔

یاقوتی رنگ کے دبیز قالینوں موٹے موٹے مخملیں پردوں
زم زم صوفوں گدے دار منقش کرسیوں بڑی بڑی دیوار گیر پینٹنگوں
ور جھلمل جھلمل کرتے کرسل کے فانوسوں والے بڑے سے ڈرائینگ روم
س گل پروشے نے قدم رکھا۔ تو بت بن گئی۔ پھیلی پھیلی شربتی حیران
نکھوں سے در و دیوار کو دیکھا۔ اور پھر جیسے یہ سب کچھ ہونے کا یقین
ہ آیا۔ اپنے برابر کھڑے اونچے لانبے خوبصورت جوان کو پکڑ لیا۔۔۔
ل پروشے کے لئے تو موڑ ہی عجوبہ تھی۔ اب یہ گھر۔۔۔

انگریزی لباس میں ملبوس جوان اس کی بیساختہ حرکت پر مسکرا دیا۔
گل پروشے " نوجوان نے اس کی ۔۔۔ اسی کمر کے گرد بازو
والا ۔۔۔ اور اسے اندر لے جا کر ایک لچکیلے صوفے پر بٹھا دیا۔

گل پروشے نے اپنے چاند جیسے چہرے پر جھک آنے والے بال
یچھے ہٹائے اور اپنی حیرانگی سے پھیلتی شربتی آنکھیں قیمتی اَن دیکھی
چیزوں پر گاڑ دیں۔

"سرتاج" وہ سہمی سہمی نظر آرہی تھی۔
"صرف تاج کہو گل پروشے۔ میرا نام سردار تاج محمد سکھیرا ہے۔"
"تاج" سردار ـــ سکھیرا ـــ" وہ آہستہ آہستہ بولی۔
"ہاں" وہ اس کے پشتون لہجے پر مسکرایا۔
"مجھے یہاں ڈر لگتا ہے تاج" گل پروشے پٹھانی لہجے میں بولی۔
"کیوں" وہ مخمور نظروں سے اسے تکنے لگا۔
"پتہ نہیں ام ایور کیسے رہے گا"
"تم اپنے گھر میں آئی ہو۔ گل پروشے۔ اور اپنے گھر میں بھی کوئی ڈرتا ہے"
"یہ۔ ـ یہ گھر میرا ہے"
"ہاں ـــ بالکل ـــ کیا میرا تمہارا نکاح نہیں ہوا"
"ہوا ہے"
"پھر ـــ"
"میں نے ـــ میں نے ایسا گھر پہلے کبھی نہیں دیکھا سردار"
تاج اس کے قریب بیٹھ گیا ـــ اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے اسے اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا ـــ وہ سہمی سہمی اس سے لگ گئی۔

تاج نے اس کے گالوں پر جھولنے والی لٹوں کو ہونٹوں سے چھو لیا ـــ گل پروشے ابھی تک حیرانگی کا پیکر بنی تھی۔ سولہ سترہ سالہ پہاڑی دوشیزہ جو پتھر کے گھروں میں رہنے کی عادی تھی۔ جو ننگی زمین پر سوتی تھی۔ جس کے اوپر پیوند لگی گدڑی کا لحاف ہوتا تھا ـــ آج

سپنوں سے بھی زیادہ حسین گھر میں آگئی تھی ——
تاج نے گھنٹی بجائی۔ نوکر آگیا۔ دیہاتی قسم کا آدمی تاج کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
"جی صاحب جی"
"چائے لاؤ —— ساتھ کھانے پینے کے لئے بھی کچھ ہو۔"
"اچھا صاحب"
"جلدی"
"بہتر"
علما پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ تاج گل پروشے سے پھر چھیڑ چھاڑ کرنے لگا ——
گل پروشے جو ابھی تک اس طلسماتی ماحول سے سہمی سہمی تھی۔ تاج کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ نہ ہو سکی ——
"یہ —— یہ سب کچھ تمہارا ہے تاج" اس نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔
"میرا نہیں تمہارا میری جان" تاج نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا —— اور خوشیوں کی انوکھی انجانی اور اچھوتی سی لہر گل پروشے کے نرم و گداز اور خوبصورت جوان جسم میں دوڑ گئی۔
"چائے پی کر تمہیں سارا گھر دکھاؤں گا" اس نے گل پروشے کے نرم پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر کہا۔ "تم اس گھر کی رانی ہو۔ گل پروشے رانی ——"
"سچ" گل پروشے بے اختیارانہ اس سے لپٹ گئی —— "سردار

تم بوت اَچّا ہے"

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی — چائے کے ساتھ کھانے پینے د میٹھی اور نمکین چیزیں تھیں —

تاج نے چائے بنا کر گل پروشے کو دی۔ پھر اپنے لئے پیالی بنائی اب گل پروشے کچھ کچھ نارمل ہو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار بھری نشیلی کیٹلی نظروں سے دیکھتے چائے پی۔

چائے کے بعد تاج گل پروشے کو گھما پھرا کر گھر دکھانے لگا — کھانے کا کمرہ — بیڈ رومز لان کچن سٹور سب کچھ دکھایا — اپنی خواب گاہ میں اسے لایا تو گل پروشے پھر حیران حیران نظروں سے چیزیں دیکھنے لگی —

"یہاں بیٹھو" تاج نے اسے لچکیلے گدوں والے پلنگ پر بٹھا دیا۔ "گھبراؤ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا —"

گل پروشے سوات کی رہنے والی تھی۔ سیدو شریف کے قریب ہی اس کا گاؤں تھا۔ قلقل کرتے چشموں لہلہاتے سبزوں اور سبز پتھریلے پہاڑی علاقوں میں پلی یہ لڑکی پھولوں کی طرح شگفتہ تھی۔ لیکن پتھروں کی طرح سخت بھی تھی۔ بچپن میں والدین مر گئے تھے۔ سیدو شریف کے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار خان بابا نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ جانے وہ اس کا کچھ لگتا بھی تھا۔ کہ صرف خدا ترسی سے پناہ دی تھی۔ خان بابا تو اچھا آدمی تھا۔ لیکن اس کی بیوی بی بی ظالم عورت تھی۔ گل پروشے نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ لاتوں۔ گھونسوں اور مکّوں کو ہی اپنے جسم پر محسوس کیا تھا۔ گالیاں سنتے سنتے کان پک گئے تھے۔ سارا دن

قت کرتی جنگل سے لکڑیاں چُن چُن کر بڑے بڑے گٹھے سر پر اُٹھا کر
ی۔ بکریاں چراتی بی بی کے بچوں کو سنبھالتی۔ وقت بے وقت گڑ کی
ئے بی بی کے لئے بناتی۔ بی بی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے صرف حکم چلایا
تی تھی۔

گل پروشے حساس لڑکی تھی۔ پیار کے دو بول سُننے کو ترستی رہتی
ی۔ اس کے اندر گل پروشے پیار نہ پاکر وحشی اور خونخوار ہو گئی
ی — کئی دفعہ یہ اندر کی گل پروشے چاہتی کہ بی بی کا سوتے میں گلا
ونٹ دے۔ اس کے بچوں کو اٹھا کر دریائے سوات کے تیز رفتار
نیوں میں پھینک دے — بی بی کے پتھریلے گھر کو تہس نہس
دے۔ وہ سوتے میں بھی ایسے ہی وحشیانہ خواب دیکھتی —
س کے اندر نفرت کدورت اور انتقام کی آگ بھری ہوئی تھی
پچھلے ہفتے ریسٹ ہاؤس میں تاج اپنے چار دوستوں کے ساتھ
ا۔ تاج نے نئی نئی گاڑی خریدی تھی۔ ان دنوں گاڑیاں سرکاری
سروں کے پاس ہوتی تھی۔ انگریز بہادر گاڑیوں اور جیپوں میں گھومتے
رتے تھے۔ شہر کے کسی کسی رئیس نے گاڑی خریدنے کی ہمت کی
ی — سردار تاج محمد سکھیرا کا شمار بھی شہر کے رئیسوں میں ہی
وتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی کے علاوہ ٹمبر کی بزنس بھی تھی — اسی
سلسلے میں سوات آنا جانا ہوتا تھا۔ گاڑی ضرورت بھی تھی اور ظاہری
ٹھ باٹھ اس کے متقاضی بھی تھے — دوستوں کو سیر کرانے اور
زنس کی خاطر وہ سوات آیا تھا۔

گل پروشے خان بابا کے پاس جانے کیا لینے آئی تھی۔ کہ تاج محمد

کی نظر اس جنگلی پھول پر پڑ گئی —

گل پروشے نے اس وقت چھینٹ کا گھیر دار کرتا۔ تنگ موری کی بھاری شلوار اور کالی چادر سر سے پیچھے کی طرف ڈال رکھی تھی۔ لباس اتنا میلا اور اس قدر بوسیدہ تھا۔ کہ پتہ نہ چلتا تھا کس کپڑے کا بنا ہے — اتنے پیوند اور اتنے سوراخ تھے کہ اصلی کپڑا ہی گم ہو چکا تھا — لیکن کیچڑ میں کنول کی مثال صادق آتی تھی۔ اس کا سرخ و سپید بے داغ چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اور ماتھے پر کٹے بال اس چاند کی خوبصورتی میں بے بہا اضافہ کرتے تھے۔

تاج صرف لکڑی ہی کا بیوپاری نہ تھا۔ عورت بھی تجارتی مال کی طرح اس کی زندگی میں آتی جاتی تھی — گل پروشے کو دیکھا تو مچل گیا۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ دوستوں سے ذکر کیا — جو بات ان سب کو انہونی لگ رہی تھی۔ وہ پل بھر میں ہو گئی —

خان بابا اور بی بی تو گل پروشے سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ سو دو سو میں بھی اس کا سودا کر لیتے — وہ تو خوشی سے پھولے نہ سمائے جب بولی شروع ہی ایک ہزار سے ہوئی۔ ایک ہزار کا تو ان کے لئے تصور بھی ممکن نہ تھا۔

سودا طے ہوا۔ تو بی بی نے گل پروشے کو نہلا دھلا کر نیا جوڑا پہنایا — اور تاج کے حوالے کرنا چاہا —

گل پروشے سب کچھ دیکھ رہی تھی سن رہی تھی — لیکن اپنے آپ کو تاج کے حوالے کرنے سے پہلے بولی۔

نکاح کے بغیر ام اس کے سات نہیں جائے گا ــــ "
خان بابا اور بی بی کو تو ہاتھ پاؤں پڑ گئے ــ ایک ہزار ان کے لئے قارون کا خزانہ تھا۔ گل پروشے کی ضد اور اکڑ سے بھی واقف تھے۔ پہاڑ ٹل سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی بات جو کہہ دے اس سے نہ ٹلتی تھی جبر و تشدد بھی اس کی ضد نہ توڑ سکتے تھے۔
"تاج کو پتہ چلا تو ہنس دیا ــــ " کیا فرق پڑتا ہے ــ نکاح کر دو "
اسے واقعی کیا فرق پڑتا تھا ــ نکاح ہو یا نہ ہو ــ عورت اس کے لئے رنگین کھلونا تھی ــ جب تک جی نہ بھرتا اس سے کھیلتا ــ پھر پھینک دیتا
چنانچہ
مشکل حل ہو گئی ــــ
اور
"تاج گل پروشے سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔ گل پروشے کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا ــ گاڑی اس کے لئے نئی چیز تھی۔ وہ سارا راستہ خوف کھاتی کبھی خوش ہوتی رہی ــــ
اور
جب گھر آئی ۔ تو گھر اور اس کی آرائش و زیبائش دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔

بڑی سڑک پر سفید گھوڑی سینہ تانے دوڑی جا رہی تھی۔ فضل پھوپھی سکینہ کے ہاں جا رہا تھا۔ بیگاں کو دیکھے کافی دن ہو گئے تھے۔ کئی دِنوں سے وہ کھیتوں پر بھی نہ آ رہی تھی۔ حالانکہ منجی کی فصل سمٹی جا رہی تھی۔ پھوپھی سکینہ اس کے تینوں بیٹے چھوٹی بیٹی فضلاں اور کنبے کے سارے افراد کھیتوں میں موجود ہوتے تھے۔

سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ اور فضا میں چاولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ راوی اور چناب کے درمیانی علاقوں میں میلوں میل پھیلے گاؤں منجی کی مہک دے رہے تھے — چاول اس علاقے کی مشہور فصل تھی — کلیوں کی طرح کی خوشبودار باسمتی کے لئے تقریباً سارے گاؤں مشہور تھے۔

فضل گھوڑی دوڑائے کوٹلی جا رہا تھا۔ یہ ہڑیلے کے ساتھ ہی چھوٹا سا گاؤں تھا — دونوں گاؤں کی زمینیں ایک دوسرے سے پیوست ہی تھیں — فضل کی رشتہ کی پھوپھی یہاں بیاہی تھی اس

کا خاوند بشیر اس گاؤں کا نمبر دار بھی تھا۔ سکینہ کی دوسری بیٹی بیگاں فضل کی منگ تھی۔ بچپن ہی میں رشتہ طے ہو گیا تھا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا گیا تھا۔ بیگاں اور فضل کے بندھن مضبوط ہوتے گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔

بھرے بھرے مضبوط جسم گندمی رنگت اور کالے بالوں اور بڑی بڑی ہرنی ایسی آنکھوں والی بیگاں نجو کی بھی بڑی چہیتی تھی۔ دونوں رشتہ کی بہنیں بھی تھیں۔ لیکن بہناپے سے زیادہ دوستی تھی۔ بڑی پکی سہیلیاں تھیں — پہلے پہلے تو بیگاں بھی نجو کے ہاں آجاتی تھی۔ ہفتہ ہفتہ رہ کر جاتی تھی۔ لیکن اب وہ نہیں آتی تھی۔ پھوپھی سکینہ مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اب تو نجو ہی اسے ملنے آیا کرتی تھی۔

آج نجو کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ اور اس نے فضل سے کہا بھی تھا "ویر مجھے کوٹلی چھوڑ آؤ"

"کیوں" فضل زیر لب مسکرایا تھا۔

"بیگاں سے ملنے کو جی کر رہا ہے"۔

"چلو تمہاری جگہ میں مل آتا ہوں"

"تم وہاں جا رہے ہو"

"ہاں"

"پھر مجھے کیوں نہیں لے جاتے"

"کبھی تو اکیلے جانے دیا کرو" فضل ہنس کر بولا تھا تو نجو بھی ہنس پڑی تھی۔

"جاؤ جاؤ — ٹھیک ہے" اس نے فراخدلی سے اجازت

دے دی تھی۔

فضل اس کے سر پر تھپکی لگا کر بولا تھا "مجھے اور بھی کام ہیں شاید شہر بھی جانا پڑے ـــ ورنہ تجھے ضرور ساتھ لے چلتا ـــ چل وعدہ رہا کل کوئی کام نہ ہوا تو چھوڑ آؤں گا"

اب فضل کوٹلی جا رہا تھا ـــ اس کی سفید گھوڑی اُڑی جا رہی تھی ـــ پکی سڑک پر ٹاپوں کی مسلسل ٹک ٹک بڑی مترنم لگ رہی تھی ـــ

وہ بڑی سڑک سے کچی سڑک پر اترا ـــ اور ٹہریالے کے ساتھ ساتھ جا کر کوٹلی جانے والی سڑک پر ہو لیا ـــ

تھوڑی دُور ہی گیا تھا۔ کہ اس نے بڑے میدان میں لوگوں کو جمع دیکھا ـــ عورتیں مرد بچے بوڑھے جمع تھے۔ یوں جیسے میلہ لگا ہو۔

تجسس نے ابھارا وہ باگیں موڑ کر گھوڑی کو میدان کی طرف لے آیا۔

"کیا بات ہے بھائی" اس نے ایک دیہاتی سے پوچھا "یہاں لوگ کیوں جمع ہیں۔ خیر خیریت ہے نا ـــ"

"ہاں ہاں بالکل خیر خیریت ہے ـــ" دوسرا آدمی بولا۔

"پھر لوگ کیوں جمع ہیں"

"یہاں تماشہ ہونے والا ہے" ایک معمر دیہاتن جو سر پہ لسی کا گڑوا اٹھائے تھی ہنس کر بولی۔

اور پیشتر اس کے کہ فضل کچھ اور پوچھتا پہلا دیہاتی بولا "تاج سکھیرا موٹر لے آیا ہے ـــ پہیوں والی موٹر ـــ خود بخود چلتی ہے ـــ

ولایت سے منگوائی ہے اس نے — ابھی وہ اسے میدان میں چلا کر دکھائے گا ——"

"اچھا ——" فضل دیہاتیوں کے معصوم ذوق و شوق پر مسکرایا۔ دیہاتی عورتوں بچوں اور اکثر مردوں نے موٹر نامی چیز دیکھی تھی نہ سُنی کچھ مرد ہی ایسے تھے۔ جو شہر جاتے اور صاحب بہادروں کی موٹریں سڑکوں پر دیکھ لیتے — دیہاتیوں کے لئے یہ اک عجوبہ تھا۔ اور اسے دیکھنے صرف ہڑیالہ ہی کے نہیں ارد گرد کے دوسرے گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو رہے تھے۔

اپنے گاؤں کے کئی لوگ بھی فضل کو نظر آئے۔ کوٹلی کے کئی بندے بھی دیکھے — شاہ پور اور سوانی کے لوگوں کو بھی دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ بیگاں سے ملنے کی لگن تھی۔ وہ جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا — اسے یقین ہو گیا کہ بیگاں گھر میں اکیلی ملے گی — اکیلے میں ملنے کے تصور ہی سے وہ جھوم گیا۔

وہ بیگاں کے گھر کے سامنے گھوڑی کی باگیں کھینچ کر رکا — دروازہ کھلا تھا۔ اور کچا صحن نظر آ رہا تھا۔

گھوڑی سے اتر کر اس نے بیگاں کے بھائی کو پکارا "رحمے۔ او رحمے"

رحما گھر تھوڑا ہی تھا ——

بیگاں کھرے پر بیٹھی دودھ کی چائی کو چ رہی تھی — ہاتھ میں کوچی پکڑے پکڑے لپک کر آئی — فضل کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ـــــ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور آنکھوں نے آنکھوں میں سرور و کیف کے جام انڈیل دئے۔

"تو کیسے آیا فضلے ـــــ" بیگاں لجا کر بولی۔

"اندر آنے کو نہ کہو گی" وہ شوخی سے مسکرایا۔

"آجاؤ ـــ پر گھر میں کوئی نہیں ہے"۔

"تُو ـــ تو ہے"

"بے بے چاچا بھائی کوئی بھی نہیں ہے"

"میں تو تیرے لئے آیا ہوں بیگاں"

"ہائے اللہ ـــــ"

بیگاں شرما کر وہاں سے ہٹ گئی۔ فضل گھوڑی کو دروازے کے قریب باندھ کر اندر آگیا۔

"بیٹھ جا" کھُرے کے پاس پڑی چارپائی پر بیگاں نے کالی اور پیلی ڈبیوں والا کھیس بچھا دیا۔

فضل بیٹھ گیا۔ بڑے سے صحن کے ایک طرف دالان تھے دوسری طرف چھوٹے کمرے۔ دائیں طرف مٹی کے جھکے جھکے چھت والا برآمدہ تھا۔ جس کے نیچے چولھے وغیرہ بنے تھے۔ یہ باورچی خانہ بھی تھا۔ اور فالتو چارپائیاں رکھنے کی جگہ بھی ـــ رنگین پایوں والی نواڑی چارپائیاں وہاں کھڑی تھیں۔

کھُرے پر دودھ کی چاٹی پڑی تھی۔ جسے تھوڑی دیر پہلے بیگاں مانجھ رہی تھی ـــــ

صحن میں مُرغیاں دانہ دنکا چُنتی پھر رہی تھیں ـــ دو تین نیم کے

درخت بھی تھے ـــ کمروں کے سامنے گلاب کے بوٹے بھی تھے۔ دو ایک پھولدار بیلیں بھی دیواروں پر چڑھتی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے قریب اپلوں کی سلگتی آگ پر مٹی کی بڑی سی ہانڈی میں دودھ چڑھا ہوا تھا ـــ دھیمی دھیمی آگ پر ابلنے والے دودھ پر پیلی پیلی بالائی کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔

"کیسی ہو بیگاں۔ کہاں گھوم پھر رہی ہو ـــ اِدھر آکر بیٹھو میرے پاس"

"نہ جی"

"کیوں"

"شرم آتی ہے ـــ"

"اس میں شرم کی کیا بات"

"بس"

بیگاں شرما کر مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پھر چاٹی دھونے بیٹھ گئی ـــ

"بیگاں" فضل نے پکارا۔

"ہاں" وہ اس کی طرف پشت کئے زوروں سے بازو ہلاتے چاٹی مانجھتے ہوئے بولی۔

"میں تیرے گھر آیا ہوں"

"ہاں"

"اتنے دِنوں سے تجھے دیکھا نہیں تھا ـــ آج آیا ہوں تو یوں کمر موڑے بیٹھی ہے"

وہ ہنستے ہوئے مڑی اور کھُرے کی بنّی پر بیٹھتے ہوئے اس کو تکنے لگی۔ "دُودھ پیو گے یا لسّی"

"کچھ نہیں"

"خفا ہو گئے"

"ہاں"

وہ ہنس پڑی — اس کی ہنسی میں نقرئی گھنگھروں کی کھنک تھی۔ فضل کا جی چاہا اُٹھ کر اسے بازوؤں میں دبوچ لے۔ غنیمت ہی تھا جو بیگاں اُٹھ کر دُودھ لینے چلی گئی۔

وہ بڑے سے لمبے گلٹ کے گلاس میں دودھ بھر لائی — موٹی بالائی بھی اس نے دودھ میں ڈال دی۔

"لے" اس نے کہا

فضل نے گلاس لے کر چارپائی کے پاس رکھ لیا — اور شوخی سے بیگاں کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"ہائے — فضلے کیا کر رہا ہے — ابھی کوئی آجائے تو کوٹھے سے ہی کسی نے جھانک لیا تو —"

"تو — تو کیا ہوا" فضل کی آنکھوں میں جیسے نشہ اُتر رہا تھا "تُو میری منگ نہیں کیا —"

بیگاں نے گھبرا کر اوپر چاروں طرف دیکھا بغیر منڈیروں کے چھت تھے۔ اکثر ہمسائیاں اوپر آجایا کرتی تھیں۔

اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے فضل نے جھٹکا دیا۔ وہ اس کے اوپر گری۔ فضل نے جلدی سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

وہ خود ہی بوکھلا گیا۔
بیگاں گھبرا کر دلان میں بھاگ گئی۔
فضل چند لمحے وہیں بیٹھا مسکراتا رہا۔ پھر دودھ کا گلاس پیا —
"اندر آؤں" وہ شوخی سے بولا۔
"نہیں۔ فضلے نہیں —" بیگاں گھبرا رہی تھی۔
"اچھا — نہیں آتا — آجا باہر
"قسم کھا رب کی مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا"
فضل نے قسم کھائی — تو وہ ہولے ہولے چلتی باہر آگئی۔
تھوڑی دیر فضل وہاں اور ٹھہرا — محبت کی باتیں محبت کی قسمیں محبت کے وعدے — دو دیوانوں میں اور بات ہی کون سی ہو سکتی تھی۔

بنسری کے سینے سے درد یلے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ چاندنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں خنکی رچی بسی تھی۔ دھیمے سر درد کی لہریں بن کر خنک چاندنی کے غبار میں پھیل رہے تھے۔

اور

دُور

میدان میں گاؤں کی الھڑ مٹیاریں اپنے روزمرّہ کے کھیلوں میں مشغول تھیں۔ کچھ کوٹلہ چھپاکی کھیل رہی تھیں — کچھ لکن میٹی —— کچھ گِدآ ڈال رہی تھیں۔ کچھ جھومر اور کچھ چھون چھوائی کھیل رہی تھیں ——

چھون چھوائی کھیلنے والیوں میں نجو بھی تھی —— رتو چور بنی تھی — اور سب لڑکیاں دوڑ دوڑ بھاگ بھاگ کر چور کے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ خوب شور مچا تھا۔ جو لڑکی پکڑی جاتی چیخ اُٹھتی —— جو پکڑتے پکڑتے بچ نکلتی وہ اس سے بھی زیادہ

چیخیں مارتیں — ہنس ہنس کر لڑکیاں جیسے پاگل ہو رہی تھیں۔
رتو نے برکتے کو پکڑ لیا۔
"برکتے چور برکتے چور" سب لڑکیاں تالیاں پیٹتے ہوئے شور مچانے لگیں۔ برکتے کھسیانی ہو رہی تھی۔ رحمو میراثی کی یہ بیٹی کبھی کسی کے ہاتھ تو نہ آتی تھی۔ آج رتو نے جانے کیسے پکڑ لیا۔
"اس درخت کے پاس کھڑی ہو جا" شادو نے برکتے سے کہا۔
"جب میں آواز دوں گی تب پکڑنے دوڑنا"
برکتے درخت کے پاس لگ کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکیاں جو گھیرے میں کھڑی تھیں ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئیں۔
رتو اور نجو ساتھ ساتھ بھاگیں۔
بھاگتے بھاگتے وہ درختوں کے گھنے سایوں تلے آ گئیں۔
"رتو" نجو نے کہا
"ہاں"
"میں جاؤں اب"
"جا"
"کھیل ختم ہونے پر گھر نہ چلی جانا"
"تم جلدی آ جانا —"
"کوشش کروں گی"
"نا بھئی — زیادہ دیر لگائی تو میں گھر چلی جاؤں گی"
"اچھی سہیلی ہے — تجھے پتہ بھی ہے میں کئی دنوں سے راجو سے نہیں ملی"

"اچھا اچھا — جا — میں آدھی رات تک میدان میں تیرے انتظار میں بیٹھی رہوں گی —"

"اتنی زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی — آجاؤ گی —"

بنسری کی لے جوں جوں تیز ہو رہی تھی۔ نجو کی بے تابی بڑھ رہی تھی نغموں کا درد وہ اپنے سینے میں مچلتا محسوس کر رہی تھی —

"جا بھی۔ کھڑی کیوں ہے۔ بیچارے کا بنسری بجا بجا کر بُرا حال ہو گیا ہے" رتو نے اسے دھکیلا —

نجو نے رتو کا ہاتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا — وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے درختوں تلے ہوتی بنسری کی آواز کی سمت بڑھنے لگی۔

رتو چند لمحے رکی اور پھر بھاگتی ہوئی میدان میں جا پہنچی۔ برکتے ابھی تک کسی لڑکی کو پکڑ نہ پائی تھی — دوڑنے بھاگنے والی لڑکیوں نے خوب ادھم مچا رکھا تھا — رتو کا جی اب بھاگ دوڑ کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ گدا ڈالنے والی لڑکیوں کے قریب چلی آئی۔ اور اِرد گرد کھڑی لڑکیوں کے ساتھ مل کر قدموں کی دھمک پر تالیاں بجانے لگی۔

نجو کسی پراسرار روح کی طرح گھنے درختوں کے سایوں تلے سے گزر رہی تھی۔ کہیں کہیں پتیوں سے چھن چھن کر چاندنی نیچے اتر رہی تھی۔ ورنہ خنک سا اندھیرا ہی تھا — نجو کو تو محبت کی روشنی راہ دکھا رہی تھی۔ جو بے دھڑک بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

چوہدری ظہور انہی کی زمینوں کے آخری سرے پر پھیلے بیشمار پُرانے درختوں تلے راجو بنسری بجایا کرتا تھا۔ یہاں تنہائی ہی تنہائی ہوتی تھی۔ اس طرف لوگوں کا آنا جانا بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ رات کے وقت

تو کسی کے آنے کا امکان ہی نہ تھا — انہی درختوں کے قریب پرانا کھوہ تھا۔ جس کی منڈیریں ٹوٹی ہوئی تھی — عورتیں تو عورتیں گاؤں کے مرد بھی اس طرف سے نہ گزرتے تھے۔ کہ سب کا خیال تھا۔ یہ کھوہ اب غیر آباد ہے۔ اور اس میں جنوں کا بسیرا ہے — کئی کہانیاں اس سے وابستہ تھیں — کئی لوگوں نے یہاں روحیں دیکھی تھیں۔ کتنے لوگ بتاتے تھے۔ کہ رات کے سناٹوں میں یہاں دو سایے نظر آتے ہیں۔ جو کبھی کھوہ کے اندر ڈوب جاتے ہیں۔ اور کبھی منڈیر پر نمظر آتے ہیں —

نجو بلا خوف بڑھے جا رہی تھی — وہ کھوہ کے قریب سے گزری اور پگڈنڈی پر ہوتی غلیل کی شکل کے اس بوڑھے درخت کی طرف چل دی۔ جس کے تنے پر بیٹھا راجو بنسری کے درد بھرے نغموں کا کرب فضا میں بکھیر رہا تھا۔

وہ ہولے ہولے چلتے اس کے قریب آگئی —

راجو آنکھیں بند کئے بنسری ہونٹوں سے لگائے انگلیوں کی خفیف حرکت سے نغموں کا دل دھڑکا رہا تھا — چاندنی کا سحر چاروں طرف پھیلا تھا۔ درد ہی درد بکھرا تھا۔

نجو اس کے سامنے یوں کھڑی ہوگئی — جیسے کسی دیوتا کے سامنے دیوداسی کھڑی ہوتی ہے — درد اُبلتا رہا اور وہ بے تاب ہوتی رہی۔

اس نے راجو کو بلایا نہیں۔ طلسماتی سحر نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

لیکن

جب درد سے بنسری کا سینہ بھی شق ہونے لگا۔ تو اس نے بے اختیارانہ

آگے بڑھ کر راجو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا " بس راجو - بس کر ــــ"
وہ روہا ــ ہو کر بولی۔
راجو کے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔
" تو آگئی بجو ــ تو آگئی ــــ " بنسری ایک ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے بجو کے بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا ــ بے یقینی کے عالم میں وہ اسے تکے گیا ــــ
دوسرے لمحے بجو نے اپنا سر اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر ٹکا دیا ــ یقین کی منزل قدموں میں آگئی ــــ راجو نے بے صبری سے اسے اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا ــــ
راجو پپلاں والی ہی کا باسی تھا۔ نمبردار کی حویلی کے پہلو ہی میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے کوٹھے تھے۔ راجو اپنی بیوہ ماں اور بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا ــــ کسی زمانے میں اس کے باپ دادا کے پاس بھی کئی مربعے زمین تھی۔ لیکن اس کی پھوپھی صاحباں دشمن داریوں کی نذر ہو گئی ــــ اس کے شوہر اور سسرال والوں نے نصف صدی پہلے کا بدلہ یوں لیا۔ کہ صاحباں کو بیاہ کر لے گئے ــــ پھر اغوا کروا دیا ــــ بدنامی ہوئی۔ مقدمے چلے اور مقدمہ بازیوں کی نذر زمینیں ہونے لگیں۔ اسی پر بس نہ ہوئی صاحباں کا شوہر کسی اپنے دشمن سے مقابلے میں مارا گیا ــــ قتل کا مقدمہ صاحباں اور راجو کے باپ پر بن گیا ــــ پھر راجو کا باپ بھی گاؤں کی لڑائی میں سنگین لگنے سے مارا گیا۔ یوں رہی سہی زمینیں بھی مقدموں کے خونی منہ میں چلی گئیں ــــ اب راجو کے پاس ذاتی زمین نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ بیگھے زمین بچی تھی۔ جس میں

سوکھی سبزیاں ہی کاشت کی جا سکتی تھیں۔

راجو گاؤں کا کڑیل جوان تھا۔ اس جیسا خوبصورت نوجوان پپلاں والی کی دھرتی نے کم ہی دیکھا ہوگا — بادامی آنکھوں اور گندمی خوشیوں کی رنگت والا یہ جوان بچپن میں اتنے دکھ بھوگ چکا تھا۔ کہ دُکھ درد ہنسی کا ایک حصہ ہی بن گئے تھے۔ اس دکھ درد کو سکون دینے کے لئے اس نے بنسری کا سہارا لیا تھا۔ وہ بنسری بجاتا تو جیسے دل دھڑکنا بھول جاتے — وقت تھم جاتا اور کائنات کی نبض رُک جاتیں —

اسی بنسری سے پھوٹتی دکھ کی لے ہی نے نجو کو راجو سے ملایا تھا۔ وہ بے اختیارانہ اس لے پر کھنچی چلی گئی تھی — اور جب اس کے قدم رُکے تھے۔ تو سامنے راجو کو منزل کی طرح منتظر پایا تھا —

ملکوں کی بیٹی جس کے بھائی کے پاس اب بھی چار مربعے زمین تھی۔ جس کی اونچے شملے والی پگڑی اور آسنی — والی سفید گھوڑی گاؤں کی عزت کا نشان تھی۔ اک مفلس نوجوان کی محبت کی اسیر ہو گئی تھی۔ جس کے پاس زر تھا نہ زمین — ہاں دل تھا۔ مندروں اور مسجدوں کی طرح مقدس — جہاں خدا کے سائے میں محبت بستی تھی — جو نجو کو لوٹ کر چاہتا تھا

اور

جسے

نجو جی جان سے چاہتی تھی۔

"نجو" راجو نے اسے آہستگی سے پکارا۔ دونوں اب ساتھ ساتھ

غلیل نما درخت کے تنے پر یوں بیٹھے تھے — جیسے جھولے میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوں۔

"ہاں"

"تو روز کیوں نہیں آتی"

"روز کیسے آؤں راجو"

"کھیلنے تو روز آتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ادھر آجایا کر"

"روز کب کھیلنے آتی ہوں"

"جھوٹی"

"رب دی قسمے —"

"کیوں نہیں آتی روز"

"بس — ویرا اب گھر دیر سے آنے لگا ہے — اور تجھے بتایا ہے نا جب تک وہ آ نہ جائے اور میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا نہ کھلا لوں — میں گھر سے باہر نہیں نکلتی —"

"بڑا پیار ہے تجھے فضل سے"

"ہائے تجھے کیا بتاؤں راجو — میرا ویر میرے لئے کیا ہے۔ جی چاہتا ہے قربان ہو جاؤں اپنے ویر پہ —"

"سارا پیار ویر کو ہی دے دیا تو میرے لئے کیا بچے گا" اس نے نجو کی موٹی چٹیا پکڑ کر ہلکے سے جھٹکا دیتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

"تیرے لئے — تیرے لئے —" وہ شوخی سے مسکرائی۔

"ہاں بتانا —"

"تیرے لئے ہیں"

"سچ بنجو"

"ہاں رجو ——"

بنجو نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ راجو کی بڑی بڑی پرفسوں آنکھوں میں مچلتے جذبوں سے اسے لاج آرہی تھی۔

راجو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا —— بلندیاں ہی بلندیاں پھیل گئیں۔ نگاہوں کے سامنے —— وہ مسحور سا اسے تکتا رہا —— پھر جیسے کوئی دھڑکا دل کی دنیا کو دہلا گیا۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے جلدی سے بولا —— "بنجو —— سچ کہہ رہی ہے۔ کہ تو میری ہے"

"شک ہے کوئی —— تو آزما لے"

"نہیں —— شک نہیں ڈر ہے"

"کس بات کا"

Khuda Baksh Library
Acc. No. 22934

"تو —— تو ملکوں کی بیٹی ہے بنجو —— کہیں ——"

"تو تو کیا میراثیوں کا بیٹا ہے ——؟ تیری ذات بھی تو اونچی ہے —— گوندل ملکوں سے کم تو نہیں ہوتے ——"

"صرف ذات ہی ہے اور کچھ نہیں" وہ اُداس ہو گیا "زر ہے نہ زمین۔ کہیں تیرا ویر ——"

وہ ہنس پڑی "راجو تو میرے ویر کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کر۔ وہ تو میری خوشیوں کے لئے جیتا ہے۔ میری آنکھوں میں میری مانگوں کو پڑھ لیتا ہے۔ یہ تو میری ساری زندگی کی خوشی ہے۔ تو اپنی بے بے کو ہمارے گھر بھیج تو سہی ——"

"حوصلہ نہیں پڑتا ——"

"بزدل ہے کیا ؟"

"نہیں —— میری بہادری میں کسی کو شک نہیں۔ خود اپنے آپ کو بھی بھروسہ ہے —— لیکن بے بے کو تیرے گھر دامن پھیلانے بھیجوں اس بات کا حوصلہ نہیں ——"

"تو بیٹھا رہ —— درختوں تلے بنسری بجاتے رہا کرنا" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ——

"روٹھ گئی" وہ اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے کم حوصلہ لوگ اچھے نہیں لگتے" وہ سے بولی۔ "جو کرنا ہوتا ہے کر گزرنا چاہئے"

وہ چند لمحے سر جھکائے کھڑا رہا۔

بنجو اس کے وجیہہ سراپا کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "تو تو نرا پاگل ہے راجو"

"تو نے پاگل بنا دیا ہے ——"

وہ فخر سے مسکرائی — چند لمحے دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر بنجو نے سنجیدگی سے کہا

"ڈر دل سے نکال دے راجو —— ہم دونوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا میل تو رب سچے نے خود کیا ہے ——"

"ہاں۔ میں تجھے نہیں جانتا تھا۔ تو مجھے ——"

"تیری بنسری کی دردیلی لے نے مجھے کشاں کشاں کھینچا اور میں تیرے پاس آ گئی۔ تو بھی تو جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا ——"

"ہاں"

"رانجھے کی وانجھلی نے ہیر کا من موہ لیا تھا — تیری بنسری نے نجو کو باؤلی کر دیا"

"رانجھے کی وانجھلی کی طرح کہیں میری بنسری بھی صرف فریادوں کی تڑپ کے لئے نہ رہ جائے"

"جن کا میل ،رب کرتا ہے۔ ان کے وچھڑنے کا سوال ہی نہیں ہوتا راجو"

نجو کے لہجے میں مونگے کی چٹانوں کی سی سنجیدگی اور بھرپور اعتماد تھا۔ راجو کا وسوسوں سے بھرپور دل حوصلہ پاکر مضبوط ہوگیا اس نے خوبصورت نظروں سے نجو کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔

ساری فضا ساری کائنات ہی مسکرانے لگی۔

ماسی رابو صحن میں رنگین پایوں والی نواڑی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ بکو میراثی چلم بھر کر لے آیا تھا اور ماسی کے آگے رکھتے ہوئے خود فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی جیراں کھُرے پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اس کی تینوں بیٹیاں دالان اور کمرے صاف کر رہی تھیں۔ جارو اور رقیہ دالان میں پوچا پھیر رہی تھیں — ڈبے میں لال لال سوندھی سوندھی خوشبو والی مٹی گھول کر پرانے کپڑے اس میں بھگو بھگو کر کچے فرش پہ سلیقے سے پھیر رہی تھیں کچے فرش کو صاف رکھنے اور دھول مٹی سے بچنے کے لئے پوچا پھیرنا ضروری تھا — رقیہ کا جی تو کرتا سارے گھر میں روز ہی پوچا پھیرا کرے۔ جارو ذرا کام چور تھی — دوسرے چوتھے دن ہی تیار ہوتی اس کام کے لئے۔ جیلاں بنجو کے کپڑے تہہ کر رہی تھی۔ بنجو لوہے کا بڑا سا صندوق کھولے بیٹھی تھی — فضل اس کے لئے شہر سے نئے کپڑے لایا تھا — جنہیں وہ بکس میں ڈال دیتی تھی — یوں وہ

جہیز جمع کر رہی تھی — کچھ کپڑے بیگاں کے لئے بھی تھے - وہ جیلاں کو دکھا رہی تھی -

"یہ جوڑا بیگاں کے لئے ہے - اس پر میں شہر سے گوٹا لگواؤں گی - ہائے اللہ وہ دن کب آئے گا - جب بیگاں میری بھابی بن کر یہاں آئے گی"

"بھائی فضل بیاہ کرتا کیوں نہیں" جیلاں بروکیڈ کا سوٹ تہہ کرتے ہوئے بولی - وہ نجو کے قریب ہی فرش پر بچھے کھیس پر بیٹھی کپڑے تہہ کر رہی تھی -

نجو ہنس کر بولی "کہتا ہے پہلے تیری شادی کروں گا"

"میری" جیلاں نے اپنی چندی چندی آنکھوں سے نجو کو دیکھا - نجو ہنستے ہنستے بے اختیار ہو کر بولی "تیری نہیں میری — میری"

"ہاں — میں بھی حیران ہوئی — کہ —"

"چل تیری بھی تو کرنی ہے نا — تجھے تو میں اپنے جہیز میں ساتھ ہی لے جاؤں گی —"

"رانیوں کے لئے نوکرانیوں کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے —" جیلاں نے نجو کی خوشامد سی کی -

"بس ٹھیک ہے — تو میرے ساتھ ہی جائے گی —"

"پھر بھائی فضل سے کہہ دیں کہ ایک نہیں دو رشتے ڈھونڈیں"

"ہاں —"

دونوں ہنسنے لگیں —

باہر صحن میں بکو ماسی رابو کو نئی نئی خبریں سنا رہا تھا۔ ماسی رابو کے لئے یہی لوگ پنڈ سے رابطہ کے لئے تھے۔ گھر گھر جاتے تھے۔ اور رنگا رنگ خبریں اُڑا لاتے تھے ــــ

ویسے بھی گاؤں کی عورتیں ماسی رابو کے پاس جب وقت ملتا آ بیٹھتی تھیں۔ اسے اِدھر اُدھر کی خبریں سنا جاتیں۔ ماسی رابو نیک عورت تھی۔ تجربوں کی بھٹی میں جلتے عمر گزری تھی۔ اس لئے لوگوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ برے بھلے وقت میں بھی لوگ ان کے پاس مشورے کے لئے دوڑے آتے ــــ دُکھ تکلیف میں وہ اب بھی دوسروں کے کام آتی تھی۔

"وے بکے"

"ہاں ماسی"

"کل صادق کی چاچی بتا رہی تھی۔ کہ سکھیروں کے چھوٹے منڈے تاج نے موٹر خریدی ہے ــــ"

"ہاں ماسی ــــ سُنا ہے ولائت سے منگائی ہے ــــ کیا چیز ہے ماسی"

"کیسی ہے ــــ"

"چم چم کرتی ہے۔ چار بڑے بڑے پہیے ہیں ــــ اُوپر ڈبہ سا بنا ہوا ہے۔ بس فر فر چلتی ہے"

ماسی رابو نے اک قہقہہ لگایا اور بولی "تُو نے پہلے کبھی موٹر نہیں دیکھی"

"نہیں"

"جھوٹ کیوں بولتا ہے" گردن موڑ کر کھُرے پر بیٹھی جیراں بولی۔

"اے کب دیکھی تھی کبھی"

"شہر ملک صاحب کے ساتھ جاتے نہیں تو"

"ہاں جاتا ہوں ——"

"وہاں موڑیں نہیں ہوتیں"

"وہ تو دیکھی ہیں۔ پر یہ کچھ نئی چیز ہی ہے"

ماسی راجو مسکرا کر حقہ گڑگڑانے لگی ——

"سارا دن بڑی سڑک پر دوڑاتا پھرتا ہے سکھیرا ——" بکو بولا "اور لوگ دیکھنے کے لئے سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں ——

"ان کے لئے واقعی نئی چیز جو ہوئی بکو ——"

"تاج سکھیرا نئی نئی باتیں بھی تو کرتا ہے نا ماسی"

"اور کیا بات کی اس نے ——"

"آپ نے نہیں سُنا"

"کیا؟"

جیراں بھی موٹی ململ کے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی "لو ماسی آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں ——"

"کیا ہوا ——"

"تاج سکھیرے نے کسی پٹھانی سے شادی بھی کر لی ہے"

"پٹھانی سے"

"ہاں ماسی ——"

"مجھے تو نہیں بتایا کسی نے ——"

"کہتے ہیں بڑی خوبصورت ہے —— ہزار روپے میں خرید کر لایا ہے"

جیراں دلچسپی لیتے ہوئے بولی "سنا ہے وہاں عورتوں کو بیچ دیتے ہیں ماسی"

"کہاں"

"پتہ نہیں لوگ کیا نام لے رہے تھے —— پہاڑوں پہ ——"

وہ سوچنے لگی۔

"سوات —— سوات ——" بکو نے کہا

"اچھا سوات سے لایا ہے خرید کر ——" ماسی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— عِلما ہے نا عِلما ——" بکو بولا

"کون، علما" ماسی نے کہا

"تاج سکھیرے کا میراثی —— اس کے ساتھ ہی شہر میں رہتا ہے۔ اس نے بتایا مجھے ——

"اچھا ——"

پھر تینوں تاج سکھیرے کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی عیاشی کے قصّے بھی گاؤں تک پہنچتے رہتے تھے —— بات سے بات نکلتی گئی ——

"وہ تو کچھ اور ہی بن گیا ہوا ہے ماسی۔ تو دیکھے تو پہچان ہی نہ

سکے۔ کہ وہ ہڑیالے کا بندہ ہے ——"

"شہر جو چلا گیا ہے —— شہری بن گیا ہوگا"

"پورا پورا صاحب بہادر —— انگریزی کپڑے پہنتا ہے —— انگریزی بولتا ہے ——"

"دوسرے بھائی تو نرے پینڈو ہی ہیں۔ سارا دن کھیتوں ہی میں جتے رہتے ہیں ——" جیراں بولی۔

"اپنی دھرتی ہے ان کی —— واہتے ہیں اور کھاتے ہیں" بکو بولا ——

"سنا ہے یہ زمینیں بھی بیچتا رہتا ہے" ماسی رابو نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اپنے بھائیوں کے آگے ہی دو مربعے بیچی ہے اس نے۔ شہر میں کاروبار جو کر رہا ہے ——" بکو بولا ——

"پیسہ انتوں کا ہے اس کے پاس" جیراں نے کہا۔

"اسی لئے تو اڑا بھی رہا ہے" بکو بولا ——" وہاں جو گھر لے رکھا ہے نا اس نے۔ علما بتا رہا تھا۔ کہ راگ رنگ کی خوب محفلیں جمتی ہیں وہاں۔ اور ماسی۔ کڑیوں کا تو وہ بیوپاری ہے ——"

"توبہ توبہ" جیراں نے کانوں کو چھوا

ماسی رابو نے گہرا سانس لیا اور بولی "رب کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ظالموں نے یہ گھر اجاڑا تھا —— اب اپنا گھر یوں اجڑے گا۔ ضروری تو نہیں نا —— قتل قتلام سے ہی گھر اجڑیں ——"

"ٹھیک کہتی ہو ماسی ——" جیراں بولی۔

"دولت کو جس طرح وہ لٹا رہا ہے۔ ایک دن کنگال ہو جائے گا" بکو بولا ـــــ "بڑے بڑے عیاش دوست ہیں اس کے۔ بدمعاشیوں کا گڑھ ہے اس کا شہر والا گھر"

بکو ادھر ادھر سے سنی باتیں ماسی رابو کو بتانے لگا۔

بہت سی باتیں ماسی کے علم میں پہلے سے بھی تھیں۔ کبھی کبھی فضل اسے بتایا کرتا تھا۔ وہ سنتی رہی ـــــ معلومات میں کافی اضافہ ہو رہا تھا۔

اور معلومات میں اضافہ نجو اور لڑکیوں کے ہو رہا تھا۔ آپس میں باتیں کرتے وہ کان ادھر ہی دھرے تھیں۔ تاج سکھیرے کی موٹر جارو اور رقیہ بھی دیکھ آئی تھیں ـــــ ان کے لئے بھی یہ عجوبہ ہی تھا۔ وہ بڑے مسخرے پن سے نجو کو بتا رہی تھیں ـــــ نجو ان کی معصوم باتوں پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

سر پر دودھ کا گڈوا رکھے بیگاں واٹے سے نکلی اور پگڈنڈی پر
سولی پانچ بھینس اور دو گائیں یہاں رہی تھیں — تین بھینسوں کا
دودھ تو چاچا ڈیرے پر لے جاتا تھا۔ ایک دودھ سکھا چکی تھی۔ باقی
ایک تھی جس کا دودھ وہ گھر لے جا رہی تھی۔ گایوں بھینسوں کا رکھوالا
بابا رمضان تھا۔ بھوری بھینس بیگاں کی لاڈلی بھینس تھی۔ اس کا
دودھ وہ خود ہی دوہیا کرتی تھی — بھوری بھی سمجھ گئی ہوئی تھی۔ مجال
تھی جو رمضان بابا کو دودھ نکالنے کے لئے قریب بھی پھٹکنے دیتی —
بیگاں کو روز یہاں دودھ لینے کے لئے آنا پڑتا تھا۔ یوں بھی جانوروں
کے دانے پٹھے کی خبر لینا ہوتی تھی — چارہ ڈلوانا ہوتا تھا — یہ کام
بیگاں نے اپنے ذمہ ہی لے رکھا تھا۔ ٹھٹھی کی عیسائی عورتوں سے گوبر
وغیرہ بھی اٹھوانا ہوتا تھا۔ بابا رمضان تو اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ سارے
کام بیگاں ہی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ رمضان کا بیٹا منظورا اور بیٹی
ں اب واڑے کی صفائی ستھرائی اور بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے

تھے۔ چرانے کے لئے باہر لے جاتے تھے۔

بیگاں نیلے کرتے کالے تہمند اور بڑے سے دوپٹے کو سر پر ڈالے طلے والی نوکدار جوتی پہنے خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سونے کی مرکیاں تھیں — جو اس کے تمتماتے ہوئے سانولے سلونے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ناک میں سونے کی کیل تھی۔ جس کا سرخ رنگ چمک رہا تھا۔ ہاتھوں میں چاندی کے گھنگھریاں لگے کنگن تھے — جب وہ گڈوے کو سہارا دینے کے لئے ہاتھ سڑک لے جاتی۔ تو گھنگھروں بڑے مترنم انداز میں چھنک اٹھتیں۔

پگڈنڈی سے ہوتی وہ کچی چوڑی سڑک پر اتر آئی۔ کھیتوں پر دھوپ سنہرا نچھاور کر رہی تھی۔ کٹائی کے بعد ابھی کچھ زمینیں خالی پڑی تھیں۔ کہیں کہیں کھیتوں کے کناروں پر سبزیاں لگائی گئی تھیں۔ کچھ کھیتوں میں گنا اگا تھا اور کپاس کی فصل بھی سر اٹھا رہی تھی — کھیتوں میں اِکا دُکا لوگ تھے — چاول کی فصل سمیٹی جا چکی تھی۔ دھان اور چاول جیلے گھوڑوں والے ریڑھوں پر لدلد کر شہر جا رہا تھا۔ منڈیوں میں فصل بیچ کر زمیندار جیبیں نوٹوں اور روپوں سے بھر بھر کر گھروں کو لوٹتے تھے۔

بیگاں اپنی دھن میں مست سڑک کے بیچوں بیچ جا رہی تھی — اونچے قد کی مضبوط جٹی کی چال کا اپنا ہی وقار تھا۔

وہ اس وقت فضل کے بارے میں سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتوں کا سرور دل و دماغ پر تھا — گرد و پیش سے بے خبر سی نظر آتی تھی۔

اچانک ہی وہ اُچھلی — گرتے گرتے بچی — دودھ چھلک کر اس کے ماتھے اور کپڑوں کو بھگوتا دھاروں کی صورت بہنے لگا —

تاج سکھیرے نے عین اس کے پیچھے آکر گاڑی کا اسس زور سے ہارن دیا تھا۔ کہ وہ بے اختیارانہ اچھل پڑی تھی۔

اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔

تاج سکھیرا گاڑی میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

بیگاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی — گڈوا اتار کر زمین پر رکھا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر تن کر بولی "اندھے ہو گیا — نظر نہیں آتا —"

"تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا — سوہنیو"

بیگاں شعلہ جوالا بن گئی — "لفنگے۔ بدمعاش کمینے —" اس نے اسے بے نقط سُنا ڈالیں۔

وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا —

"تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے تاجے —" وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

"اوئے اس موت توں صدقے جایئے" اس نے ہنس کر کہا۔

"جانتا ہے میں کون ہوں" وہ دانت پیس کر بولی۔

"کوٹلی کے نمبردار کی قیامت بیٹی —" وہ پھر ہنسا

"صرف کوٹلی کے نمبردار کی بیٹی ہی نہیں — تیرے وڈے دشمنوں کی بھوبھی ہوں" —

"اوہو۔ کون ہیں دشمن —"

"میں فضل کی منگ ہوں منگ — ملک فضل کی —" اس

نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی غصّے کے عالم میں کہا — "ہوش کی
دُنیا میں رہا کر — موت کو یوں نہ للکار —"
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا —
سامنے سے دو دیہاتی چلے آرہے تھے۔ تاج نے جلدی سے گاڑ
سٹارٹ کی اور تیزی سے کچی سڑک پر مٹی اُڑاتا چلا گیا۔
بیگاں کے جسم میں جیسے انگارے بھر گئے — کتنی دیر وہ وہیں کھڑ
اسے کوستی رہی —
یہ پہلی بار نہ تھی — جو تاج نے اسے چھیڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی
وہ دو دفعہ اس کے ساتھ بدتمیزی کر چکا تھا۔ چند ماہ پہلے اسے کھیتوں
پر کام کرتے دیکھا تھا — بیگاں کی ہوش ربا جوانی نے اس کے من
میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ بے دھڑک اس کے پاس آکر بولا تھا "تیرا نام
کیا ہے کُڑیئے"
"کیوں" بیگاں نے ابرو تان کر پوچھا تھا —
"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"
"کیا ضرورت پڑ گئی ہے —"
"پڑی ہے تو پوچھ رہا ہوں نا — کس گاؤں کی ہے۔ ہڑیالے کی
شاہ پور کی یا کوٹلی کی"
"تُو بتا کس گاؤں کا ہے"
"ہڑیالے کا سکھیرا — تاج سکھیرا"
"ہوں"
"کیوں"

"سیدھی راہ پکڑ اپنی — تو غلط جگہ پہ آگیا ہے — زندگی چاہئے تو دفع ہو جا — نہیں تو جانتا ہے اس پنڈ کی بہو بیٹیوں کو چھیڑنے والے کا کیا حشر ہو سکتا ہے"

وہ دم دبا کر بھاگ گیا تھا۔

پھر

چند ہفتوں بعد وہ کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تھی۔ تو وہ بہانے بہانے ادھر آگیا تھا —

"لاؤ میں پانی نکال دوں" وہ ڈول کنوئیں میں لٹکانے کو آگے بڑھا تھا۔

"کیوں" بیگاں نے تیکھے پن سے کہا تھا —

"لڑکیاں پانی نکال رہی ہیں — اور میں ایسے ہی کھڑا ہوں — یہ جواں مردی تھوڑی ہے — ہٹو میں سب کے گھڑے بھر دوں —"

چند لڑکیاں پرے ہٹ گئیں — لیکن بیگاں نے اسے پرے دھکیل کر ڈول خود پکڑ لیا —

"چلا جا یہاں سے — بہو بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں — یہ ہڑیلے اور کوٹلی کا سانجھا کنواں ہے —"

"میں نے کنوئیں پر تو حق نہیں جمایا"

"پکے ڈھیٹ ہو —"

وہ کنوئیں سے پرے چلا گیا۔ باقی لڑکیاں بیگاں کے سر ہو گئیں۔

"تجھے پتہ نہیں یہ سکیروں کا چھوٹا منڈا ہے۔ شہر میں رہتا ہے میموں اور صاحبوں کے ساتھ اس کی دوستی ہے — اس سے دشمنی مت

لے — کہیں تیرے باپ بھائیوں کو پھنسا نہ دے ناحق میں —"
"چل چل بڑا آیا —"
"نہیں بیگاں — سارے پنڈ اس سے ڈرتے ہیں — بڑا کمینہ ہے — تو ان لوگوں کو نہیں جانتی"
بیگاں بڑے تفاخر سے ہنس کر بولی" لو بھلا — ہیں نہیں جانتی ان لوگوں کو — پگلیو یہ تو میرے سوہروں کے پکے دشمن ہیں۔ ان کی پہچان میں نہ رکھوں گی تو اور کون رکھے گا —"
"پھر تو اس سے اتنا اکھڑ کیوں بولی"
"تو کیا ڈر جاتی اس سے — ہونہہ — وہ ہے کیا چیز — گلا مڑوڑ کر رکھ دوں گی اس کا میں اکیلی ہی —"
لڑکیاں چپ ہو گئیں — گاؤں کی دشمنیوں اور ان کے ہولناک نتیجوں کا ان سب کو علم تھا۔ آئے دن وارداتیں ہوتی تھیں۔ پانی کی تقسیم پر قتل — زمین کی بانٹ پر قتل — ڈنڈے سوٹے تو چلتے ہی رہتے تھے — اکھڑ اور اَن پڑھ دیہاتیوں میں غصہ بھی تو بہت ہوتا تھا — کسی کی بات صبر و تحمل سے سننے کے تو عادی نہ تھے۔ ذرا کسی نے اونچی نیچی بات کی بس مشتعل ہو گئے — آؤ دیکھا نہ تاؤ پل پڑے — دم بھر میں خون خرابہ ہو جاتا تھا —
بیگاں نے اپنا گھڑا سر پر رکھا دوسرا کولھے پر اور چھلکتے پانی سے بھیگتی اپنے گھر کی راہ لی۔
دور درخت تلے کھڑے تاج نے ایک بیہودہ آوازہ کسا — وہ کھول کر رہ گئی۔ لیکن کچھ کہے بنا آگے بڑھ گئی —

اور

آج

تیسری بار اس لعین مردُود نے اسے راہ جاتے روکا تھا - وہ کوئی چھ ماہ بعد گاؤں آیا تھا — زیادہ وقت شہر ہی میں رہتا تھا — فصل لینے آجاتا تھا —

غصّے سے کھولتی بیگاں گھر جا رہی تھی - دُودھ کی دھاریں اس کے چہرے سے ہوتیں جسم پر بہہ رہی تھیں — اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں — وہ تاجے کو مزہ چکھانے کے متعلق بڑے غصیلے انداز سے سوچ رہی تھی -

اس نے آج تک بہنوں بھائیوں ماں باپ کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ تاجا یوں اسے راہ میں چھیڑتا ہے — وہ سمجھتی تھی کہ گالیاں دے کر کوس کوس کر وہ اس ذلیل سے خود ہی بدلہ لے لیتی ہے -

لیکن

آج

آج اس نے سوچ لیا تھا —

کہ وہ سب کو بتا دے گی — چاچے — بے بے — بھائیوں سب کو بتا دے گی —

اور

اگر

آج

آج رات ٹالیوں کے جھنڈ تلے فضل اسے ملنے آیا۔ تو اس سے بھی کہہ دے گی۔

فضل کے تنومند و توانا مضبوط جسم اور آن کی خاطر پہاڑوں سے بھی ٹکرا جانے والے جذبے کا سوچ کر وہ خوش ہو گئی۔

تاج نے ڈھیر سارے مشروبات گل پروشے کے آگے ڈھیر کر دیئے۔ سونے کے دو سیٹ اور طلائی چوڑیاں بھی اس کی گود میں ڈال دیں۔

گل پروشے ڈریسنگ روم میں قالین پر صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ یہاں آئے اُسے تقریباً مہینہ ہو گیا تھا ـــــ یہ ایک مہینہ اس نے خوابوں جیسی جنت میں گزارا تھا ـــــ تاج کی محبت اور شیفتگی پاکر وہ پھولی نہ سماتی تھی ـــــ محبت کو ترسی ہوئی لڑکی کے لئے زندگی کا یہ موڑ اتنا دلفریب اور مسحور کن تھا کہ اس کی ہمیشگی کی تمنا کر بیٹھنا کوئی عجب بات نہ تھی۔

تاج اسے شہری ادب سکھا رہا تھا۔ لباس بنوا کر دیئے تھے۔ پاؤڈر کا استعمال سکھایا تھا۔ زیور بنا کر دیئے تھے۔ حسین و جمیل شے ان لوازمات سے کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ اس ایسے نازک اور بلوریں جسم پر رنگارنگ لباس بے طرح اُٹھتے

تھے۔ تاج اسے گڑیا کی طرح سجا کر رکھتا تھا —— یہ کھیل اسے کچھ زیادہ دن ہی بھا گیا تھا۔ ورنہ لڑکیاں تو اس کی زندگی میں صرف چند دن کی مہمان ہوتی تھیں —

"اتنا ڈھیر اٹھا لایا ہے سردار —" گل پروشے نے رنگا رنگ لباسوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ تمہارا ہے میری جان" وہ صوفے پر اس سے جڑ کر بیٹھتے ہوئے اس پر جھک گیا۔

"امارا پاس ابھی بوت کپڑا اتا" گل پروشے نے سر اس کے گھٹنے پر رکھ کر بانہیں تاج کے گلے میں ڈال دیں —

تاج نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دئے۔ کیف و سرور سے دونوں مدہوش سے نظر آنے لگے۔

"تاج" گل پروشے سیدھی ہو بیٹھی۔

"ہوں" تاج نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگایا۔

"تم نے ام کو اتنا محبت دیا ہے — اتنا پیار دیا ہے — اتنا عزت دیا ہے کہ لگتا ہے ام خوشی سے ہی مر جائے گا —"

تاج نے کش لے کر دھواں گل پروشے کے منہ پر اگل دیا — اور ہنس کر بولا۔

"نانا — یوں مت کہو — ابھی جیو اور عیش کرو — عیش کراؤ —"

وہ معصومیت سے ہنس پڑی۔

"جاؤ یہ کپڑے پہن کر آؤ" تاج نے قدموں میں پڑے کپڑوں میں سے ریشمی آتشی گلابی لباس کو بوٹ کی نوک سے قدرے اونچا کیا۔

"ابھی"

"ہاں"

"ویسے سردار — شام کو پہنے گا"

"نہیں ابھی۔ ساتھ زیور بھی پہنو"

"ابھی ام تمہارا قدموں میں بیٹھے گا۔ ام کو اچا لگتا ہے سردار ——"

"نہیں —— یہ کپڑے پہن کر دکھاؤ —— زیور بھی —— قیامت بن کر آجاؤ اور ٹوٹ پڑو اپنے سردار پر ——"

گل پروشے نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی —— اور سارے کپڑے اور زیور اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی ——

تاج چھت سے لٹکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ گل پروشے کے مستقبل کے متعلق اس کے ذہن میں بہت سی تجویزیں تھیں ——

تھوڑی ہی دیر بعد گل پروشے اپنے مرمریں بدن پر نیا لباس سجائے آگئی۔ اس لباس اور زیور نے تو اسے قاتلانہ حد تک حسین بنا دیا تھا ——

"گل" تاج اسے سر سے پاؤں تک چمکتی آنکھوں سے پیتے ہوئے بولا۔

"ہاں"

"ہاں نہیں جی کہتے ہیں"

"خو — بھول جاتا ہے سردار —"

"یاد رکھا کرو — ویسے تم کافی کچھ سیکھ گئی ہو"

"سب کچھ سیکھے گا — تمارا خاطر ام سب کچھ سیکھے گا"

"او — جیو —"

تاج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آ گری — انداز سپردگی قاتلانہ تھا۔ جوش جذبات والہانہ۔ تاج خریدی ہوئی اس لڑکی کے روئیں روئیں سے عیش و آسودگی وصول کرتا تھا —

پھر

جب وہ اپنے بیڈ روم میں جنس و جذبات کی آسودگی کے بعد ایک دوسرے سے چمٹے لیٹے تھے۔ تو گل پروشے سکون کی لہروں پر بہتی جا رہی تھی۔ اپنی تقدیر کی اس انتہا پر وہ اپنے آپ پر رشک کر رہی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں اک وسوسہ رینگ گیا۔ اگر کبھی یہ جنت اس سے چھن گئی تو —

تو

اس نے سر اٹھا کر بازو چت لیٹے تاج کے سینے پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ اس کے بالوں میں اُلجھا دیے — وہ اپنی سبزی مائل نیلگوں کشادہ آنکھوں کو پوری طرح کھولے تاج کے چہرے

کو تکنے لگی۔

"کیوں" تاج نے پوچھا

"سردار" وہ اپنی آنکھوں میں رینگتے وسوسوں کو چھپائے بغیر بولی۔

"ہوں"

"سردار۔ تم ام سے ایک بات بولے گا"

تاج اس کی بات پر ہنس پڑا — پھر اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے بولا "ایک نہیں سو بات بولے گا"

"مذاق مت کرو"

"اچھا"

"ہاں ٹیک ٹیک بتاؤ"

"کیا بتاؤں"

"ام پوچھے گا تم بتاؤ"

"پوچھو —"

"خدا کا قسم — سچ بولے گا نا"

"تم پوچھو تو سہی گل"

"سردار —"

"ہاں"

"ام سے کبھی بے وفائی تو نہیں کرے گا"

"کون"

"تم"

"یہ کیا سوجھی تمہیں گل پروشے" تاج نے اسے بازوؤں میں بھینچ لینا چاہا لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وہ بیحد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

تاج نے اس کی سنجیدگی کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔ گل پروشے کو گدگدی بہت ہوتی تھی۔ تاج نے اس کی کمر کے قریب گدگدایا۔

لیکن گل پروشے نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولی "بتاؤ نا سردار ——"

"کیا بتاؤں"

"ام سے دغا تو نہیں کرے گا"

"یہ کیوں پوچھ رہی ہو ——"

"دیکو سردار —— تم نے ام کو خریدا —— امارے لئے بوت پیسہ خرچ کیا۔ کپڑے لایا۔ زیور لایا —— اتنا اچا گھر میں رکھا ——"

"اور کیا چاہتی ہو ——"

"پیار موحابت ——"

"وہ تو تمہیں ضرورت سے زیادہ ہی مل رہا ہے گل جانی"

"ہاں —— یہ پیار ام کو پاگل بنادے گا —— ام بُوکا تا پیار کا واسطے —— ام نے بوت کچ پایا —— لیکن ام کو چیزوں کا ضرورت نئیں —— صرف تمارا پیار کا ضرورت ہے۔

تاج مسکرائے جارہا تھا۔

لیکن

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

وہ سر جھکائے بڑے افسردہ لہجے میں اپنی پیار کی محرومی کے متعلق اسے بتانے لگی۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ کہ ماں باپ مر گئے۔ پھر اس کے کانوں نے پیار کا لفظ نہیں سُنا — وہ اس کے لئے اندر ہی اندر ترستی رہی — اور خدا سے دُعائیں کرتی رہی —

"خدا نے تم کو بھیجا — تم نے ام کو خریدا — ہم جنت میں آگیا"

"بس ٹھیک ہے"

"لیکن اگر یہ جنت ام سے چھن گیا تو —"

تاج اس کی سنجیدگی سے اُکتا گیا۔ کروٹ بدلنے لگا — تو گل پروشے نے سختی سے اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ تاج نرم و گداز ہاتھوں کی اس سختی سے قدرے حیران ہوا —

"سردار — میرا بات سنو —"

"گل پروشے لیٹ جاؤ ابھی — باتیں پھر کر لیں گے"

"نئیں"

"تو کہو کیا کہنا ہے"

"بولو کہ ام سے کبھی بے وفائی نہیں کرے گا —"

"ایسے وعدے بے فائدہ ہوتے ہیں گل پروشے۔ یہ سب کچھ تو وقت بتاتا ہے" اس نے گول گول سی بات کی —

"نئیں — ام کو تم بتاؤ — ام سے دغا تو نہیں کرے گا کبھی"

"نہیں کروں گا بھئی نہیں کروں گا ——"

"ٹیک ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا —— اور یہ بھی یاد رکھنا سردار۔ کہ اگر کبھی تم نے ام سے بے وفائی کیا۔ تو ام تمہارا جان ایک کردے گا ——"

"او واہ وا —— تمہارا اور میرا جان ایک ہی تو ہونا چاہیئے"
تاج نے ہنس کر پھر اسے اپنی طرف کھینچا

"امارا مطلب یہ نیئں ——"

"اور کیا ہے"

"دیکو سردار —— ام پٹانی ہے۔ پتھروں کے دیس کا ہے —— پھولوں کے دیس کا ہے —— میٹھے چشموں کے دیس کا ہے ——"

"ہاں ——"

"امارے سات تم دغا نہیں کرے گا۔ تو ام اپنا جان بھی تم پر قربان کرے گا —— میٹھا چشمہ بن جائے گا —— تم جتنا چاہے گا —— سیراب ہوگا —— پھول بن جائے گا —— تم جتنا چاہے مہک سونگھے گا ——"

وہ بے اختیارانہ ہنس پڑا۔

لیکن

گل پروشے کی آنکھوں میں اک خوفناک چمک لہرائی ——
ٹھوس لہجے میں بولی "اور کبھی ام کو دھوکہ دیا یا بے وفائی کیا۔ تو ام پتھر بن جائے گا —— تمارا سر کچل دے گا یہ پتھر ——"

تاج نے پہلی بار سنجیدہ ہوا — گل پروشے کو غور سے دیکھا —
وہ واقعی پتھروں کے دیس کی پتھریلی عورت لگ رہی تھی ——
خونخوار وحشی اور درندہ سی —
وہ چپ چاپ اسے تکے گیا
خوف اس کے دل میں ایک لمحہ کو پیدا ہوا۔
لیکن
وہ بھی سکھیرا تھا — جس نے جھکنا کبھی سیکھا نہ تھا — جو بدلہ لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتا تھا — جو الٹے سیدھے سب ہتھکنڈے جانتا تھا — آزما سکتا تھا
گل پروشے کی اس کے سامنے کیا وقعت کیا حقیقت تھی۔
نادان لڑکی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگی تھی — یہ تو اس کا حسن جہاں سوز تھا — جو سکھیرا الجھا ہوا تھا — ورنہ اب تک تو اسے روند مسل کر اس نے خلاصی بھی کر لی ہوتی —
اک خریدی ہوئی لڑکی سے مرعوب ہونا یا اس کی دھمکی سے ڈر جانا اس کی شخصیت کے شایانِ شان تھوڑا ہی تھا —
لیکن
وہ اس وقت بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔
گل پروشے کو اس نے مطمئن کر دیا تھا — ہمیشہ باوفا رہنے کا یقین دلایا —

گل پروشے کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسے یوں
لگ رہا تھا۔ جیسے تاج نے اس کے دامن میں ہفت اقلیم کی دولت
بھر دی ہے — بے اختیار ہو کر اس نے سر تاج کی چھاتی پر رکھ
دیا — اور آنکھیں بند کر کے حسین خوابوں میں کھو گئی۔

"راجو"

"ہاں ماں"

"روٹی کھالے"

"رکھ دے کھالوں گا"

"گرم گرم چاول کھالے۔ ٹھنڈے ہوگئے۔ تو مکھن جم جائے گا۔ شکر کتنی ڈالے گا ـــــ"

"آج مکھن چاول پکائے ہیں"

"خالی چاول پکائے ہیں۔ مکھن تیرے لئے لگایا ہے۔"

"مجھے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ میں اکیلا نہیں کھاؤں گا۔ اور ہاں پھوپھی کو بھی تو بلا۔ تینوں مل کر کھاتے ہیں ـــــ"

"اب اتنا مکھن تھوڑا ہی ہے۔ جو سب کھائیں۔ تو کھالے اتنی محنت کرتا ہے ـــــ ہمارا کیا ہے ـــــ"

"محنت تو تم دونوں بھی برابر کی کرتی ہو ـــــ گھر کا کام بھی

پٹاتی ہو۔ بھینس بھی سنبھالتی ہو ـــــ کھیتوں پر بھی جاتی ہو ـــــ"

کچے برآمدے تلے بنے رسوئی گھر میں راجو کی ماں چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ چولھے میں آگ جل رہی تھی ـــــ کسی پرانی ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا۔ یہ ساگ وہ صبح کے لئے پکا رہی تھی۔ اس وقت سلور کے کالے کالے دیگچے میں چاول پکے تھے۔ مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا مکھن رکھا تھا ـــــ اور ٹین کے ڈبے میں شکر پڑی تھی۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ راجو ابھی ابھی کھیتوں سے واپس آیا تھا۔ ان دنوں وہ چوہدری نظام دین کی زمینوں کی بٹائی کر رہا تھا۔ چوہدری نظام دین کا گھرانہ شہر سکونت اختیار کر چکا تھا۔ زمین مزارعوں کے سپرد تھیں۔ ان دِنوں یہ کام راجو کر رہا تھا۔ وہ ان زمینوں کو یوں دیکھ بھال کر رہا تھا۔ جیسے یہ اس کی اپنی زمینیں ہوں۔

وہ اپنی گھوڑی کو صحن کے پرے سرے پر چھپر تلے باندھ رہا تھا ماں کے بار بار بلانے پر وہ رسوئی گھر میں آ گیا ـــــ ایک طرف بچھی کھٹولا سی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "لا ماں ـــــ کیا کھانا ہے ـــــ"

ماں نے پیتل کی بڑی سی تھالی چاولوں سے بھر دی تھی۔ شکر کا ڈبہ اس کی طرف بڑھا دیا اور تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔

"پھوپھی کہاں ہے" اس نے پوچھا۔

"دلان میں ہو گی" اس نے کہا

"بلا لونا اسے بھی "
"تو کھا — ہم دونوں کھالیں گی"
"ماں تجھے پتہ بھی ہے ۔ کہ ترنوالہ اکیلے میں میرے حلق سے نہیں اترتا ——"
ماں نے گھور کر اسے دیکھا — پھر زور سے آواز دی "صاصباں آکھانا کھالے ——"
"آئی بھابی" صاصباں نے دالان سے آواز دی ۔
تھوڑی دیر بعد ادھیڑ عمر کی صاصبان ادھر آگئی — وہ بھابی کے برابر پیڑھی پر بیٹھنے لگی تو راجو نے ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھالیا۔
"یہاں بیٹھ پھوپھی ——"
صاصباں مسکراتے ہوئے بولی "کیا بات ہے بڑا لاڈ آرہا ہے"
"لاڈ تو روز ہی آتا ہے — پر کیا کروں —"
"کر یہ کہ ——" صاصباں ہنستے ہوئے بولی "شادی کرلے —"
"ہاں راجو —" ماں نے ہانڈی میں ڈوئی چلاتے ہوئے کہا "ہم دونوں نے صلاح کی ہے —"
وہ ایک دم جیسے اچھل پڑا — جلدی سے بولا "کیا صلاح کی ہے"
"تیری شادی کی" صاصباں بولی
"گھر کا سونا پن اب نہیں دیکھا جاتا — تیری ووہٹی آجائے

بال بچے ہو جائیں۔ تو ہم بھی گھر کی خوشیاں دیکھیں ——" ماں نے کہا۔

راجو ایک دم سنجیدہ ہو گیا ——" میرا بھی یہی خیال ہے"

"تو —— تو راضی ہے نا" صاصباں جلدی سے بولی۔

"ہاں"

"لڑکی ہم نے ڈھونڈ لی ہے"

وہ چاولوں کی تھالی پر شکر ڈالتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر بولا "لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے —— اب شادی تم دونوں کروا دو ——"

ماں نے صاصباں اور صاصباں نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں پیڑھی اس کی کھٹولی کے قریب گھسیٹ لائی "کیا کہا ہے راجو ——"

وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرایا۔ اس کے چہرے پر ان گنت ستاروں کی چمک پھیل گئی —— آنکھوں میں خمار سا اتر آیا —— "نجو کو جانتی ہو ماں"

"کون نجو ——" ماں نے کہا۔

"وہ ملک فضل کی بہن جو ہے" صاصباں بولی۔

"ہاں ——" راجو نے جواب دیا۔

ماں کو اک جھرجھری سی آگئی —— پھیلی پھیلی آنکھوں سے کھٹولی پر بیٹھے راجو کو دیکھا —— اور بے اختیارانہ نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں" راجو ماں کی کیفیت کا اندازہ کر رہا تھا۔
"کہاں ملکوں کی دھی اور کہاں ہم راجو ——" ماں کی جگر صاحباں بولی
"کیوں ہم کوئی چوہڑے چمار ہیں ——" راجو نے کہا۔ تو ماں نے اک گہرا سانس لے کر کہا —— "یہ انہونی ہے راجو ——"
"کیوں ماں —— ایسی کیا بات ہے۔ تیرا پوت لُچا لفنگا تو نہیں۔ شکل وصورت کا بھی اچھا ہی ہے ——" وہ مسکرایا۔
لیکن
ماں اور صاحباں مسکرا نہ سکیں۔
"کل رشتہ لے کر چلی جاؤ دونوں بھائی فضل کے پاس" راجو نے کہا۔
"بے عزتی کروانی ہے"
"کیوں پر —— غریب ہی ہیں نا ہم —— اور کیا عیب ہے"
"غریبی ہی سو عیبوں کا عیب ہے پُتر ——"
راجو نے اک گہری سانس لی۔ پھر اسے اپنی محبت کی سچائی اور توانائی کا احساس ہوا۔ بڑے اعتماد سے بولا —— "تم لوگ جاؤ تو سہی رشتہ لے کر —— فضل انسانوں کو پرکھ سکتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے انکار نہیں کرے گا ——"
ماں نے مایوسی سے سر ادھر ادھر ہلایا۔ پھر آہستگی سے بولی۔
"ہم دونوں نے تو مہراں کی بیٹی کے متعلق سوچا تھا۔ بڑی اچھی

کڑی ہے۔ کام کاج کرنے والی ــــ"

"ہاں"

"ہاں"

"میری شادی کا سوچنا ہے نا۔ تو صرف نجو کے متعلق سوچ سارے پنڈوں کی کڑیاں بھی لاکر میرے سامنے کھڑی کر دے گی نا۔ تو میرا فیصلہ نجو ہی کے حق میں ہو گا ــــ"

تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔

پھر صاحباں مسکرا کر بولی "کوئی خاص گل ہے نا تیرا۔"

"یہی سمجھ لے پھوپھی ــــ" پھر اس نے بڑے ہولے سے کہا "وہ میرا پیار ہے پھپھی۔"

ماں نے بات سن لی۔ آہستگی سے جیسے اپنے آپ سے بولی "تیرا پیار ہے پر تیرا میل نہیں ــــ"

وہ بڑے اعتماد سے ہنس پڑا ــــ "تو فکر نہ کر ماں۔ میرا اس کا میل رب سچے نے کیا ہے۔ وہی حفاظت کرے گا ــــ تم لوگ کل مولا کا نام لے کر چلی جاؤ ان کے ہاں"

وہ دونوں چپ رہیں۔

"میں جو کہہ رہا ہوں ماں ــــ تم جاؤ وہاں ــ جا کر پیغام تو دو ــــ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے ــــ"

"اچھا ــ چھوڑ ان باتوں کو۔ کھانا کھا لے۔ بالکل ٹھنڈے ہو گئے ہیں چاول" صاحباں نے ہاتھ سے چاولوں کو چھوا۔

"پہلے وعدہ کرو ــــ"

"کس بات کا"

"رشتہ لے کر جاؤ گی"

"چلے جائیں گے ——"

اور ماں جلدی سے بولی "تو ہی جائے گی صاحباں۔ میرا تو حوصلہ نہیں پڑتا۔ چھوٹے منہ سے بڑی بات کرنے کا ——"

"حد ہو گئی ماں ——" راجو بولا "مجھے پتہ نہ تھا۔ تو اپنے آپ کو اتنا کمتر سمجھنے لگی ہے —— ماں کبھی ہمارا خاندان بھی آدھے پنڈ کا مالک تھا۔ یہ کیوں بھولتی ہے۔

"بھولنے کی بات ہی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اب ہم کیا ہیں"

تینوں کافی دیر بحث مباحثے میں الجھے رہے۔ چاول ٹھنڈے ہو گئے۔ چولہے میں آگ بجھنے لگی۔ اور دئے کا تیل ختم ہونے لگا۔ تو راجو نے ماں اور پھپھی کو نجو کے ہاں رشتہ لے کر جانے پر آمادہ کر ہی لیا۔

رتو کے بھائی کی شادی تھی ۔ تگڑے زمیندار تھے ۔ اس لئے مہینہ بھر پہلے ہی ہلا گلا شروع ہو گئی تھی ۔ روز رات کو جب چراغ جل اُٹھتے تو گاؤں کی سہاگنیں اور کنواریاں ان کی حویلی کے بڑے دلان میں جمع ہو کر ڈھولک پر خوشی کے گیت گاتیں ۔ سوانگ بھرتیں اور ہنسی مذاق کرتیں ۔ اور جب چراغوں کی روشنی مدھم پڑتے پڑتے ماند ہونے لگتیں تو ٹولیوں کی صورت گھروں کو لوٹتیں — میزبان دل والے بھی تھے ۔ حلوائی گھر پہ بٹھا لیا تھا ۔ روز رات کو مٹھائی بٹتی ۔ لڑکیاں بالیاں جھولیوں بھر بھر مٹھائی گھر بھی لے جاتیں ۔ دوسرے تیسرے دن میٹھے چاولوں کی دیگیں بھی پکنے لگی تھیں — گوشت روٹی تو روز کا معمول تھا —

رنگا رنگ کھیل تماشے بھی ہو رہے تھے ۔ کبھی مہمانوں کی خوشی کے لئے میراثیوں کو بلا لیا جاتا ۔ کبھی کٹھ پتلیوں کا تماشا

ہوتا ـــــ اور کبھی بیجڑے ناچنے گانے کو آ پہنچتے۔ آتش بازی بھی چھوڑی جاتی۔ لوگ محظوظ ہوتے۔

امارت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ پیسہ وافر تھا انہی موقعوں پر تو نمائش ہوتی تھی۔

نجو رتو کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ جوانی اور جوانی کی سرمستیوں کے راز بھی مشترک تھے۔ نجو رتو کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ بھابی کے لئے کپڑے رتو نے بنائے تھے۔ زیور بھی اس کی پسند کا بنا تھا۔ نجو ہر بات میں رائے دیتی تھی۔ اور رتو کی ماں باپ بھائی بہنیں اس رائے کا احترام کرتے تھے۔

باقی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ نجو بھی رات شادی والے گھر باقاعدگی سے جاتی تھی۔ رات کیا اس کا تو پورا پورا دن ہی وہاں گزرتا تھا۔ ہاں فضل کے انتظار میں کبھی کبھی وہ گھر ہی بیٹھی رہتی تھی۔

ویسے فضل اور سراج کی دوستی بھی تھی۔ اس کی شادی میں وہ بھی پوری طرح ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اکثر دونوں بہن بھائی وہاں اکٹھے ہی جاتے شہر سے چیزیں وہی لا رہا تھا۔

برات ساتھ والے گاؤں جانا تھی۔ سر شام ہی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ بڑے بڑے گیس روشنی کے لئے شہر سے منگوائے گئے تھے۔ آتش بازی کا بھی انتظام تھا۔ گاؤں کی اکثریت مدعو تھی۔ لوگ نئے کپڑے پہن کر چلے آ رہے تھے۔ جن کے پاس نئے نہیں تھے۔ انہوں نے بھی دھو دھلا کر پہنے تھے۔ کلف لگی

پگیں ہر دیہاتی کے سر پر تھیں۔ ان کے اونچے شملے پنڈ کی آن کا نشان تھے۔

عورتیں اور لڑکیاں بالیاں بھی رنگ برنگے کپڑے پہنے پھر رہی تھیں۔ گوٹے کناری لگے دوپٹے ڈھلک ڈھلک پڑتے تھے۔ چاندی اور سونے کے زیوروں سے بھی بعض تولدی ہوئی تھیں۔

نجو نے گابی گوٹے والا دوپٹہ لیا تھا۔ سبز کرتا تھا جس پر باریک گوٹے کی دھاریاں ٹکی تھیں — کالی سندوف کی شلوار تھی۔ پاؤں میں طِلے کی نوکدار جوتی تھی۔ آج اس نے اپنے سونے کے کڑے بھی پہنے تھے۔ چاندی کی چوڑیاں بھی تھیں۔ گلے میں کٹھا تھا۔ اور کانوں میں بڑے بڑے بالے — وہ بڑے والان میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ سب میں منفرد سب سے ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔

رتو بھی آج خوب بنی ٹھنی تھی۔ خوشی سے گلنار ہوئی جا رہی تھی بات بات پہ قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کے سیاہی مائل سانولے رنگ میں آج بلا کی کشش تھی۔

"رتو بڑی خوش ہے۔" کسی لڑکی نے کہا۔

"ویر کی شادی ہے خوش کیوں نہ ہوگی" دوسری بولی

"ہائے اللہ — یہ تو خوشی ہی عجیب طرح کی ہوتی ہے۔ میرے بھائی کی بھی پچھلے مہینے شادی ہوئی ہے نا"

"پہلے ہی خوشی ہوتی ہے۔ بھابی آجائے تو خوشی ہوا ہو جاتی ہے۔"

"واہ کیوں"

"ہم نے تو یہی دیکھا ہے"

"یہ تو اپنے اپنے گھر کا طریقہ ہے۔ ہماری بھابی بھی تو ہے"

"بس لڑائی جھگڑے ضرور شروع ہو جاتے ہیں ——"

"ضروری تو نہیں ——"

لڑکیاں اپنی اپنی بھابیوں کی باتیں کرنے لگیں —— نجوان کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ بولی "بھائی پیارے ہوں تو بھابیاں ان سے بھی پیاری ہوتی ہیں —— مجھے تو بیگاں ابھی سے اتنی پیاری لگتی ہے۔ کہ ——"

"کون بیگاں" کسی لڑکی نے پوچھا۔

"اے ہے۔ بھائی فضل کی منگ —— نجو کی پھپھی کی دھی۔"

"میں نے نہیں دیکھی کبھی ——"

"کوٹلی رہتی ہے نا ——"

"نجو تو اپنے بھائی کی شادی کیوں نہیں کرتی ——"

نجو نے اک گہری سانس لی —— اور بولی "ہائے میرا بس چلے تو آج ہی کر دوں"

"یہ کیا بات ہوئی" کوئی لڑکی بولی۔

"بھئی —— اس کا دیر مانتا ہی نہیں —— اس نے ایک شرط رکھی ہوئی ہے" رتو نے ہنس کر نجو کو چھیڑا۔

"کون سی شرط ——" بہت سی لڑکیاں نجو کے گرد گھیرا ڈال کر بولیں۔

"وہ کہتا ہے۔ پہلے نجو کی شادی کروں گا۔ پھر اپنی ——"
رتو بولی۔
"پھر کرتا کیوں نہیں اس کی شادی"
"یہ اس کی لاڈلی بہت ہے۔ آسمان سے کوئی شہزادہ اُترے گا اس کے لئے —— جو بنسری بجاتا آئے گا —— اور ——"
نجو نے زور سے رتو کے پہلو میں چٹکی کاٹی —— اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ کم بخت کہیں سب کے سامنے اس کا راز ہی فاش نہ کر دے —— رتو آنکھیں مٹکاتے ہوئے اپنا پہلو سہلانے لگی۔
لڑکیاں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھیں۔ کہ رتو کا چھوٹا بھائی دالان میں آتے ہی رتو سے بولا "بھا فضل کے پیٹ میں درد ہے —— چکی دے دو"
"کیا ——" لڑکیوں کا گھبرا چیر کر نجو آئی۔
"چکی چاہیئے ——" مہر بولا —— "بھا فضل کے پیٹ میں بڑی پیڑ ہو رہی ہے ——"
"کہاں ہے وہ ——" نجو کا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ تھر تھر کانپنے لگی۔
رتو نے جلدی سے اسے تھام لیا ——
"میرا ویر ——" وہ لرزتے ہوئے بولی۔
"گھبرا نہیں نجو ——" شادو اور دوسری لڑکیوں نے نجو کو تھام لیا ——
لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر بھاگی —— صحن سے دوڑتے ہوئے

باہر کو لپکی - مہر اور رتو اس کے پیچھے آئے۔ باہر کی بیٹھک میں فضل چارپائی پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ گھر کے لوگ اس کے پاس کھڑے تھے۔ کچھ مہمان بھی تھے — اپنے اپنے آزمودہ نسخے بتا اور آزما رہے تھے۔ پیاز کا پانی — سرکہ اور نمک۔ اجوائن اور کالا نمک — جو کچھ کوئی بتا رہا تھا۔ وہ کھا پی رہا تھا — لیکن درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ویر جی —" نجو کمان سے نکلے تیر کی طرح فضل کے سینے سے جا لگی۔ وہ تڑپ رہی تھی۔

"اوہ — پگلی — تمہیں کس نے بتا دیا" بمشکل فضل کہہ سکا۔

"کیا ہو گیا میرے ویر کو — نظر لگ گئی کسی کی —" وہ چیخی۔

کمرے میں کھڑے بڑے بزرگ نجو کو تسلی دینے لگے "بی بی حوصلہ کرو۔ خیر ہو جائے گی —"

"اللہ میرے ویر کی پیڑ مجھے دے دے" نجو نے روتے ہوئے فریاد کی۔ "میرے ویر کو کوئی تکلیف نہ ہو —"

وہ معصومانہ انداز میں دعائیں کرتے ہوئے بھائی کی ساری تکلیفیں خود اپنے اوپر لینے کو تیار تھی۔

کمرے میں رش بہت ہو گیا تھا — فضل کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ بڑا گھبرو جوان تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیف کو تو کبھی خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔ درد کی شدت ہی تھی۔ جو رنگ زرد ہو رہا

تھا۔ اور سردی کے باوجود پسینے آرہے تھے۔
کوئی حکیم جی کو لانے دوڑا — فضل نے گھر جانے کی خواہش کی — تھوڑی ہی دیر بعد دو تین جوان اسے سہارا دے کر گھر لے چلے — نجو بھی ساتھ ساتھ گئی — وہ تو جیسے مرغ بسمل تھی —
حکیم جی آگئے — انہوں نے اچھی طرح فضل کو دیکھا۔ اور دوائیاں تجویز کیں۔ پہاڑی پودینے موٹی الائچی اور دار چینی کا قہوہ بنا کر فوراً پلانے کو کہا۔ دوائیاں مطب سے بھیجنے کا کہہ کر وہ بکو کو ساتھ لے کر چلے گئے۔
نجو دوڑی اور قہوے کی چیزیں تلاش کرنے لگی۔ جیراں پہاڑی پودینہ برابر والوں کے گھر سے لے آئی۔
کچھ لوگ احوال پرسی کو یہاں بھی آگئے۔ ان میں راجو بھی تھا۔ لیکن نجو کو تو جیسے گرد و پیش کا ہوش ہی نہ تھا۔ گھبراہٹ سٹپٹاہٹ اندر باہر دوڑ بھاگ رہی تھی۔ راجو کو اس محبت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ جو نجو کو اپنے بھائی سے تھی۔
دوائی کھانے کے گھنٹہ بھر بعد فضل کو کچھ آفاقہ محسوس ہوا — وہ اوندھا لیٹے لیٹے ہی اونگھ گیا — نجو اس کے پلنگ کے قریب بیٹھی دعائیں کرتی رہی۔
ادھر برات روانہ ہو رہی تھی۔ لوگ جوق در جوق اکھٹے ہو رہے تھے۔ رتو اور سب سہیلیاں تیار کھڑی تھیں — نجو کا انتظار تھا۔
لیکن

تو بہ نجو بھائی کو یوں چھوڑ کر باہر جانے والی تھی۔ اسے تو کچھ
بھائی ہی نہ دے رہا تھا — باؤلی ہو رہی تھی۔
رتو خود اسے بلانے گئی۔ لیکن نجو نے جانے سے انکار کر دیا
"تم تو تم رتو — اس وقت تو موت بھی مجھے بلانے آجائے تو نہ
جاؤں —" اس نے فضل کی چارپائی کے قریب بیٹھے بیٹھے کہا۔
رتو بولی "اب تو بھائی فضل کو آرام ہے سو گئے ہیں"
"نہیں رتو — تم سب جاؤ"
"مہینوں سے تیاری کر رہی تھی اور اب —"
"رب کو یہی منظور تھا"
"تھوڑی دیر کے لئے چلی چل"
"نہیں بھئی — میں تو ایک پل کے لئے بھی یہاں سے ہل
نہیں سکتی —"
ماسی رابو اور جیراں نے بھی بہت زور دیا۔ لیکن نجو تو فضل کو
یوں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"تاج"

"ہاں"

"ہاں نہیں جی بولتا ہے"

"اوہ — اچھا — جی — ہمارے حربے ہم پر ہی آزمانے لگی ہو"

"برا بات ہے کیا"

"نہیں نہیں ٹھیک ہے"

"تم کدر جاتا ہے"

"کب"

"اب"

"گاؤں"

"ام بھی چلے گا"

"کہاں ! میرے گاؤں"

"تمہارا گاؤں دیکھے گا ام — تم نے ام کو اپنا گاؤں نہیں دکایا۔
اپنا بھین بھائی سے نہیں ملایا ——"

تاج اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ گل کو غصہ آگیا۔ "کیوں ہنستا ہے"

"تم گاؤں جاکر کیا کرو گی"

"تمارا رشتہ دار سے ملے گا ام"

"میرے رشتہ دار بہت ظالم ہیں — کچا کھا جائیں گے تمہیں"

"کیوں"

"میں نے ان کی مرضی سے تم سے شادی نہیں کی نا ——"

"اپنا مرضی سے تو کیا ہے نا"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ لوگ تمہیں قبول کب کریں گے۔
ہمارے گاؤں کے لوگوں کو تو نہیں جانتی ——"

"ام ضرور جائے گا۔ دیکھے گا وہ امارا کیا بگاڑتا ہے"

"وہ شیرنی کی طرح غرّائی — تاج اس کے تیور دیکھ کر
چپ ہو گیا —"

"ام تمہارا بیوی ہے۔ شادی کیا ہے۔ خدا اور رسول کے
سامنے ام تم میاں بیوی بنا ہے ——"

"پھر بھی — میرے خاندان والوں کی مرضی سے تو یہ سب
کچھ نہیں ہوا نا — وہ سب تمہارے خلاف ہو جائیں گے
مار ڈالیں گے تمہیں —"

وہ ہنس پڑی — "تم سمجھتا ہے ام اس بات سے ڈر جائے گا۔

ام تو خود مرنے مارنے پر تیار رہتا ہے ــــ"

پیچھا چھڑانے کو تاج نے اس کا کندھا تھپتھپایا ــــ "اچھا کسی وقت لے چلوں گا ــــ"

"ام آج جائے گا تمارے ساتھ"

"نہیں گل"

"تم روز روز جاتا ہے ــــ ام کو نہیں لے جاتا۔ آج ام ضرور جائے گا"

"اوہ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو ــــ"

"سب سمجھتا ہے۔ چلو ــــ ام تمارے ساتھ ابھی چلے گا ــــ"

"ابھی میں کہاں جا رہا ہوں"

"تم نے بولا ہے گاؤں جائے گا"

تاج نے بہتیرا اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ٹلنے والی کہاں تھی۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خونخوار ہو جاتی تھی۔ اس کی ضد اور ہٹ کے سامنے اکثر تاج کو جھکنا پڑتا تھا۔

ویسے تاج کا دل اب گل پر دشے سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی شگفتہ اور حسین تھی۔ ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ سونے سے پہلے اس کے پاؤں دباتی تھی۔ اس کی خاطر اس نے بہت سی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ شہری باتیں جو اسے ناپسند تھیں اپنا لی تھیں ۔ اور تو اور تاج کے شراب پینے کو بھی تھوڑی سی لڑائی کے بعد گوارہ کر لیا تھا۔ ان ساری باتوں کے

عوض وہ صرف اور صرف تاج کی محبت اور اعتماد کی بھوکی تھی ۔
کوئی اس سے زندگی کی یہ ساری آسائشیں لے کر اسے کنگال کر دیتا ہے اور اس کے پاس صرف تاج رہ جاتا۔ تو اسے ملال نہ ہوتا — یہ عیش و عشرت تو ثانوی چیزیں تھیں۔ اسے ان کی پرواہ نہ تھی۔ تاج اکثر گاؤں چلا جاتا — یا دوستوں کے گھر رات گئے تک بیٹھا رہتا — گل مرقعہ انتظار بنی رہتی — جب وہ آجاتا۔ تو گلہ کرنے کی بجائے اس کے قدموں میں بچھ بچھ جاتی ۔

اسے اس کی سرگرمیوں کا تاحال علم نہ ہوتا — وہ نئے نئے بہانے اس خوبصورتی سے تراشتا لیتا۔ کہ بھولی بھالی گل پروشے یقین کے جال میں پھنس جاتی —

لیکن آج وہ اس کے ساتھ گاؤں جانے کے ضد کر بیٹھی — وہ اس وقت واقعی گاؤں جا رہا تھا — اس کے خاندان میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کے دو خالہ زادوں نے اس کی پھوپھی کے بیٹے کو کلہاڑیوں سے زخمی کر دیا تھا۔ وہ بچ گیا تھا — لیکن تاج کے ننھیال اور ددھیال میں دشمنی کا بیج بویا گیا تھا۔

بڑے بھائیوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اس سے صلاح مشورے لیتے تھے — کچھ تو پڑھا لکھا تھا — کچھ شہر میں اس کی حکومتی افسروں سے بنتی تھی۔ انگریز مجسٹریٹ دوست تھا — ایس پی سے بھی شناسائی تھی ۔

آج جانا ضروری تھا۔ لیکن گل پروشے مچلی ہوئی تھی — وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اپنے خاندان کی کوئی بات گل کو بتائے۔ لیکن

آج اس کی ضد دیکھ کر اس نے یہ سارا واقعہ اسے سنا دیا۔
"کیا ہوا — ام بھی ادر دیکے گا سب کچ"
"گل کہنا ماننا سیکھو — ورنہ — " اسے غصہ آگیا۔
"ورنہ — ورنہ — کیا کرے گا — " گل غرائی "
"گھر سے زکال دوں گا۔ طلاق زکال دوں گا —" وہ بھی لال پیلا ہوگیا —
"ہوں " گل نے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر ایسی خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ کہ اس کا دل ہول گیا۔
"کیا کہا۔ ایک بار پھر بولے گا تاج —" وہ تو اجل کی طرح ٹوٹ پڑنے کو تیار نظر آئی۔
تاج نے ہنستے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا — "مذاق سمجھا کرو —"
گل نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا " ام ایسا مذاق بھی برداشت نہیں کرے گا —"
" اچھا بھئی اچھا "
" امارا نام گل پروشے ہے۔ ام پتھروں کا بیٹی ہے، پتھروں کی طرح سخت — سمجھا —"
" سمجھا سمجھا "
تلخ کلامی کو تاج نے ہنس ہنس کر مٹانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ اس کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا۔ اور وہ جو کئی دنوں سے گل پروشے سے پیچھا چھڑانے اور اسے

کسی اور ضرورت مند کے ہاتھ اونے پونے بیچ دینے کی سوچ رہا تھا — اندر ہی اندر سہم گیا۔

گل اس کے ساتھ تیار ہوگئی — تاج کو اسے گاؤں لے جانے کی حامی بھرنا پڑی —

"ایک شرط ہے" بالآخر تاج نے کہا۔

"بولو"

"تم میرے خاندان والوں سے نہیں مل سکتیں — گاؤں جا سکتی ہو"

"ام کدر جائے گا وہاں"

"ہماری ایک حویلی گاؤں کے سرے پر ہے۔ وہاں —"

نہ جانے کیا سوچ کر وہ بولی "ٹھیک ہے۔"

"حویلی کے ساتھ ہی ایک طرف پیلاں والی اور دوسری طرف کوٹلی کی زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔ تم چاہو۔ تو ان دونوں گاؤں میں گھوم پھر سکتی ہو۔ مجھے وہاں کافی دیر لگے گی — "

گل پروشے نے سر ہلایا —

تھوڑی دیر بعد وہ موٹر میں تاج کے برابر بیٹھی بڑی سڑک پر جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر علما بیٹھا تھا۔ اس کی بیٹی گوگی بھی ساتھ تھی۔ علے اور گوگے کو تاج نے سب کچھ سمجھا دیا تھا — وہ دونوں گل پروشے کو دوسرے گاؤں گھما پھرا کر دکھائیں گے — اور اپنے گاؤں سے دور ہی رکھیں گے — اس نے انہیں کہہ دیا تھا۔

بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بڑے بڑے صدیوں پرانے بوہڑوں اور ٹاہلیوں کے جھنڈوں میں ہوا سرسراتی پھر رہی تھی۔ شام کی اُداسی اتر چکی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ صبح سے وقفوں کے بعد پھوار پڑنے سے خنکی کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ اور یہ بوجھل پن فضا میں اُداسی بھر رہا تھا —— سردیوں کا چھوٹا ساون ختم بھی تو جلدی ہو جاتا تھا۔ سردی کے ڈر سے لوگ خود اور ڈھور ڈنگر سرِ شام ہی ٹھکانوں پہ چلے جاتے تھے —— کھیتوں میں تو اِکا دُکا رکھوالے ہی رہ جاتے تھے۔ اب تو گاؤں کی کنواریاں بھی ادھم مچاتے میدان میں نہ آتی تھیں۔ کبھی کسی سکھی کی حویلی میں جمع ہو جاتیں کبھی کسی کی۔ زیادہ تر گھروں ہی میں رہتیں۔ اور کچے دالانوں کے پرانے دروازے بند کر کے لحافوں میں گھس کر نئے پُرانے قصّے سناتے سو جاتیں۔

فضل کئی دِنوں بعد بیگاں سے پُرانے بوہڑ کے نیچے ملا تھا۔ وہ تین چار دن بیمار رہا تھا۔ پھپھی سکینہ اور سب گھر والے اس کی

احوال پرسی کو آئے تھے۔ وہ کیا پنڈ کا کون سا بندہ تھا جو پوچھنے نہ آیا تھا۔

بیگاں نہیں آئی تھی ـــــ گو اس نے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔ اپنی بیقراری اور بے چینی کا کھل کر تو نہ بتا سکی تھی۔ ہاں احوال پرسی ضرور کر لی تھی۔

آج فضل ہڑیالے کی درمیانی سڑک سے ہوتا کوٹلی اپنے ایک یار بیلی کے پاس آیا تھا۔ واپسی پر پھوپھی کے گھر بھی گیا تھا۔

بیگاں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئی تھی۔ بہت لاغر ہو رہا تھا وہ۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چہرہ اترا ہوا تھا۔

وہ اس سے کوئی بات نہ کر سکی۔ اندر چاچے کے پاس جو وہ بیٹھا تھا ـــــ

بیگاں صحن میں اِدھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی تھی۔

پھپھی نے خاطر مدارت کرنا تھی۔ جلدی سے مرغی ذبح کروالی۔ اور یخنی بنوانے کے لئے بیگاں سے چھوٹی فضلاں کو کہا

لیکن وہ مرغی ابھی نل کے نیچے دھو رہی تھی۔ کہ فضل باہر نکل آیا۔

"بھا فضل کہا چلے بیٹھو نا" فضلاں جلدی سے بولی۔

"اب واپس جاؤں گا ـــ شام اُتر رہی ہے ـــ" وہ بولا

"نہیں پتر ـــ تیرے لئے یخنی بنوا رہی ہوں روٹی کھا کر جانا۔

"پھپھی میں نے کچھ نہیں کھانا اس وقت۔ ابھی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ـــ اور پھر دیر ہو گئی ـــ تو تجھے پتہ ہے نا

اس کا ——"

"کس کا"

"اپنی لاڈلی بھتیجی کا —— رو رو کر مر جائے گی۔ میں دیر سے گیا تو ——"

"تیری مرضی —— ورنہ میں نے تو مرغی ذبح کروالی تھی ——"

"بس پھپھی —— اب جاؤں گا — جاتے جاتے بھی وقت لگے گا ——"

پھوپھی دُعا و سلام کے بعد اندر چلی گئی ——

"فضلاں میں ذرا باہر جا رہی ہوں" بیگاں نے آہستگی سے بہن سے کہا۔ اور مسکرا کر فضل کو دیکھا۔ جو اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا —

فضلاں مرغی کا ایک ایک ٹکڑہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"جلدی آجانا"

"اچھا"

وہ باہر نکل گئی —— فضل بھی گھوڑی کی باگ پکڑے باہر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں پُرانے بوہڑ تلے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

گھوڑی کو فضل نے کھلا چھوڑ دیا۔

"تو کتنا لائق ہو گیا ہے ——" بیگاں نے اس کڑیل جوان کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

"تجھے کیا"

"مجھے کچھ نہیں"

"ہاں کون سا دیکھنے آگئی تھی"

"کیسے آتی فضل"

"کیوں ۔ کوئی غیروں کے گھر آنا تھا"

"وہ تو ٹھیک ہے ۔ لیکن اپنے منہ سے کیسے کہتی مجھے لے چلو ۔ کسی نے مجھے ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی — تم کیا جانو میرا کیا حال تھا"

فضل نے بیگاں کو بڑے پیار سے دیکھا — "سچ کہہ رہی ہو"

"میری حالت جو تھی ۔ خدا ہی جانتا ہے ۔ شکر ہے خدا نے تجھے بچا لیا ہے"

"بیگاں"

"ہاں"

"اگر میں مرجاتا — تو —"

بیگاں نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا — "رب نہ کرے"

فضل نے شوخی سے اس کے ہاتھ کو دانتوں میں پکڑ لیا ۔

وہ لجا گئی — بمشکل ہاتھ چھڑا پائی — فضل مخمور نگاہوں سے اسے تکنے لگا ۔

"چل ہٹ" بیگاں نے نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی ۔

فضل نے آگے بڑھ کر اپنے مضبوط مشقتی ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے ۔ اور بڑے اصرار سے بولا "سچ سچ بتا بیگاں"

"کیا"

"اگر میں مرجاتا تو تو کیا کرتی —"

"پھر وہی بات"
"تو بتا دے نا"
"بری باتیں مت کر"
"چل بری سہی۔ تو بتا تو دے — کیا کرتی جو میں مر جاتا تو۔"
"ہائے اللہ۔ ایسی منحوس باتیں کرتا ہے تو"
"چل میری ضد ہی سہی — بتا کیا کرتی —"
بیگاں نے سر اٹھایا۔ اپنی سیاہ ستاروں ایسی چمکتی آنکھیں فضل کے چہرے کی طرف کیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بڑے ٹھوس لہجے میں بولی "فضلے بیگاں اور تم دو تو نہیں — تو نہ رہتا۔ تو بیگاں بھی ختم ہو جاتی — اپنے آپ"
"بیگاں" بے اختیارانہ فضل نے کہا اور اس کو بازوؤں میں بھر کر چھاتی سے لگا لیا —
بیگاں کا جی بھر آیا۔ اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ فضل بے زباں جذبوں کے ایسے اظہار سے بے طرح متاثر ہوا۔
تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔
پھر بیگاں بولی "اب میں جاؤں"
"جی تو نہیں کرتا"
"رات ہو رہی ہے —"
"ڈرتی ہے"
"کس سے"
"رات سے"

"سردیاں ہیں نا ۔ راہیں سنسان ہیں ——"
"تو کیا ہوا پنڈا اپنا ہے —— لوگ اپنے ہیں ——"
"پھر بھی ——"
بیگاں کچھ سوچتے ہوئے بولی ۔ فضل نے یونہی چھیڑا —— "فضلے
ی منگ ہو کر ڈرتی ہو سنسان راہوں سے"
"نہیں فضلے یہ بات نہیں — لیکن ——"
وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی — تو فضلا سمجھ گیا —— "کوئی بات
ہے کیا۔"
"نہیں نہیں کچھ نہیں ——"
"بتا دے"
"ایسی کوئی بات نہیں ۔ پر تو مجھے گھر کی گلی تک چھوڑ آ ——"
فضل نے سر آہستہ آہستہ ہلایا —— "کوئی بات ہے نا —— چھپاتی
کیوں ہے ۔ کیا خوف ہے اپنے فضلے سے ——"
"کچھ نہیں فضلے ۔ تو تو یونہی پوچھے جا رہا ہے ۔ جا تو —— میں چلی
جاؤں گی اکیلی —— ڈرنے والی تو میں ہوں نہیں —— کسی کی
مجال ہے جو ——"
"اچھا میں چلا —— چھپا رہی ہے نا مجھ سے —— چھپاتی
رہ ——"
وہ مڑا تو بیگاں نے دوڑ کر اسے بازو سے پکڑ لیا —— ہنس کر
بولی "ناراض تو نہ ہو ——"
"میں کیوں ناراض ہوؤں گا ——" وہ روٹھ گیا۔

بیگاں اس کے منہ بنانے پر ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی "بات تو کچھ بھی نہیں فضلے ـــ صرف ـــ صرف یہ ہے کہ آج تاج سکھیر گاؤں آیا ہوا ہے ـــ"

فضل نے حیرانگی سے بیگاں کو دیکھا اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے کرخت لہجے میں بولا "آیا ہوا ہے ـــ تو تجھے کیا ـــ اکثر آیا ہوتا ہے ـــ"

"جب میں یہاں آ رہی تھی۔ تو وہ ناجے چوہدری کے گھر میں داخل ہو رہا تھا ـــ"

"پھر ـــ"

فضل جھلا گیا۔ چڑ کر بولا "اس نے تجھے کچھ کہا ہے"

"نہیں نہیں" وہ گھبرا گئی۔ دوسرے لمحے بولی "بس اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بہت بُری نظروں سے دیکھتا ہے مجھے"

فضل کا خون کھول گیا آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ گھوڑی کی طرف لپکا کہ بیگاں دوڑ کر اسے کندھے سے پکڑ کر بولی "فضلے بات تو سُن"

فضل نے باگ پکڑے پکڑے بیگاں کو دیکھا۔ وہ جبراً ہنس پڑی۔ "غصّہ تو تیرے ناک پر دھرا ہے۔ ذرا ہوش سے بات تو سُنا کر"

بیگاں فضل کے یور دیکھ کر ڈر گئی۔ سکھیروں اور ملکوں کی صدیوں پرانی دشمنی کا اسے پتہ تھا۔ اس نے سوچا تو تھا۔ کہ تاج کے متعلق فضل کو بتا دے گی۔ لیکن وہ تو صرف اشارہ ہی سمجھ کر مشتعل ہو گیا تھا۔

پوری بات بتا دیتی تو ابھی اسے جاکر قتل کر دیتا۔
ہنس ہنس کر اس نے بات کی سینگنی ختم کرنا چاہی۔ لیکن فضل کے دل میں چبھن بیٹھ گئی تھی — تاج سکھیرے کی یہ مجال کہ اس کی ننگ کو بُری نظروں سے دیکھے؟ — وہ یہ آنکھیں نہ نکال دے گا — !!

بیگاں کی پیار بھری باتوں کے باوجود وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ سکھیروں کی زیادتی کے باوجود اس نے دل سے دشمنی کا بیج نکال دیا تھا — وہ نہیں چاہتا تھا کہ نسل در نسل خون خرابوں کی روائت منتقل ہوتی رہے۔

لیکن

آج بیگاں کی بات نے اس کے خون کو کھولا دیا تھا۔ سانپ کا سر کچل کر ہی اس کے ڈسنے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی صداقت اور سچائی پر اسے یقین آگیا تھا۔

فضا میں چاندنی کا نُور بہہ رہا تھا۔ پرانے کھوہ کے قریب
کیکر اور ببول کے جھاڑ جھنکار سے ذرا ہٹ کر منڈیر کے پاس راجو
کھڑا بنسری بجا رہا تھا۔ اپنے نغموں کے درد میں آپ ہی ڈوبا
ہوا تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لئے اس نے کھیس لپیٹ رکھا تھا۔
نجو کا انتظار تھا۔ انتظار کی سنگینی اور رنگینی سے آشنا دل نغموں
ہی میں سکون ڈھونڈ رہا تھا۔

ان دِنوں نجو کا آنا آسان نہیں تھا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ اور اب
لڑکیاں بالیاں میدان میں جمع نہیں ہوتی تھیں — رتو ہی اسے اپنے
گھر بلانے کے بہانے یہاں تک لے آتی تھی۔

آج بھی وہ دونوں کالی گرم شالوں کی بُکلیں مارے تیز تیز قدم
اُٹھاتے چلی آ رہی تھیں — درختوں تلے اندھیرا تھا۔ لیکن وہ اسی
پنڈ کی بیٹیاں تھیں۔ چپہ چپہ زمین ان کے لئے ماں کی آغوش کی
طرح تھی۔ اس لئے بے دھڑک چلی آ رہی تھیں — وقت تو کچھ

اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن سردی کی وجہ سے اب کھیتوں کی رونق گھروں میں منتقل ہوگئی تھی۔ چوہدریوں کی بیٹھکوں میں حقے گڑگڑاتے تھے۔ اور ہیر وارث شاہ ـــــ مرزا صاحباں اور میاں محمد کی سیف الملوک مخصوص اور دردیلی لَے میں پڑھی جاتی تھی۔ کہیں کہیں جوان لڑکے اکٹھے ہوکر ماہیا بھی گاتے تھے ـــــ دن بھر مشقت کے بعد اس قسم کی تفریح ان کے لئے ضروری ہوتی تھی۔

راجو سے تھوڑے فاصلے پر رتو رُک گئی۔

"کیوں" نجو نے پوچھا۔

"بس اب جا ـــــ وہ سامنے تو کھڑا ہے ـــــ"

"تو بھی آنا ـــــ"

"میں کیا کروں گی ـــــ"

"باتیں"

"تیری اس کی اپنی باتیں تھوڑی ہیں۔ جو میں بھی جا پہنچوں"

"نہیں رتو ـــــ چل تو بھی میرے ساتھ ـــــ"

"پاگل ہوگئی ہے ـــــ جا اب۔ لیکن جلدی چلی آنا۔ میں اس چھپڑ کے کنارے بوہڑ تلے بیٹھی ہوں ـــــ"

"ہائے وہاں اکیلی بیٹھی رہے گی ـــــ چل نا میرے ساتھ راجو کی باتیں تو بھی سُن لے ـــــ"

رتو انکار کرتی رہی۔

"اچھا راجو کے پاس پہنچا تو آ مجھے ـــــ" نجو نے کہا۔

"چھوٹی سی بچی ہے نا تو۔ ڈرتی ہے وہاں تک جاتے ہوئے"
"جو دل چاہے سمجھ لے پر آ میرے ساتھ ——"
دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہاں جا پہنچیں ——
"راجو" بجو نے اسے سریلی سی آواز دی۔
راجو نے بنسری ہونٹوں سے جدا کر کے آنکھیں کھول دیں ——
بجو کو برق پاش نظروں سے دیکھا۔ لیکن قریب ہی کھڑی رتو کو دیکھ کر حیران سا ہوا۔
رتو ہنس پڑی —— "بھا راجو —— یہ جو تیری چہیتی ہے نا مجھے زبردستی ساتھ گھسیٹ لائی ہے"
"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں" وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔
رتو پھر ہنس پڑی بجو منڈیر پر بیٹھ کر مسکرانے لگی۔
"فکر نہ کرو۔ میں تو اسے تمہارے پاس پہنچانے آئی ہوں۔ چلی جاتی ہوں"
"رتو" بجو نے اس کے قدم اٹھاتے ہی کہا۔
"ہاں"
"کیوں جا رہی ہو۔ ٹھہرنا تھوڑی دیر"
"نہیں بھئی —— مجھے کسی کے دل کی بددعا نہیں لینی"
اب راجو ہنس پڑا ——
"ایک بات سن بھا راجو" رتو نے کہا
"کہو"
"تو اسے گاؤں کی اس آخری گلی تک چھوڑ جائے گا؟"

"ہاں"

نجو منڈیر سے اچھل کر اتری۔ اور بولی "نہیں نہیں ـــــ وہاں تک جاتے کسی نے دیکھ لیا تو ـــــ"

"تو کیا ہوا ـــ" رتو ہنس کر بولی "یا تو تم دونوں کی مشکل حل ہو جائے گی۔ یا ـــــ"

"یا ـــــ کیا ہوگا ـــــ"

"بھا فضل دونوں کی ـــــ" رتو نے ہاتھ سے گردن کاٹنے کا اشارہ کیا۔

تینوں ہنس پڑے۔

"عاشق موت سے نہیں ڈرتے ـــــ بھین رتو ـــــ" چند لمحوں بعد راجو بولا ـــــ اس کے لہجے اور ٹھوس انداز سے نجو بڑی متاثر ہوئی۔

رتو مذاق کے موڈ میں تھی بولی "عاشق موت سے نہیں ڈرتے۔ پر رشتے کی بات کرنے سے ڈرتے ہیں ـــــ"

نجو ہنس پڑی ـــــ "یہ بات کی ہے نا"

راجو ایک طویل سانس کھینچ کر بولا ـــــ "رتو بھین تو ہی مدد کر ہماری۔ میں تو بے بے اور پھپھی کو کہہ کہہ کر تھک گیا ہوں"

نجو نے گھبرا کر اسے دیکھا اور اس کے دل کی بات بوجھ کر رتو جلدی سے بولی "کیا کہا ـــــ تیری بے بے اور پھپھی یہ رشتہ پسند نہیں کرتیں ـــــ"

"لو حد ہو گئی ـــــ" راجو بولا ـــــ "پسند تو بہت کرتی ہیں۔

پر رشتہ لے کر جانے کی ہمت نہیں کرتیں ——"

"کیوں"

"ہمارے پلّے ہی کیا ہے رتو بھین۔ کہتی ہیں چھوٹا منہ ہے بڑی بات کیسے کریں۔"

رتو چپ ہوگئی۔ اس پہلو سے تو کبھی اس نے سوچا ہی نہ تھا ——

"تو نے اپنی بے بے سے بات کی تھی" نجو نے پوچھا

"ہاں"

"پھر"

"پھر وہی بات —— تمہارے گھر جانے کا حوصلہ نہیں کرتی۔ کئی دِنوں سے کہہ رہی ہیں —— پر جاتی نہیں ——"

"کوئی اور بات تو نہیں راجو ——"

"اور کیا بات ہو سکتی ہے"

"تیری ماں اور پھپھی کہیں اور ——"

"اور نہیں نجو ——"

رتو چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "تو اپنی بے بے کو ہمارے گھر بھیج نا —— میری اماں سے بات کریں"

"ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا ——"

"حق ادا کر دیا ہے نا بہن ہونے کا"

"بالکل بالکل۔ لے میں کل ہی بے بے کو تمہارے گھر بھیجوں گا —— چاچی سے بات کر لیں گی"

"ٹھیک"

"ٹھیک"

رتو نے بات معقول کی تھی۔ یوں مسئلہ حل ہونے کی توقع تھی۔

"بس اب میں جاؤں" رتو نے شوخی سے دونوں کو دیکھا۔

"میں بھی چلتی ہوں" نجو نے راجو کی طرف دیکھا۔

راجو نے بُرا سا منہ بنالیا ـــــ روٹھا روٹھا نظر آنے لگا۔ نجو جلدی سے بولی "اچھا تو جا رتو ـــــ میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی ـــــ"

"میں اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔ بھاراجو تجھے چھوڑ جائیگا۔"

"چلو ٹھیک ہے" راجو بولا ـــــ میں گلی کے سرے تک چھوڑ جاؤں گا۔"

"پھر وہی بات ـــــ کسی نے دیکھ لیا تو ـــــ"

"رتو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گردنیں ہی اُڑیں گی نا ـــــ" وہ ہنس کر بولا ـــــ

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رتو واپس چلی گئی۔

راجو اور نجو ایک دوسرے کے سامنے منڈیر پر بیٹھ گئے ـــــ نگاہوں سے شراب محبت چھلک رہی تھی۔ دل ایک دوسرے پر فدا ہو رہے تھے۔ مسحور مسحور سے دونوں ایک دوسرے کو تکے جا رہے تھے۔

وقت گزرنے کا احساس بھلا کسے ہوتا۔ دُور پنڈ میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں پر دونوں چونک گئے۔

نجو جلدی سے بولی "اب چلیں راجو۔ وقت بہت ہوگیا ہے"

"جی تو نہیں کرتا ——" وہ بولا۔

نجو کے اصرار پر اس کے کھیس کی بکل ماری۔ بنسری کو کھیس سے پونچھا اور بولا "چلو ——"

دونوں درختوں تلے ہوتے گاؤں کی طرف جانے لگے۔ دونوں اب بھی پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ وفا کی قسمیں کھا رہے تھے ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے کی باتیں کر رہے تھے۔

"نجو —— بھا فضل نے اگر انکار کر دیا نا۔ تو تیرا راجو مر جائیگا۔"

"وہ انکار نہیں کرے گا راجو —— تو نہیں جانتا وہ میرے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اور اگر اس نے انکار کر ہی دیا نا۔ تو تیری نجو بھی تیرے ساتھ ہی مرے گی"

راجو نے ہاتھ میں لیا نجو کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

کچہری کے احاطے میں چوہدری نظام دین نے فضل کو دیکھا تو لپک کر آئے۔

"فضل ——"

فضل نے گردن گھما کر دیکھا چوہدری نظام دین تھے ——

"سلام ماما جی"

دونوں بغل گیر ہو گئے۔ پھر الگ ہوتے ہوئے مصافحہ کیا۔ نظام دین فضل کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

"کیسے آئے ہو"

"میرے اک مزارعے کی پیشی تھی آج"

"کوئی جھگڑا ہو گیا"

"چھوٹے موٹے تو ہوتے ہی رہتے ہیں ماما جی —— زمین اور پانی کے جھگڑے"

"انہیں سے تنگ آ کر ہی تو ہم شہر میں آ بسے ——"

"اپنی اپنی پسند ہی ہے نا — میں تو اپنی زمینوں کو چھوڑنا کبھی پسند نہ کروں"

"چھوڑی ہم نے بھی تھوڑی ہیں — بس خود ہی اُکھڑ آئے ہیں شہر"

"اور سنائیں ماماجی۔ مامی کا کیا حال ہے۔ بھائی کیسے ہیں بہنوں کا کیا حال ہے"

"سب ٹھیک۔ چلو نا مامی کو مل لو چل کر —"

"پھر کسی دن آؤں گا"

"آج کیا ہے"

"پتہ نہیں یہاں کتنی دیر لگے"

"جب فارغ ہو جاؤ۔ تو آجانا۔ شہر تو آتے ہی رہتے ہو کبھی کبھار مل لیا کرو — تو کیا حرج ہے"

"ہرج تو کوئی بھی نہیں — ویسے آپ لوگوں نے تو گاؤں بالکل ہی آنا جانا چھوڑ دیا۔ خوشی میں شامل ہوتے ہیں نہ غمی میں"

"بس — مصروفیت ہی رہتی ہے یہاں"

دونوں لوگوں کے جھرمٹوں سے قدرے پیچھے ہٹ کر برآمدے کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ چوہدری نظام دین فضل کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ لیکن جب بھی ملتا تھا سگوں کی طرح ملتا تھا۔ خلوص اور محبت کی گرمی سے اس کا دل خالی نہ ہوا تھا۔ اس نے زبردستی فضل کو گھر چل کر کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ کوٹھی نما بڑے سے مکان میں چوہدری نظام دین رہتے تھے۔

چھ بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے صرف دو کی شادی کی تھی۔ ایک لڑکے اور ایک لڑکی۔ دو بیٹے تو شہر میں بزنس کر رہے تھے۔ ایک وکیل بن گیا تھا۔ دو کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اور آخری سکول میں تھا۔ دونوں بیٹیاں سکول جاتی تھیں۔ گاؤں کا یہ گھرانہ اب بالکل شہری بن کر شہری آداب سیکھ چکا تھا۔ موٹی سی مامی بھی اب دیہاتن نہ لگتی تھی — لباس اور وضع قطع نے چوہدری رئیس کو بیگم صاحبہ بنا دیا تھا —

فضل سے سبھی بڑے تپاک سے ملے۔ کھانے کے بعد بھی سارے بیٹے بیٹیاں اس کے ساتھ بیٹھے دلچسپی سے گاؤں والوں کی باتیں سنتے رہے۔

پھر

جب سب اِدھر اُدھر ہو گئے تو مامی اس کے قریب کھسک آئی اور رازداری سے بولی "نجو کا کہیں رشتہ وشتہ تو نہیں کیا"

"ابھی تو نہیں کیا"

"کب تک کرو گے"

"بس دیکھ رہا ہوں۔ کوئی اچھا دَر مِل جائے تو —"

"تیری بات تو سکینہ کی بیٹی سے طے ہے نا"

"ہاں مامی"

"اپنی شادی کب کرے گا"

"نجو کی کر لوں تب —"

"اب تو بڑی ہو گئی ہو گی"

"ہاں"

"میری ریحانہ کی ہم عمر ہے"

"اچھا"

مامی چند لمحے چُپ رہی پھر مسکرا کر بولی "گاؤں سے شہر آکر تم سب سے ناطہ کچھ ٹوٹ سا گیا ہے"

"بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے مامی"

"جی چاہتا ہے ناطہ جوڑ ہی لیا جائے"

"ضرور مامی — آپ کی حویلی ویران پڑی ہے — گر رہی ہے۔ ہمیشہ کے لئے نہ سہی — سال میں دو ایک مہینوں کے لئے ہی آکر رہا کرو —"

"بچے کہاں مانتے ہیں۔"

فضل چپ ہو گیا۔ مامی چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی "شاہد وکیل بن گیا ہے۔"

"ہاں مامی — ماشاءاللہ۔"

"اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں"

"بسم اللہ —"

"نجو کے لئے پوچھوں — تو —"

مامی مسکرا رہی تھی۔ فضل کچھ سٹپٹا گیا —

"اپنی بیٹی ہے۔ باہر سے جو کوئی لاؤں گی۔ اپنی بیٹی کیوں نہ عیش کرے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ اور شاہد جیسا لڑکا بھی چراغ لے کر ڈھونڈیں تو نہیں ملے گا۔ بڑا سعادتمند

چہ ہے ـــــ"

فضل کچھ نہیں بولا

" سوچ لے ـــ تو پسند کرے ـــ تو ہم کسی دن آجائیں رشتہ لے کر ـــــ"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا ـــــ مامی شاہد کے متعلق بتانے لگی۔

"سب ٹھیک ہے مامی ـــ" بالآخر فضل بولا ـــــ "پر اک نڈ کی کڑی شہریوں میں آکر کیسے رہے گی۔ شاہد تو بہت زیادہ ڑھ لکھ گیا ہے ـــــ"

" دل و دماغ روشن ہوگیا ہے اس کا "

"نجو تو معمولی لکھنا پڑھنا ہی جانتی ہے۔ قرآن شریف پڑھا ہے بس "

" تو کیا ہوا ـــــ"

" جو ڑ کچھ ـــــ" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

" سوچ لے۔ ماسی رابو سے بھی صلاح کر لے۔" مامی نے ہنس ر کہا۔ "خدا بخشے تمہاری ماں سے تو میرا خاصی تھا۔ شاید اسی لئے دل کرتا ہے۔ کہ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنالوں ـــــ"

فضل چپ چاپ سوچتا رہا۔

وہ شہر سے گاؤں آتے ہوئے بھی سوچتا رہا۔ مامی کا گھر ٹھاٹھ ٹھ دیکھ لیا تھا۔ کچہری میں شاہد کے نام کا چرچا بھی سنا تھا۔ شاہد سے مل کر بھی خوشی ہوئی تھی۔ خوبصورت جوان تھا۔ بہت پڑھا لکھا ی تھا۔ گاؤں میں اراضی بھی تھی۔

لیکن
بار بار اسے یہی سوچ پریشان کر رہی تھی۔ کہ گاؤں کی الٹر لڑکی اس ماحول میں جچ بھی سکے گی۔

شام گھر گھر آ رہی تھی۔ جب وہ پنڈ پہنچا۔ آسمان کا مغربی گوشہ ڈوبتے سورج کی سرخی لئے روشن روشن تھا۔ باقی ہر طرف دھندلاہٹ پھیل رہی تھیں ——

نجو صحن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ جیلاں نے آج کھوہ پر کپڑے دھوئے تھے۔ سوکھے کپڑے گٹھری میں باندھ کر لائی تھی —— جارو شلغم اور ساگ اٹھائے تھی۔ بکو اور جیراں برآمدے میں چولھے کے پاس بیٹھے تھے۔ ہانڈی پک گئی تھی۔ اور باسمتی کے خوشبودار چاولوں کو جیراں دم دے رہی تھی۔

فضل اندر آیا

"سلام ویر جی" نجو نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ باقی سب نے بھی سلام کیا۔

فضل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سب کے سلام کا جواب دیا۔

"ویڑے میں کیوں بیٹھی ہو۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے" فضل نے نجو سے کہا۔

"اتنی ٹھنڈ تھوڑی ہے ویر ——"

"ماسی کہاں ہے"

"اندر"

"ٹھیک ٹھاک ہے نا — ڈر ہی لگتا رہتا ہے۔ کسی دن چل ہی نہ پڑے" فضل نے ہنس کر کہا اور پھر نجو کو ساتھ لے کر دالان میں آگیا۔ نجو کے لئے آج وہ پھر شہر سے بہت ساری چیزیں لایا تھا۔ ماسی کو سلام کر کے اس نے احوال پرسی کی اور چیزیں نجو کو دے دیں۔

چیزیں لے کر نجو بہت خوش ہوئی "ویر جی تم تو ایسی ایسی چیزیں لا کر مجھے بالکل شہری بنا دو گے —"

فضل نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا اور شفقت بھرے لہجے میں بولا "شہری بننا پسند ہے تجھے — ؟"

نجو نے ایک دم نفی میں گردن ہلا دی۔ "مجھے تو اپنا پنڈ ہی پسند ہے ویر جی — یہیں پیدا ہوئی ہوں — ملی بڑھی ہوں — یہیں مروں گی —"

فضل چپ ہو گیا۔ نجو چیزیں اٹھا کر جیراں اور جارو کو دکھانے لے گئی۔ فضل تذبذب میں پڑ گیا۔ ماسی رلبو سے مامی کی کہی ہوئی بات کہے یا نہ کہے۔

گل پروشنے اپنی خواب گاہ میں تھی۔ رات بہت جا چکی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی ـــــ "تاج گاؤں جانے کا کہہ کر گیا تھا۔ اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گاؤں میں اس کی دشمنیاں بھی بہت تھیں۔ گل پروشنے کو اس نے بتایا تھا ـــــ علمے نے بھی گاؤں کی پوری تاریخ گل کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ پٹھانوں کی طرح ان لوگوں میں بھی دشمنی نسل در نسل چلتی تھی۔

خواب گاہ میں آنے سے پہلے اس نے علمے سے پوچھا تھا۔

"سردار بہت غصہ ور ہے گاؤں میں؟"

"ہاں ـــــ یہ تو ان کا خاندانی وصف ہے بی بی"

"اچا وصف ہے۔ بزدل لوگ کا جینا خراب ہے۔"

"ایسی دشمنی سے کچھ بنتا تو نہیں بگڑتا ہی ہے ـــــ سکھیرے ملکوں کے جانی دشمن ہیں۔ ملک سکھیروں سے بیر رکھتے ہیں۔ دونوں خاندانوں میں کئی قتل ہو چکے ہیں ـــــ کیا فائدہ ـــــ"

"فائدہ کون سوچتا ہے علمے ـــ بس خون جوش کرتا ہے۔ امارا خود یہی حال ہے۔ غصہ بہت آتا ہے۔ ام سے کوئی بے ایمانی کرے نا ـــ تو اس کو چوڑتا نیئں ہے ـــ"

"آپ کے ہاں عورتیں بھی مردوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں"

"ہاں۔ مرنے مارنے پہ آتا ہے نا۔ تو عورت مرد سب برابر ہوتا ہے"

علما مسکرانے لگا تھا ـــ

"سچ علمے جھوٹ نہیں ہے۔ دوسروں کا تو ٹھیک سے ام کیا کہے گا۔ اپنا بات کرتا ہے۔ تمارا سردار نے ام سے کبھی بے ایمانی کیا۔ تو تم دیکھے گا۔ ام اس کا کیا حشر کرتا ہے ـــ"

علما پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا تھا ـــ وہ جانتا تھا سردار اس سے بے ایمانی کر رہا ہے ـــ آج بھی اسے گاؤں جانے کا کہہ کر گیا تھا۔ لیکن دوستوں کے ساتھ مل کر پینے پلانے اور نئی لڑکی کے ساتھ وقت گزارنے کا پروگرام تھا۔ وہ گل کی باتوں سے اندر ہی اندر ڈر گیا۔

گل پروشے رات گئے تک تاج کا انتظار کرتی رہی ـــ یہ پہلی رات نہ تھی۔ اب تو اکثر وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتی تھی ـــ تاج کب آتا تھا ـــ اسے پتہ نہ چلتا تھا۔

کبھی گاؤں جانے کا کہہ کر اسے مطمئن کر دیتا تھا۔ کبھی ٹمبر مارکیٹ میں جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے دیر کا بہانہ بنا لیتا۔ کبھی کسی عزیز دوست کی بیماری جلدی نہ آنے کا سبب بن جاتی۔ کبھی کسی کے

خاندانی جھگڑے میں منصف بننے کی وجہ سے دیر ہو جاتی۔
لیکن آج وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کو بے تاب تھی۔ آخر وہ روز ہی گاؤں کیوں جانے لگا تھا۔ اگر کوئی دشمن داری تھی۔ تو اسے بھی بتانا چاہئے تھی ——
تھوڑی دیر کو وہ اونگھ گئی —— لیکن ذرا سا کھٹکا ہوا —— تو گل اُٹھ گئی —— آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تاج خواب گاہ میں آ رہا تھا۔
اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ اس نے پی رکھی ہے اور کپڑے بھی بے ترتیب سے ہیں۔ وہ یقیناً گاؤں سے نہیں آ رہا تھا۔
"سردار" وہ اُٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
تاج نے بازو سے اسے پرے ہٹایا اور خود ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔
گل کی انا مجروح ہوئی —— دل میں ابال سا اٹھا۔ لیکن اپنے اوپر قابو پا کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔
تھوڑی دیر بعد تاج کپڑے بدل کر آ گیا۔ وہ گل سے بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا —— وہ اک نئی گلبدن سے اتنا دل بہلا کے آیا تھا۔ کہ گل جیسی باسی شے کی اسے ضرورت تھی نہ پرواہ ——
لیکن گل نے تو آج اس کے انتظار میں اتنا وقت ہی اسی لئے کاٹا تھا۔ کہ اس سے دیر سے آنے کا سبب پوچھے گی۔
تاج بستر میں گھس گیا —— گل اس پر جھک کر بولی "کدر

یا تا "

"رات بہت گزر چکی ہے چپکے سے سو جاؤ" تاج نے اس کی
رف رخ موڑ کر کہا۔

لیکن اک جھٹکے سے گل نے اس کا رخ اپنی طرف کر لیا" سردار
م سے سیدھا سیدھا بات کرو ——"

"کیا بات کروں"

"کدر گیا تا۔ اتنی رات ہو گیا"

"جدھر میری مرضی تھی گیا تھا۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی"
د نشے اور غصے میں چلایا۔

اک لمحہ کو گل ٹھٹک گئی —— اس کے اندر چھبن سے شیشے
یسا نازک دل ٹوٹ گیا۔

"ام کو پوچھنے کا حق بھی نہیں ہے" گل کی آنکھوں میں اندرونی
رب سے دھند پھیل گئی۔

"نہیں ——"

"کیوں ام تمارا بیوی ہے"

"بیوی ہے —— بیوی ہے —— ہونھ —— تمہیں میں
نے خریدا ہوا ہے۔ تم اپنی حد ہی میں رہا کرو —— میں چاہوں تو تمہیں
آج ہی دفع کر دوں —— ہر وقت اعصاب پہ سوار رہتی ہے
کم بخت ——"

اس نے تکیے میں منہ گھسا کر لحاف اوپر تان لیا۔

گل پر وشے تو بت کی مانند ساکت ہو گئی —— یہ تاج تھا ماس

کا محبوب — اس کا شوہر — اس کی زندگی — اس کی تمنّا
کی آرزو —

اس کا دماغ چکرانے لگا —

پھر

جیسے ان باتوں کا یقین نہ آیا — آہستگی سے رنگین ریشمی لحا
کا کونہ کھینچا اور اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے
لجاجت سے بولی "سردار۔ اتنا غصّہ کیوں کرتا ہے —"

تاج نے اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا —

گل کی نیلگوں آنکھوں میں اندھیرے گھل گئے — وہ اسے تک
رہ گئی —

تاج نے منہ پھر لحاف میں چھپالیا — اور سونے کی کوشش
کرنے لگا۔

گل کو ساری رات نیند نہ آئی — اپنے پلنگ پر چت لیٹی و
آنکھیں کھولے چھت کو تکتی رہی — اس کے اندر جوار بھاٹا اُٹھ
رہی تھی۔ طوفان ہلچل مچا رہے تھے۔ قیامت کی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی
وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔

اس کی زندگی کا آفتاب دکھ کے اندھیروں میں طلوع ہوا تھا۔
غربت اور افلاس سایہ فگن تھے۔ ماں باپ کے پیار کی چاشنی بھی
اسے یاد نہ تھی۔ اس نے تو جب ہوش سنبھالا تھا۔ جبر و تشدد ہی سے
واسطہ پڑا تھا۔ اس کے اندر اک حساس گل پرو شے تھی۔ جو گلوں
کی طرح نرم و نازک اور شگفتہ تھی۔ وہ پیار و محبت کی پتلی تھی۔ اور

خلوص محبت اور پیار کی متمنی تھی - جور و تشدد سہتے ہوئے بھی اندر کی گل پروشے اک خوبصورت حسین اور پر آسائش زندگی کے خواب دیکھتی تھی - یہ خواب اک زندہ حقیقت کی طرح اس کے اندر کی گل پروشے سمیٹتی رہی — یہ خواب پورے نہ ہوتے تو بھی یہ گل پروشے انہیں چھین لیتی - اس معاملے میں وہ ہر مرحلے سے گزرنے کو تیار تھی — جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی - یہ طلب بھی بڑھتی پھیلتی گئی — اس کی ضد اور اکڑ اسی طلب کا ردعمل تھی -

لیکن

خوش قسمتی سے کوئی مرحلہ پیش نہ آیا - وہ کسی حادثے سے دوچار نہ ہوئی - اندر کی اُبلتی کھولتی انتقامی کارروائیوں کو روپذیر ہونے کا موقعہ نہ ملا -

اور

تاج نے اسے خرید لیا -

اس کے سینے حقیقت میں ڈھل گئے — اس نے وہ پا لیا - جو اس کے اندر کی عورت شدت سے چاہتی تھی — اور نہ پانے کی صورت میں قیامت ڈھانے پر آمادہ تھی - اس نے جو کچھ پایا تھا - اپنا حق اور اپنا حصہ سمجھتی تھی - اس حق اور حصے سے دستبردار ہونا یا اس میں کمی بیشی کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا -

لیکن

آج

آج

تاج نے اس کے اندر کی دنیا تہس نہس کر دی تھی۔ اس غصیلی اور کینہ ور اور انتقامی عورت کو للکارا تھا — جو سب کچھ پا کر اطمینان سے بیٹھی تھی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی۔

غصے سے پھنکارتی رہی

اور تاج کے راہِ راست پر نہ آنے کی صورت میں انتقامی منصوبے بناتی رہی۔

وہ تو خاصی نفسیاتی مریضہ تھی۔

صبح تاج کے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہ اُٹھ گئی۔ نہا دھو کر لباس تبدیل کیا — اپنی ساری خوبصورتی کو جیسے مجتمع کرنے کی کوشش کی —

حسین وہ کم تو نہ تھی — اس پر جذبات انگیز لباس اور خوبصورتی — سنورا ہوا چہرہ ناشتے کے لئے وہ سراپا قیامت بن کر بیٹھی تھی۔

شاید

تاج کو دام میں الجھائے رکھنے کا یہ آخری حربہ تھا۔ جو وہ استعمال کر سکتی تھی۔

تاج گاؤن پہن کر آیا اور کرسی پر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھنے کی تکلیف تک گوارہ نہ کی

گل کی انا پر چوٹ پڑی۔

لیکن
اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے مسکرائی اور سردار کو ناشتہ کر لینے کی
دعوت دی۔
ناشتے کے دوران بھی تاج نے ملائمت اور شفقت کا رویہ نہ
اپنایا ——
گل اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگی۔

"ماسی رابو"

"ہاں بیٹے"

"تجھ سے ایک بات کہنی ہے"

"کہو میرے لال — کیا کہنا ہے"

"کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ آج خیال آیا کہ تجھ سے ہی مشورہ کرلوں"

"کہہ تو سہی"

"بات کچھ دل لگتی ہے اور نہیں بھی لگتی — خیر —

"کہہ تو سہی —"

فضل نے مامی کی کہی ہوئی بات ماسی رابو سے کہہ دی۔ وہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوگئی۔

فضل اس کے قریب ہی چارپائی پر دالان میں بیٹھا تھا۔ وہ حقہ گڑگڑا رہی تھی۔ بجو رسوئی گھر میں تھی۔ آج اس نے نیاز دلوانی

تھی۔ جارو جیلاں اور رقیہ بھی وہیں تھیں ـــــ سب مل کر کھیر پکا رہی تھیں ـــــ دودھ کی فراوانی تھی۔ چار پانچ بھینسیں تھیں ایک کا دودھ تو باقاعدگی سے نجو مسجد بھیجا کرتی تھی۔ باقی گھر پر ہی استعمال ہوتا تھا ـــــ دہی اور لسی کی بھی کھپت تھی۔ اور گھی بھی بنایا جاتا تھا۔

لڑکیاں کام میں مصروف تھیں۔ فضل نے موقعہ غنیمت جانا تھا۔ اور ماسی رابو سے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اب وہ اس کی رائے کا منتظر تھا۔ لیکن وہ تو چپ ہی تھی۔

"ماسی"

"ہوں"

"کیا خیال ہے تیرا ـــــ"

اس نے یونہی سر ہلایا اور حقے کے کئی کش لے کر بولی "ہے تو اپنا ہی خون گوشت"

"وہ تو ہے"

"لیکن وہ لوگ شہر جا بسے ہیں"

"اور بڑے ٹھاٹھ کے شہری بن گئے ہیں ـــــ پڑھ لکھ کر ان کے طور طریقے ہم لوگوں جیسے تو نہیں رہے نا ماسی ـــــ"

"یہی گل میں کہنے والی تھی ـــــ"

"سوچنے کی بھی یہی بات ہے۔ ہم لوگ ٹھہرے اکھڑ قسم کے دیہاتی ـــــ طور طریقے سے آزاد ـــــ"

"ہاں ہمارے اپنے ہی طور طریقے ہیں ـــــ"

"نجو تو بالکل ہی آزاد پنچھی ہے"

"اسے شہر کے پنجرے میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح سوچنا پڑے گا ——"

"یہ تو ہے ——"

ماسی رابو نے نفی میں سر ہلایا —— پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی

"اچھا ابھی تو چپ رہ —— سوچ لیتے ہیں۔ بات وارہ کھائے گی۔ تو پیغام بھیج دیں گے انہیں —— نہیں تو چپ ہی رہیں گے ——"

"اچھا ماسی ——"

"اچھا"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا —— بیٹھک میں اس کے انتظار میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ نئی فصل کی بوائی کا معاملہ تھا ——

صحن میں آیا تو رسوئی گھر پر نظر پڑی "کیا ہو رہا ہے نجو ——" وہ ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"کھیر پکا رہی ہوں"

"واہ وا ——"

"نیاز دلوانی ہے ——"

"اک تو تیری منتیں مرادیں ختم نہیں ہوتیں۔ کبھی نیاز دلوا رہی ہے۔ کبھی درگاہ پہ دیئے جلانے جا رہی ہے ——"

"ابھی تو تجھے پتہ ہی نہیں ہے ویر۔ کہ مَیں نے کتنی کتنی منتیں مانی ہوئی ہیں۔" وہ بھائی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

"وہ کس بات کی مانی ہوئی ہیں" فضل جان بوجھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ جانتا تھا۔ کہ نجو کی منتیں ہیر پھر کر اسی کی ذات سے متعلق ہوں گی۔

نجو اِتراکر بولی "مانی ہوئی ہیں۔ اب پوری کرے گا ہی آخر ——"

"سنوں تو میں بھی۔ کس کس بات کی مانی ہیں منتیں۔ میری پگلی پگلی بہن نے"

"اپنے ویر کے سوہنے سہریلوں کی —— اپنی چندا ورگی بھابی کی ——"

فضل کھلکھلا کر ہنس پڑا

نجو نے روٹھنے کے انداز میں منہ بنایا ——

فضل ہنسے گیا۔ تو وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بولی "ہنسنے کی کیا بات ہے"

"یہ کہ ——" فضل اس کے قریب آکر اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا "سوہنے سہرے تو ٹھیک ہے ——"

"اور غلط کیا ہے"

"چندا ورگی بھابی کہاں سے آئے گی"

"کیوں"

"ارے تیری بھابی تو ہے کالی کلوٹی بیگاں۔ کیا بیگاں کو بھابی بنانے کا ارادہ نہیں۔ کوئی چاند سی کڑی ڈھونڈلی ہے میرے لئے"

"اے ہے ہے ——" نجو ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی "بیگاں کا مقابلہ کوئی کر سکتی ہے —— سات پنڈوں میں بھی اس ورگی

کڑی نہیں ہے کوئی "

" او ہو ہو ـــ یہ بات ہے ـــ"

"ہاں "

" ہر لحاظ سے اچھی ہو گی -- پر کالی کلوٹی ہے وہ ـــ گوری تو نہیں ہے نا ـــ"

" ہائے ۔ ایسی بانکی ہے ـــ اس کی چھب کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے ۔ تازی کنک ایسا دمکتا رنگ ہے اس کا "

"سچی "

" آں جیسے جانتے نہیں ـــ"

"کیسا جانوں ـــ"

" ہٹو جی ـــ بڑے آئے ـــ "

بہن بھائی پیار بھری چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے ۔ کہ رتو کی ماں آگئی ۔ اونچی لانبی موٹی تازی جٹی تھی وہ ـــ کالا تہمند ۔ نیلا کرتہ اور کالی چادر اوڑھ رکھی تھی ۔

" سلام چاچی " فضل بولا ۔

" وعلیکم السلام " وہ خوش دِلی سے بولی ۔ فضل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نجو کے سلام کا جواب دیا ۔

نجو نے دیکھا اس کے ساتھ راجو کی ماں اور پھپھی صاحباں بھی تھیں ۔ فضل نے سب کو سلام کیا ۔ عورتوں کے آجانے پر وہ گھر سے باہر نکل گیا ۔

نجو کا دل بے اختیارانہ دھڑکنے لگا ۔ وہ سر پر چادر ڈالتے ہوئے

رسوئی گھر سے نکل آئی ـــــ راجو کی ماں اور پھپھی کو سلام کیا۔ دونوں نے اس کے خوبصورت سراپا پر نگاہ ڈالی ـــــ

اس کے سر پر باری باری ہاتھ پھیر کر دونوں نے دعا دی۔

"ماسی رالو کہاں ہے" رتو کی ماں نے پوچھا۔

"دالان میں" نجو نے کہا۔

"آؤ بھین" رتو کی ماں دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ نجو چپ چاپ کھڑی تھی اور رسوئی کے دروازے میں سے تینوں لڑکیاں جھانک جھانک کر آنے والیوں کو تک رہی تھیں۔

رتو کی ماں دالان کی طرف بڑھی۔ اس کے پیچھے راجو کی ماں اور صاصبان بھی اندر گئیں۔ فضل کی اتنی بڑی بڑی حویلی کے وسیع و عریض صحن اور گرد اگرد بنے پکے کمرے ـــــ کمروں کے سامنے باغیچہ اور پھیلے ہوئے درخت۔ گھر کی آن بان ان سب چیزوں سے چھلکتی تھی راجو کی ماں اور صاصبان خاصی مرعوب اور کچھ کچھ سہمی ہوئی لگ رہی تھیں ـــــ

وہ اندر چلی گئیں ـــ نجو چادر کا کونا انگلی پر لپیٹے ہوئے مسکرائی اور مورنی کی سی چال چلتی رسوئی گھر کی طرف چل دی۔

"تاجے ـــ تو اپنی حرکتوں سے باز آجا ـــ میں نے چاچے اور
ویروں کو اشارہ بھی کر دیا نا۔ تو تیری ہڈی بوٹی ایک کر دیں گے۔"
تاج کھلکھلا کر ہنس دیا ـــ

آج اس نے پھر بیگاں کا راستہ روکا تھا۔ بیگاں واڑے سے
اپنی بھوری کو دیکھ کر آ رہی تھی۔ بھوری کل رات سے کچھ بیمار تھی۔
رمضان بابا نے اسے گڑ اور خالص گھی پلایا تھا۔ اب وہ قدرے
ٹھیک تھی۔ بیگاں کی تو یہ بہت پیاری بھینس تھی ـــ وہ کتنی
دیر سے اس کو پیار کرتی رہی تھی۔ تھپتھپایا تھا ـــ گلے میں بانہیں
ڈال کر جھول گئی تھی۔

اب وہ فراماں فراماں گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ
میں سلور کا کٹورہ تھا۔ جس میں رمضان بابا کے لئے گندلوں کا ساگ
لے کر آئی تھی۔

کھیتوں کے درمیان درمیان بنی پگڈنڈیوں پر چلتے وہ بھوری

کے متعلق سوچ رہی تھی ۔ پچھلے دنوں اس کی سہیلی کی بھینس مرگئی تھی۔ آج اگر اس کی بھوری کو بھی کچھ ہوجاتا ۔۔۔ تو ۔۔۔

بھوری تو اسے جہیز میں ملنا تھی۔ اس کے چاچے نے تو سونے کا ٹلکا بھی بھوری کے ماتھے پر سجانے کے لئے بنوا چھوڑا تھا۔ گوٹے والی چادر ڈال کر بھوری کو جہیز میں دینا تھا۔

پگڈنڈیاں ختم ہوگئیں۔ تو وہ پرانے قبرستان سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف جارہی تھی۔ کہ سامنے سے نسواری اور سفید گھوڑی پر سوار تاج آتا نظر آیا۔

بیگاں اس سے ڈرتی تو نہیں تھی۔ لیکن خوامخواہ ٹاکرا ہونے سے کتراتے ہوئے اس نے اپنا رستہ بدل لیا۔ وہ واپس مڑی۔ اور دائیں ہاتھ کے بڑے میدان سے ہوکر گھر جانا چاہا۔

تاج اس کا عندیہ جان گیا۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی ۔۔۔ اور گھوم کر اس کے پھر سامنے آگیا ۔۔۔

اب چارہ نہیں تھا سوائے اس کہ وہ رک جائے۔

تاج مسکراتا ہوا گھوڑی سے اترا ۔۔۔

"کدھر جارہے ہو جی ۔۔۔" وہ بولا ۔۔۔

بیگاں نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر تند لہجے میں کہا "تُو بار بار میری راہ میں کیوں آرہا ہے ۔۔۔"

"میں تو نہیں آرہا ۔۔۔ قسمت لارہی ہے ۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"تو اچھی طرح جانتا ہے میں کون ہوں"۔ بیگاں کی آنکھوں سے

شعلے سے نکل رہے تھے۔

"ہاں جانتا ہوں — تو سارے پنڈوں کی سب سے زیادہ بانجھی چھبیلی نار ہے ——"

"تاجے — بکواس بند کر ——"

وہ ہنس کر بولا "غصے میں تو اور بھی سوہنی لگتی ہو ——"

"تیری موت تجھے للکار رہی ہے"

"اوئے موت سے کون ڈرتا ہے پگلیئے — تیری خاطر مرنا بھی پڑے۔ تو کوئی بات نہیں ——"

"تاجے ——"

"سوہنیے"

بیگاں نے غصّے سے ہاتھ میں پکڑا ہوا کٹورہ تاج کو کھینچ مارا۔ وہ دائیں ہاتھ جھک کر وار بچا گیا۔ اور اسی بات پر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

بیگاں شعلہ جوالا بنی کھڑی تھی۔ دانت پیستے ہوئے اسے خونی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ نہ پتہ نہیں کس ڈھیٹ مٹی کا بنا تھا۔ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ بیگاں نے اسے کوسنا شروع کر دیا۔

"بس بس ——" وہ مسکراتے ہوئے بولا "اس منہ سے تو پیار کے پھول جھڑنے چاہئیں — گالیاں سجتی نہیں ہے ——"

"تنگ آکر بیگاں نے چاچے اور ویروں کی دھمکی دے ڈالی ——

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ——

پھر بولا —— "آج ملک فضل کا ڈراوا نہیں دیا بیگاں"

بیگاں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ بزدل ملک —— ہا ہا ہا —— " بڑے تمسخر سے تاج ہنسا تو بیگاں پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولی " میں نہیں چاہتی تھی بات ملک فضل تک پہنچے۔ لیکن پتہ چلتا ہے۔ تیرے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں ——"

"واہ وا ——"

"میں ملک فضل کی منگ ہوں۔ بچپن کی منگ ——"

"دشمن کے ہاتھ سے ہی تو —— کا مزہ آئے گا ——" وہ ہنس کر بولا ——

"یہ بات ہے"

"بالکل"

"تو پھر تیار رہنا ——"

"ڈرتا کون ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لئے تو میں ہر رکاوٹ سے ٹکرا جاؤں گا۔ ملک فضل کیا چیز ہے سوہنیو ——"

"تجھے پتہ چل جائے گا وہ کیا چیز ہے۔ غیرت مند جب اپنی آبرو پر آنچ آتے دیکھیں تو قیامت بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں سمجھے ——"

"سمجھ گیا ——"

"بس پھر تیار رہنا"

"تو بھی تیار رہ بیگاں ——"

"منگ تو بے شک فضلے کی ہے۔ لیکن حاصل تو تجھے میں ہی کروں گا ——"

"کتیا —— کمینیا —— میں نہیں چاہتی تھی —— کہ پنڈوں میں خون خرابہ ہو —— اور پرانی دشمنیاں نئے روپ میں پھر سے جاگ پڑیں۔ پر —— تیری موت تجھے پکار رہی ہے ——"

"دیکھیں گے کس کی موت کسے پکارتی ہے —— جو بھی ہو دیکھا جائے گا —— پر تیرے لئے تاج سکھیرا سب کچھ کر گزرے گا ——"

بیگاں کی برداشت جواب دینے لگی —— وہ خونخوار شیرنی کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے گالیاں بکنے لگی۔ اچانک ہی پچھلے کھیتوں میں کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔

بیگاں نے پلٹ کر دیکھا —— کچھ عورتیں کالے تہمندوں نیلے کرتوں اور کالی چادروں میں ملبوس سروں پر گاگریں اٹھائے آپس میں باتیں کرتی چلی آ رہی تھیں —— ان کے ساتھ بچے بھی تھے —— اس لئے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں ——

بیگاں نے گردن گھما کر تاجے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر جانے کو تیار تھا۔

"بزدل"

بیگاں نے اک قہقہہ لگایا ——

تاج گھوڑی دوڑاتے دوسری طرف چلا گیا۔

"وَے فضل"
"جی چاچی"
"ہم اس دن تیرے گھر گئے تھے"
"ہاں چاچی"
"رابو نے بات کی تھی"
"ہاں"
"پھر"

فضل نے کوئی جواب نہ دیا صرف سر اثبات اور نفی کے بین بین ہلا دیا۔ وہ اس وقت چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کھیتوں میں کافی ہلچل تھی۔ نورا تھوڑی دور بیٹھا ٹوکے سے پٹھے کاٹ رہا تھا۔ بھینسوں کے لئے پٹھا کاٹ کاٹ کر اس نے ڈھیر لگا دیا تھا۔ اس سے پرلی طرف شیشم کے درختوں کے قریب بیلنا چل رہا تھا جہاں گنا پیڑا جا رہا تھا۔ اس دفعہ فضل کا گنا بھی بہت ہوا تھا۔

گڑ بنانے میں کافی فائدہ تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ ایک بیلنا اور خرید لے۔

وہ چارپائی پر بیٹھا ابھی ابھی بیلنے کے متعلق ہی مہر سے باتیں کر رہا تھا۔ مہر نے بھی اسے یہی رائے دی تھی۔ مہر حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ پھر وہ حقہ لے کر نورے کے پاس چلا گیا تھا۔

فضل اٹھنے ہی کو تھا — کہ رتو کی اماں اپنی سہیلیوں سے ادھر آگئی۔ وہ فضل کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

آج دن بیحد نکھرا ہوا تھا۔ پیلی پیلی دھوپ چاروں طرف سنہرا پھیلا رہی تھی۔ دھوپ بدن میں تازگی اور نکھار بھر رہی تھی۔ کہر آلود صبح سے جسم ٹھٹھرے ہوئے جو تھے۔

رتو کی ماں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد قدرے رازداری سے بات شروع کی تھی۔

"منڈا تو بڑا ہی چنگا ہے" وہ فضل کی گومگو حالت دیکھ کر بولی "ہاں دولت دنیا کے لحاظ سے تیری برابری کا نہیں۔"

"ہوں" فضل نے صرف اسی قدر کہا۔

"شرافت ماں بیٹوں کی مانی ہوئی ہے۔ شکل وصورت میں اس کا جواب نہیں گاؤں کے سارے جوانوں میں سے زیادہ جیالا گھبرو ہے۔"

فضل مسکرا کر بولا "چاچی — کیا رشوت لی ہے ان سے"

"تیرا ستیاناس" اس نے پیار سے فضل کے سر پہ ہاتھ مارا۔ "میں تو حق کی بات کر رہی ہوں — لوگ اچھے ہیں — راجو کا دادا

تو اس پنڈ کا معتبر بندہ تھا۔ بس خدا بچائے ـــــ ایسی انہونی سر پر آن پڑی۔ کہ زر رہا نہ زمین ـــــ"

"ہاں چاچی ـــــ"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں نا ـــ پنڈ والوں سے کون سی گل چھپی ہے۔ یہ لوگ یونہی برباد ہوئے"

"ہوں"

"فضلے"

"جی"

"اک میری بات پلّے باندھ لو"

"کیا چاچی"

"دولت پر گھمنڈ نہیں کرنا ـــــ"

"میں کب کرتا ہوں چاچی ـــــ اپنا بھی تو وہی حال ہوا ہے۔ جو راجو کا۔ سکھیروں سے دشمنی میں ہمارے پلّے بھی کیا رہا ہے ـــــ"

"اللہ جانے ہم پنڈ کے لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ دشمنیوں میں خاک ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی نہیں سمجھتے ـــــ"

"بالکل ـــــ اب میں نے تو سکھیروں کی دشمنی رب دی قسمے دِل سے بالکل نکال دی ہے ـــــ پر وہ لوگ ـــــ"

"وہ لوگ بھی اب دشمنی سے تنگ آ چکے ہیں ـــــ"

"تاجے میں ذرا تڑنگ ہے"

"ہاں ـــــ باقی بڑے دونوں بھائی تو بہت سادھے ہیں۔

لڑائی جھگڑے سے پناہ ہی مانگتے ہیں ——"

"تاجا جو ہے" فضل نے تاجے کو دبی زبان میں گالی دی۔

"وہ تو سدا شہر ہی رہتا ہے۔ سُنا ہے بدمعاشیاں کرتا پھرتا ہے"

"ہاں چاچی —— اس کے یاروں میں چوٹی کے غنڈے بھی شامل ہیں۔ انگریز افسروں سے بھی دوستی بنا رکھی ہے۔ بس، من مانی کرتا پھرتا ہے ——"

"جہنم میں ڈالو اسے —— ہاں تو سناؤ پھر کیا سوچا ہے راجو کے متعلق"

"ابھی کچھ بھی نہیں ——"

"کیوں"

"بس —— فیصلہ نہیں کر سکا —— دراصل کچھ اور لوگ بھی پوچھے رہے ہیں ——"

"مجھے پتہ ہے سب —— وہ چکرالے کا چوہدری غلام محمد بھی آیا تھا نا اپنے بیٹے کے لیے"

"ہاں"

"اور شاہ پور کے چھٹوں کے دو لڑکوں کا بھی رشتہ آیا ہے۔ منیرے کی ماں نے بھی پوچھا ہے —— اور اکبرے کی بھابی نے بھی"

"تو تجھے سب پتہ ہے چاچی"

"کیوں نہیں۔ میں کوئی غیر ہوں ——"

"کون بتاتا ہے تجھے ——"

"بس یہ کیوں بتاؤں"

"رتو اور نجو سہیلیاں ہیں نا"

"بس سمجھ جا پھر ——"

"ایک اور رشتے کا تو تجھے پتہ ہی نہیں چلا"

"کس کا ——"

"چوہدری نظام دین کے لڑکے شاہد کا"

"کون نظام دین"

"ماما نظام دین۔ جو شہر چلا گیا ہے۔ اس کا لڑکا وکیل بن گیا ہے۔ مامی نے بہت زور لگایا —— نجو کا رشتہ شاہد کے لئے لینے آنا چاہتی ہے ——"

رتو کی ماں چند لمحے کو چپ ہو گئی۔

فضل بولا —— "چاچی ایک طرف مامے نظام دین نے پوچھا ہے۔ اور دوسری طرف تو راجو کے رشتے کے لئے کہہ رہی ہے۔ جو مامے نظام دین کی زمینوں پر واہی کرتا ہے ——"

"ہوں" رتو کی اماں نے صرف اسی قدر کہا۔

"باقی سب رشتے تو ایک طرف۔ ان دو رشتوں کی وجہ سے سوچوں میں پڑ گیا ہوں"

"بات سوچنے والی تو ہے —— پر ——"

"پر کیا ——"

گاؤں کی کڑی۔ شہر کے اتنے پڑھے لکھے لڑکے کے ساتھ

صحیح گزارہ کر سکے گی ؟"

"یہ بھی سوچنے کی بات ضرور ہے"

"گل سُن فضلے ——"

"سنا چاچی"

"تو پنڈ میں اکیلا ہے۔ تیرا نہ ماما نہ چاچا نہ بھائی —— کوئی بھی نہیں ——"

"ہاں"

"نجو کو شہر بیاہ دے گا تو وہ شہر ہی کی ہو جائے گی"

"ہاں"

"پھر پنڈ میں اکیلا ہی رہ جائے گا۔ شہر کے لوگ پنڈوں میں آنا پسند نہیں کرتے۔ اب نظام دین کے خاندان ہی کو دیکھ لے کوئی پلٹ کر آیا ہے کبھی ——"

"ٹھیک کہتی ہے تو چاچی ——"

"پھر نجو ——"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ فضل نے گردن موڑ کر چاچی کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔

سمجھ تو اسی دن گیا تھا۔ جس دن ماسی رابو نے بتایا تھا۔ کہ راجو کے لئے اس کی ماں پھپھی اور رتو کی ماں آئی ہیں —— ان کے رشتہ پوچھنے کی جرات کے پس پردہ ضرور کسی کی تحریک تھی۔ پھر رتو کی ماں کا ساتھ آنا۔ کڑی سے کڑی مل گئی تھی —— اور اسے محسوس ہوا تھا۔ کہ ضرور نجو اور راجو میں چاہت کا رشتہ استوار ہو گیا ہے۔

وہ سوچوں میں اسی لئے اُلجھ گیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ مامی اور ماما سے متاثر ہوا تھا۔ سلجھا ہوا پڑھا لکھا شاہد بھی اسے بہت پسند آیا تھا۔ شہری زندگی کی آسائشیں بھی نجو کے لئے پانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

لیکن

راجو کا رشتہ آنے سے وہ سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ سمجھ نہ پاتا تھا۔ کہ کیا کرے۔

آج چاچی کی باتوں نے بھی یقین دلا دیا تھا۔ کہ راجو اور نجو میں کوئی نسبت ضرور ہے ـــــ وہ چپ ہو گیا۔

چاچی اٹھتے اٹھتے بولی "پُترا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ـــــ تو اکیلا ہے راجو تیرا بازو بن سکتا ہے۔ دولت آنی جانی شے ہے۔ راجو کے دادا کے پاس نہ رہی ـــــ تیرے باپ کے ہاتھوں سے کتنی نکل گئی ـــــ اس کا کیا ہے۔ اصل چیز تو شرافت ہے بہادری ہے چاہت ہے"

"ہاں چاچی" وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جلدی کی ضرورت نہیں اچھی طرح سوچ کر ہی فیصلہ کرنا"

"اچھا چاچی ـــــ جو رب کو منظور ہوگا ـــــ ہو جائیگا"

"نجو کا تو بھائی نہیں باپ بھی ہے ـــــ"

"وہ مجھے بہت پیاری ہے چاچی ـــــ"

"وہ تجھ پر جان دیتی ہے۔ مجھے پتہ ہے۔ تیرے ہر فیصلے پر وہ سر جھکا دے گی۔ کبھی ہونٹ پر سے ہونٹ بھی نہ اُٹھائے گی۔

تیری آن پر ہنسی خوشی قربان ہو جائے گی، پر پُترا — تو بھی —
اس کی آنکھوں میں اس کی خوشیاں پڑھ لینا —"

چاچی ایک دم مڑی اور سامنے چل دی جہاں راجاں کھیت کی منڈیر پر بیٹھی اپنے چھ ماہ کے بچے کو چھاتی سے لگائے دُودھ پلا رہی تھی۔

فضل پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مہر چلم بھر کر لے آیا تھا۔ دونوں گنے اور بیلنے کی باتیں کرنے لگے۔

رتو نے شاہد کے رشتے والی بات نجو کو بتائی ۔ تو وہ جیسے سکتے میں آگئی ۔ پوری آنکھیں کھولے رتو کو تکے گئی ۔

" میری اماں نے تو بھا فضل کو یہی سمجھایا ہے ۔ کہ پنڈ پنڈ ہے شہر شہر ـــــ یہاں کی کڑیاں وہاں خوش نہیں رہ سکتیں ۔ "

نجو کچھ نہ بولی ـــــ اس کے کانوں میں فضل کے الفاظ گونج رہے تھے " شہری بننا پسند ہے تجھے ؟ "

وہ اسی دن شہر سے اس کے لئے بہت سی چیزیں لایا تھا ۔ بڑا خوش بھی تھا ـــــ مامی کے ہاں جو ہو کر آیا تھا ۔

رتو نے نجو کا کندھا پکڑ کر ہلایا ۔ وہ اس کے قریب ہی تو رنگین پلنگ پر بیٹھی تھی ۔ چھابے میں مونگ پھلی اخروٹ اور مکئی کے بھنے ہوئے دانے رکھے تھے ۔ دونوں مزے سے کھا رہی تھیں ۔ کہ اچانک رتو نے شاہد کے رشتے والی بات جو اس نے اپنی ماں سے سنی تھی اسے بتا دی ۔

رتو نجو کو یوں بت بنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ جلدی سے اسے کندھا پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ کر ساتھ لپٹا لیا۔

"نجو میری بھین ——"

"ہائے اللہ —— تیری بات شاہد کے ساتھ طے تھوڑا ہی ہو گئی ہے ——"

"میں خود بھا فضل کو بتا دوں گی —— تو کیوں فکر کرتی ہے"

"نجو —— خدا کے واسطے —— اتنا تو نہ گھبرا ——"

رتو نجو کو تسلیاں دینے لگی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا۔ کہ نجو کو بات بتا کر جو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس کا مداوا کیونکر کرے۔

نجو کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنی سرخ چھینٹ کی چادر کا کونہ مروڑتی رہی۔

"میں چلتی ہوں" پھر وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہے" رتو بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی جھانجریں بج اُٹھیں۔ سراج اس کے لئے آج ہی جھانجریں لایا تھا۔

نجو اب قدرے سنبھل چکی تھی۔ بولی "رتو جھانجروں کی مبارک ہو"

رتو کو قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ اس نے مبارک کا جواب دینے کی بجائے پوچھا

"کہاں جا رہی ہے"

"گھر"

"کیا کرے گی"
"کرنے کو کئی کام ہیں"
"ماسی رابو سے تو کچھ نہ کہے گی"
"کیا مطلب؟"
"یہی کہ میں نے تجھے بات بتا دی ہے"
"اچھا ہی کیا جو بتا دیا ——"
"تو —— کیا کرے گی اب"
"پتہ نہیں"
"بھا فضل کو میں کہہ دوں"
"نہیں"
"ہائے پاگلے۔ اسے کیا پتہ کہ تو راجو سے پیار کرتی ہے"
"تو اس کو یہ بات بتائے گی؟"
"اشارہ تو کر دوں گی"
"نہیں"
"کیوں"
"مجھے اپنی ویر کی خوشیوں کے سامنے اپنی کسی خوشی کی پروا نہیں ——"
"نجو ——"
"سچ کہتی ہوں۔ اگر اسے میرا رشتہ شہر میں کر کے خوشی ہوتی ہے۔ تو میں سر جھکا دوں گی —— اس کی خوشیاں ——"
پاگلے —— جھلے —— "تو نے اس کی بات ادھوری

رہنے دی۔ اور اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھور ڈالا ـــــ "
اسے شاید سے رشتہ کر کے کیا خوشیاں مل سکتی ہیں ـــــ "
وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر آہستگی سے سر اٹھا کر بولی "راجو
غریب ہے رتو ـــــ شاید میرے ویر کی پگ کا اونچا شملہ
اس کے ساتھ بہن کا رشتہ کرنے سے نیچا ہو جائے ـــــ "
"ہائے اللہ ـــــ "
"میں اپنے ویر کی عزت پر کبھی حرف نہ آنے دوں گی ـــــ "
"راجو مر جائے گا نجو ـــــ تو جانتی نہیں تجھے وہ کتنا پیار
کرتا ہے ـــــ "
وہ بڑی سنجیدگی سے بولی " جی شاید میں بھی نہ کر سکوں
رتو ـــــ "

اس کا جی بھر آیا۔ بڑی بڑی فسوں ساز آنکھیں دھندلا گئیں
اور وہ اپنا بازو آنکھوں پر رکھ کر تیزی سے رتو کے دالان سے
نکل گئی۔

چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھتی وہ اپنے گھر آئی۔ تو بکو سامنے
ہی کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے بی بی " اس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں" وہ دالان میں چلی گئی۔
جیراں اور جیلاں رسوئی گھر میں تھیں۔ بکو نے انہیں بتایا تو
وہ لپک کر آئیں۔ نجو اپنے پلنگ پر اوندھی پڑی تھی۔
" ماں صدقے کیوں " جیراں نے جلدی سے اس پر جھک

کر پوچھا ——

"نجو —— کیا ہوا کیوں رو رہی ہے" جیلاں نے اس کا چہرہ اونچا کرنا چاہا — ماسی رابو بھی اپنی لاٹھی ٹیکتی اندر آگئی۔

"کیا ہوا۔ مجھے بھی تو بتاؤ کچھ" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"نجو روتی ہوئی آئی ہے۔ اور پلنگ پر پڑ کر رو رہی ہے" جیلاں بولی۔

"ہائے مرجاواں ——" ماسی رابو اس کے پاس بیٹھ گئی "میری لاڈو کی آنکھوں میں آنسو کیوں آئے۔ کسی نے کچھ کہدیا۔ تُو تو رتو کے گھر گئی تھی لڑائی ہوگئی سکھی سے۔ بتانا ——"

نجو آنکھیں پونچھتے اُٹھ بیٹھی —— "ماسی کچھ بھی نہیں ہوا ——"

"تو رو کیوں رہی ہے" وہ بولی

"کبھی کبھی رو لیا جائے تو کیا ہرج ہے" نجو ہنس پڑی

"ہائے ہائے۔ تم نے تو میرا کلیجہ ہلا دیا تھا نجو ——" جیراں نے کہا جیلاں کن انکھیوں سے نجو کو دیکھ کر اشاروں میں بات پوچھنے لگی۔

نجو نے وقتی طور پر تو ماسی رابو کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ کہ سکھیوں سے ان بن ہو گئی تھی

لیکن

فضل کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے چہرے سے دُکھ درد کی کیفیت کے آثار

نہ مٹا سکی۔ اک مہیب سی خاموشی اس کے سراپا پر چھائی تھی۔ فضل کی نظروں سے یہ سب کچھ کیسے چھپ سکتا تھا۔

شام وہ کھیتوں سے واپس آیا۔ تو ماسی رابو نے اسے بتایا ــــ

"نجو کی سکھیوں سے ان بن ہو گئی تھی۔ پاگل لڑکی گھر آکر روتی رہی"

فضل کے سینے میں جیسے تیر سا چبھ گیا۔ نجو کو اپنے بازو کی لپیٹ میں لے کر بولا "کیا بات ہوئی تھی"

"کچھ نہیں" نجو ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"تو روئی کیوں تھی۔ رانے ــــ" فضل پوچھنے پر بضد تھا۔

"ایسے ہی ویر جی ــــ روئی تھی ــــ تو کیا ہوا ــــ ہر وقت ہنستے ہی تو نہیں رہنا چاہئے" وہ بجھی بجھی آواز میں بولی۔

"جب تک میں زندہ ہوں نا نجو۔ تجھے ہنستے ہی رہنا پڑے گا ــــ" اس نے تھپکا۔

"ویر جی ــــ" وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر بولی۔

"اب کبھی نہیں روؤں گی۔ کچھ بھی ہو جائے نہیں روؤں گی ــــ"

نجو کے الفاظ سے فضل اچانک چونکا۔ نجو کو کندھے سے ہٹا کر چند لمحے اس کا چہرہ تکتا رہا ــــ وہ بھیگی پلکیں جھکائے بیحد اداس نظر آرہی تھی۔ فضل بہت کچھ سمجھ گیا۔

آہستگی سے بولا "میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں خوشیوں کی چمک دیکھنے کا آرزومند ہوں نجو ــــ"

پھر

اسی رات جب رتو کے گھر کی بیرونی بیٹھک میں لوگ بیٹھے

گپ شپ لگا رہے تھے۔ اور سیف الملوک کے خوبصورت بول جامو چٹھہ اپنی سُریلی آواز میں آلاپ رہا تھا ـــ فضل چپکے سے اُٹھ کر اندر گیا ـــ رتو کو بلایا ـــ اور ساری بات اس سے اگلوالی۔

رتو نے ڈرے ڈرے سہمے سہمے ڈھکے چھپے لفظوں میں نجو کی پسند فضل کو بتادی۔

وہ چند لمحے چُپ رہا پھر آہستگی سے بولا "رتو بھین۔ نجو کو بتادینا کہ اُس کی خوشیاں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

"سچ بھا فضل"

"ہاں رتو"

"شکر ہے رب کا"

"راجو اچھا لڑکا ہے ـــ اُس کے پاس زمین نہ سہی شرافت تو ہے ـــ وہ گھبرو جوان ہے ـــ جیالا ہے۔ پھر میں بھی تو اکیلا ہوں۔ وہ بھی اکیلا ہے ـــ ہم دونوں ایک دوسرے کے بازو بنیں گے ـــ"

"بھا فضل ـــ"

رتو خوشی سے جیسے پاگل ہوگئی ـــ

رات کافی ہوگئی تھی ـــ اور ابر آلود آسمان سے کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی ـــ ہوا بھی ٹھنڈی تھی ـــ

لیکن وہ اتنی بڑی خبر کو کیسے صبح تک سہار لیتی ۔ اماں کی
گرم چادر کی بُکل اچھی طرح ماری ـــــ اور دوڑتی ہوئی بجو کے گھر
کی طرف چل دی

نشے میں دھت اک البیلی حسینہ کو بازو کی لپیٹ میں لئے۔ تاج گاڑی سے اترا — اس کے دوستوں نے یہ نوخیز کلی اسے بازارِ حسن سے لاکر دی تھی۔ دولت مند آدمی کو بازارِ حسن میں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ پیسے کے قدموں میں تو پورا بازارِ حسن سرنگوں ہوسکتا تھا۔ عورت اور شراب تاج کی کمزوری بن چکے تھے۔ اس کے مفاد پرست دوستوں نے اسے ایسی لت ڈال دی تھی۔ زمینیں سونا اُگل رہی تھیں اور لکڑی کا کاروبار چمک رہا تھا —

گل پروشنے گھر پہ تھی۔ ڈرائینگ روم میں آتشدان میں لکڑیوں پر نظریں جمائے سوچوں میں گم تھی۔ اس کے ذہن پر ان دنوں پریشان کن بوجھ تھا۔ اس کی جنت جس کی وہ متوالی تھی اُجڑ رہی تھی۔ تاج اب اس سے بالکل بیگانہ ہو چکا تھا۔ دونوں کے بیڈ روم بھی اب الگ تھے۔ وہ اس گھر میں کسی

فالتو اور ناکارہ شے کی طرح پڑی تھی۔

جنت جب تک خیالی جنت تھی، گل پروشے کے جذبات اتنے شدید نہ تھے۔ لیکن جنت پاکر اس میں کچھ عرصہ گزار کر اس کی لذتوں سے آشنا ہو کر اس کی آسائشوں میں ڈوب کر اس سے بچھڑ جانا کسی قیامت کے رونما ہونے سے کم نہ تھا — قیامت۔ تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن جب یہ قیامت جذبات کی دنیا میں بپا ہو۔ تو پھر اس کے مہلک اثرات کا اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

گاڑی کی آواز پر گل پروشے چونکی — کرسی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ ڈریسنگ قالین پر چلتی کھڑکی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ پردہ ذرا سا سرکایا — اور باہر دیکھنے لگی۔

تاج کے ساتھ نوجوان خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کا سارا بدن کانپ کانپ گیا۔

تاج اسے لے کر کوریڈور سے ہوتا اپنے بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

گل پروشے کھڑکی سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی — چند لمحے اپنے ہاتھ غصے کے عالم میں مروڑتی رہی

پھر

اسے جتنی گالیاں پشتو اور اردو میں آتی تھیں تاج کو نکالنے لگی۔ اس پر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ تو مشتعل ہو کر ڈرائینگ روم سے نکلی کوریڈور میں تیزی سے چلتی تاج کے بیڈروم کی

طرف آئی ۔

دروازہ بند نہیں تھا — لڑکی ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی — اور تاج قریبی صوفے پر نیم دراز لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا ۔

" ادھر آجاؤ میری جان —" اس نے بازو پھیلا دئے — اس کی آنکھوں میں جیسے خون کی سرخی تھی ۔ چہرہ تمتما رہا تھا ۔ اور بہکا جا رہا تھا ۔ لڑکی نے اک ادائے ناز سے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا — پھر بولی " میں ذرا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی —"

" پسند ہے "

" بہت زیادہ "

" کہو تو ہمیشہ کے لئے تمہیں یہاں رکھ لوں —"

" سچی ؟ "

" بالکل "

" آپ بہت مالدار ہیں ؟ "

" ہاں ۔ جتنا چاہو تم پر لٹا سکتا ہوں "

" میری خوش نصیبی ہے سرکار —"

" آجاؤ اب ادھر —"

تاج نے پھر بازو پھیلا دئے — لڑکی فراماں فراماں اس کی طرف بڑھی

لیکن

اس کی آغوش میں ہمہ سپردگی بن کر گرنے سے پہلے ہی وہ گل پروشے کے شکنجے میں تھی۔ گل پروشے نے اس کے بالوں میں مٹھی بھر رکھی تھی اور جھٹکے سے اسے سیدھا کر کے اس کا منہ اپنی طرف پھیر لیا تھا۔

وہ اس وقت اک خونخوار شیرنی بنی ہوئی تھی۔

لڑکی اس اچانک وار سے اس طرح بوکھلائی ـــ کہ بال نوچے جانے کی اذیت پر بلبلا بھی نہ سکی ـــ حیران ہو کر گل پروشے کو دیکھا۔

"کون ہے تم" گل پروشے گرجی۔

لڑکی پھٹی پھٹی نظروں سے گل پروشے کو دیکھا۔

گل پروشے نے اک گندی سی گالی دے کر اسے جھنجوڑ کر دھکا دیا۔ وہ صوفے کے کنارے سے ٹکرا کر گری۔ گل نے ایک لات جمائی۔

لیکن

دوسرے لمحے تاج صوفے سے اٹھ کر گل پروشے تک پہنچ کر دھاڑا "ذلیل۔ کمینی ـــ کتیا ـــــ"

"سردار" گل پروشے اس سے زیادہ بلند آواز میں چیخی۔ "بکواس بند کرو" سردار نے ایک زوردار تھپڑ گل کے منہ پر مارا۔ گل کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھ کر ساکت نظروں سے تاج کو دیکھا ـــ آج پہلی بار اس نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب تو صرف بک بک ہی ہوتی تھی۔ مار کھانے کی نوبت نہ آئی تھی۔

گل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی ——

تاج کے ساتھ آنے والی لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاج کے رویے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا ——

"یہ جنگلی چیز کہاں سے لائے ہو سرکار ——" اس نے تاج سے کہا۔

تاج مشتعل پہلے ہی تھا اس بات سے بھڑک گیا۔ گل پروشے کے ایک لات رسید کی۔ وہ قالین پر گری۔ تاج نے اس کے اُٹھنے سے پہلے ہی دوسری لات جمائی اور پھر وہ اسے لاتوں سے ٹھڈوں سے مارتا ہی چلا گیا۔ گل پروشے قالین پر اِدھر سے اُدھر لڑھکتی رہی ——

دوسری لڑکی مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر تاج سے کہنے لگی "بس کرو سرکار بہت ہو گیا ——"

اس نے زبردستی تاج کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ تاج کے منہ سے غصّے سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت کوئی بھی اسلحہ نما چیز ہوتی تو وہ گل کو قتل کر دیتا۔ وہ خونخوار نظروں سے گل کو دیکھتے ہوئے بولا "کم بخت نے زندگی حرام کر دی ہے"

"یہ کون ہے ——" لڑکی ادائے ناز سے بولی۔

"ہے اک چڑیل" تاج نے بیزاری اور تنفر سے کہا۔ لڑکی اس کے کندھے پر بازو ٹکائے ہوئے ادائے دلبری سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرائی۔

گل اب تک ششدر تھی۔ لاتوں اور ٹھڈوں کی بوچھاڑ اس نے وجود کو پلا گئی تھی۔ لیکن اس کا تو جیسے ذہن ہی ماؤف ہو چکا تھا۔ محسوس کرنے کی قوت ہی کسی نے سلب کر لی تھی۔

وہ قالین پر پڑی ٹکڑ ٹکڑ تاج کو تکے جا رہی تھی۔

لیکن

اس کے اندر ایسی خاموشی نہیں تھی۔

زلزلے آندھیاں طوفان تخریبی عناصر ہیں۔ جب یہ بپا ہوں تو سب کچھ تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ گل کے جذبات کی دنیا میں یہ تخریبی عناصر پوری قوت پوری طاقت اور پوری شدت سے بپا ہو رہے تھے۔

اک بازاری عورت کے سامنے شوہر کے ہاتھوں اتنی ذلت اُٹھانے والی گل کے اندر نفرتوں اور محبتوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ بڑی تیزی سے محبتیں مغلوب ہو کر نفرتوں کے پیکر میں ڈھل رہی تھیں۔

"دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے" سردار نے غصے سے کہا۔

"اچا" گل اک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئندہ کبھی ایسی حرکت کی تو جان سے مار ڈالوں گا"

"ٹیک ہے"

اس کے لہجے پر تاج کے پہلو میں بیٹھی لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ ہے کون سرکار ——"

"ام اس کا بیوی ہے" تاج سے پہلے ہی گل پروشے نے سنگین لہجے میں کہا۔

اب لڑکی ششدر سی ہوگئی - اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا - جلدی سے کھسک کر پرے ہوگئی -

"بکواس بند کرو" تاج غصّے سے پھر دھاڑا ——

"انکار کرتا ہے۔ کیا ام تمارا بیوی نیئں ہے" گل نے زوردار لہجے میں پوچھا۔

"بیوی" وہ تمسخر سے پھنکارا

"ہاں"

"چلی جاؤ یہاں سے ورنہ اس طرح مرمت کروں گا - کہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی ——"

"نہیں نہیں سرکار" لڑکی گھبرا کر بولی۔

"تم نہیں جانتیں —— لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں سدھرتے" تاج بولا ——

"ام یہ بے عزتی بھولے گا نہیں ——" پھر گل بولی

"جا جا —— نہ بھول ——" وہ بولا۔

"تاج ——"

"جاتی ہو یا اٹھوں پھر ——"

"نہیں نہیں" لڑکی نے تاج کو بازو سے پکڑ لیا —— پھر گل پروشے سے بولی "تم ہی چلی جاؤ —— دیکھتی نہیں سرکار کتنے غصّے میں ہیں"

"کتے کا بچی — تم چُپ رہ — ام میاں بیوی جو دل چاہے بولے گا" گل بھوکی شیرنی کی طرح غرائی۔

تاج بازو چھڑا کر کھڑا ہوا — انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا "نکل جا کمرے سے — میرے غصّے کو مت آزما — زیادہ تنگ کیا تو گھر سے اسی وقت باہر نکال دوں گا۔ تو مجھے جانتی نہیں — میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

"کیا کرے گا" گل دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر تنکی۔

"تیری بوٹی بوٹی اُڑا دوں گا — تجھے اغوا کروا دوں گا — بیچ دوں گا۔ بتا کیا کرے گی میرا —"

"ام گل پروشے ہے — گل پروشے — گل پروشے نے سینے پر ہاتھ مارا "پہاڑوں کا بیٹی۔ پتھروں کا پالا ہوا ہے۔ کج کر کے دیکھو ذرا —"

"ہوں — تیری یہ مجال — کل ہی دیکھ تجھے باندھ کر تیرے پچھلوں کے پاس واپس نہ بھجوا دیا تو —"

گل کو ایک دم چکر سا آگیا — آنکھوں کے سامنے سایے لہرا گئے — سارا غصہ ہرن ہو گیا

"تیرا خان بابا تجھے بار بار بیچے گا — کل ہی تجھے واپس چھوڑ آؤں گا —" تاج نے کہا۔

گل اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی "ام کو اُدر مت بھیجو سردار۔ ام اِدر رہے گا۔ جیسا تم کہے گا کرے گا — ام کو مت بھیجو — ام نئیں جائے گا"

نخوت سے تاج نے گل کو ٹھڈا مارا ـــــ "اب آئی سیدھی راہ پر ـــــ دھونس یوں جماتی ہے ـــــ جیسے نوابزادی ہے ـــــ دو ٹکے کی چھوکری اور سکھیروں کے آڑے آئے ہو نھ ـــــ"

گل آہستہ آہستہ اٹھی۔ من میں ہلچل مچی تھی۔ لیکن صرف اک نگاہ تاج پر ڈالی۔

یہ نگاہ کیا تھی ؟

تاج جیسے آدمی کا دل کانپ گیا۔

لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے لڑکی کو جھٹکے سے گود میں گرا لیا۔

گل پروشنے منہ پھیر کر چلی گئی۔

"تیرا دل کیا کہتا ہے راجو"

"پتہ نہیں"

"پھر بھی"

"کیا بتاؤں بنجو — اپنی غریبی کا خیال آتا ہے۔ تو دل مذاق اُڑاتا ہے — نالی کی اینٹ چوبارے نہیں لگ سکتی —"

"ہوں"

"اور جب اپنے پیار کا سوچتا ہوں۔ تو دنیا کی کوئی رکاوٹ راہ میں بچھائی نہیں دیتی — آسمان گر پڑے زمین پھٹ جائے کچھ ہو جائے — میرا پیار اتنا سچا اور کھرا ہے۔ کہ اسے ناکامی ہو ہی نہیں سکتی"

"تو تو درمیان میں لٹک رہا ہے"

"اور کیا۔ بھا فضل جب تک کوئی جواب نہ دے گا۔ یہی حالت رہے گی"

"اپنی اماں کو پھر بھیج نا میرے ویر کے پاس"
"وہ تو بیچاری پہلے ہی ڈرتے ڈرتے گئی تھی"
"ماسی رابو کے پاس گئی تھی نا — میرے ویر سے اس نے خود تو بات نہیں کی ——"
"بات تو ایک ہی ہوئی۔ رشتہ تو لے کر گئی تھی ——"
"ہوں"
"ماسی رابو نے بھا فضل سے بات تو کی ہوگی ——"
"ہاں — ضرور کی ہوگی"
"تو بھی تو گھر میں رہتی ہے۔ کیا خیال ہے تیرا — میرا مان رہ سکے گا"
"اوں ہوں"
"کیا؟"
"مجھے تو ذرا سی بھی اُمید نہیں ——"
"کس بات کی"
"کہ میرا ویر تیرا رشتہ مان لے گا"
"نجو"
"بھئی سچی بات کہتی ہوں"
"نجو — تمہیں اس بات کا یقین ہے"
"ہاں ——"
"تو — تو مجھے ——"
"کیا"

"تُو تو بڑی خوش باش نظر آرہی ہے"
"تو کیا کروں"
"مجھے ـــ کوئی فکر نہیں ـــ"
"فکر"
"ہاں"
"کیوں"
"بھا فضل نے یہ رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو ـــ"
"تو کیا ـــ تو جانتا ہے مجھے اپنے ویر سے جتنا پیار ہے۔
میں اس کی مرضی کے سامنے آواز اٹھا سکتی ہوں بھلا ـــ"
"نجو ـــ"
"سوچنے کی بات ہے تا راجو ـــ"
"نجو ـــ تجھے صرف ـــ اپنے ویر ہی سے پیار تو نہیں۔
مجھ سے ـــ"
"تجھ سے بھی اتنا پیار ہے۔ کہ ـــ"
کہ کیا ـــ"
"کہ تیرے بغیر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی ـــ"
"پھر ـــ پھر تو نے کیا سوچا ہے"
"سوچا تو بہت کچھ ہے"
"مجھے بھی بتانا ـــ"
"ابھی ضرورت نہیں"
"کیوں ضرورت نہیں ـــ"

"اچھا سُن — کیا سوچا ہے میں نے"

"سنا"

"اگر ویر نے ہمارا جوڑ باندھنے سے انکار کر دیا نا — تو —"

"تو ——"

"تو میں اپنی ریشمی چنری لے آؤں گی — اسے پھاڑ پھاڑ کر سا بٹ لیں گے۔ پھر اسی بوہڑ کی کسی شاخ سے ریشمی رسّے کا پھندہ بنا کر دونوں ساتھ ساتھ لٹک جائیں گے"

"نجو ——"

"کیوں — ایسا نہیں کر سکتے"

"تو کیسی باتیں کرتی ہے ——"

"جو سوچی ہیں ——"

"حرام موت مرنے کا کیوں سوچتی ہے"

"اچھا"

"ہاں"

"تو پھر یوں کریں گے — پنڈ سے دونوں بھاگ جائیں گے ——"

"نجو"

اس دفعہ راجو اتنے زور سے چیخا کہ نجو ڈر گئی۔ لیکن دوسرے لمحے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور

پھر

ہنستی چلی گئی — راجو اسے دیکھتا رہا — جب اس کی ہنسی بالکل ہی بے قابو ہوگئی — تو اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "پاگل تو نہیں ہوگئی"

"ہوگئی ہوں — ہوگئی ہوں راجو ہوگئی ہوں" وہ ہنستے ہوئے بولی ۔ زیادہ ہنسنے سے پانی بہنے لگا تھا۔

راجو بیچارہ کچھ بھی تو سمجھ نہ پایا — اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ خوبصورت فسوں ساز سیاہ آنکھوں میں اُداسی اور کرب کی کیفیت تھی — وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹے جا رہا تھا۔

نجو نے اپنے آپ پر بمشکل قابو پایا۔ اپنے کندھے پر رکھے جوگے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "تو کیوں نہیں ہنستا میرے ساتھ"

"نجو مجھے ایسی بھول بھلیوں میں ڈال دیا ہے ۔ تو نے ۔ کہ ہنس تو رو بھی نہیں سکتا —"

"پگلیا —"

نجو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے کندھے آزاد کراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی "ہمارے ازل کے میل جول ہیں راجو — ہمیں کوئی جُدا نہیں کر سکتا — یہ میرا ایمان ہے —"

"لیکن —"

"لیکن ویکن کچھ نہیں ـــ میرے ویرنے ـــ میرے ویرنے ـــ"

"کیا نجو کیا ؟"

نجو اک لمحے کو ہچکچائی ۔ پھر اپنی حسین آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بڑے جادوئی انداز میں مسکراتے ہوئے بولی " ویرنے تیرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے راجو ـــ"

راجو گنگ سا رہ گیا ـــ نجو نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے اس کے ہاتھ اٹھائے اور سر جھکا کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے ۔

"نجو ـــ" فرط مسرت سے وہ چیخ اُٹھا ـــ "کیا یہ ہے یہ ـــ"

نجو نے آہستہ آہستہ اپنا سر اثبات میں ہلایا ـــ

"نجو ـــ میری نجو ـــ" بے اختیار ہو کر راجو نے نجو کو بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا ـــ وہ دیوانگی کے عالم میں اسے اپنی چوڑی چھاتی سے بھینچ کر چلایا "جھوٹ تو نہیں کہہ رہی نا ـــ"

"نہیں ـــ" وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی ۔

"ربا ـــ تیرا شکر کیسے ادا کروں" بے اختیارانہ راجو کے لبوں سے نکلا ـــ "تو نے میرے سچے پیار کی لاج رکھ لی ـــ"

راجو کے جذبوں کی شدت اور ان کی انتہا سے نجو اتنی متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے

بیگاں نے لسّی کا خالی گڈوا کھوہ پر جا کر دھویا۔ مکھن والا چینی کا پیالہ اور ساگ والا کٹورہ بھی قریب رکھا ـــــ کٹورے میں تھوڑا سا ساگ تھا۔ مکھن بھی چھٹانک بھر پیالے میں پڑا تھا اس نے مکھن ساگ پر رکھا اور کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بارہ تیرہ سالہ لڑکے کو آواز دی۔

"وے کالو ـــــ"

"ہاں بھین"

"لے یہ ساگ اور مکھن ہے۔"

"لاؤ بھین لاؤ"

کالو نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر ساگ مکھن لے لیا۔ وہ اس گاؤں کا یتیم لڑکا تھا ـــــ اب وہ کھیتوں پر جہاں کام ملتا کر لیتا۔ اور روٹی کپڑا بھی انہی چوہدریوں کی طفیل پورا ہو جاتا تھا۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ سردی کی شام بڑی جلدی اُتر آتی ہے۔ بیگاں برتن خالی کر کے جلدی گھر جانا چاہ رہی تھی۔ آج اس کی بے بے اور چاچا گھر پہ نہیں تھے۔ وہ کسی دوسرے پنڈ دور پار کے رشتہ داروں کی شادی میں شریک ہونے گئے ہوئے تھے۔ تینوں بھائیوں نے رات کھیتوں پہ ہی رہنا تھا — ان دنوں گڑ بنانے کا زور تھا۔ وہ یہ کام اپنی نگرانی میں کروا رہے تھے۔ ان کے تین تین بیلنے تھے بیک وقت چلتے تھے۔ اور منوں گڑ تیار ہو رہا تھا۔

فضلاں آج گھر پہ اکیلی تھی۔ اس لئے بیگاں شام اترنے سے پہلے ہی گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

بیگاں نے پیالہ اور کٹورہ بھی مٹی سے مانجھ کر دھویا — کالو روکھا ساگ اور مکھن مزے لے لے کر کھا گیا۔ بیگاں نے برتن دھو کر دستر خوان کھولا۔ اور اس میں برتن باندھ دئے۔

"کدھر جانا ہے بھین — گھر یا واڑے ——" کالو نے پوچھا۔

"کیوں"

"برتن میں اٹھا کر چھوڑ آتا ہوں"

"نہیں کالو — یہ میں لے جاؤں گی — تو ایسے کر واڑے چلا جا اور ہمارے رمضان بابا سے کہہ دے دودھ وہی گھر چھوڑ جائے"

"اچھا جی"

کالو اُٹھ کر پگڈنڈی پگڈنڈی واڑے کی طرف چلدیا۔ بیگاں برتن سر پر رکھ کر گھر کی طرف ہولی۔ کھیتوں کے کنارے کنارے چلتی گھر جا رہی تھی۔ راستے میں کئی عورتیں ملیں۔ گاؤں کے مرد بھی آتے جاتے نظر آئے۔ کھیتوں میں بھی اِکا دکا لوگ تھے۔ سارا دن ہل چلانے کے بعد بیلوں کو کھول کر چارہ ڈال رہے تھے۔ کہیں کہیں الاؤ ابھی سے جل رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے کسان حقے تازہ کر کے آگ کے ارد گرد آ بیٹھے تھے۔

وہ اپنی راہ چل رہی تھی۔ سیدھا راستہ اس نے دانستہ چھوڑ کر بیلے والا رستہ پکڑ لیا۔ آج فضل نہر پار گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کے مالٹے کے باغ تھے — ان دنوں درخت نیلام کر رہا تھا —— اس کا واپسی کا رستہ یہی تھا۔ بیگاں کے دِل میں پیا کی لگن تھی۔ شاید ٹکراؤ ہو ہی جائے۔ وہ اُدھر آ گئی تھی۔ دودھ بھی اسی لئے لینے نہیں گئی تھی۔

لگن سچی ہو۔ تو منزلیں خود بخود قدموں میں آ جاتی ہیں۔ فضل کی گھوڑی کے سموں کی مخصوص ٹخ ٹخ بیگاں پہچان گئی۔ خوشی سے چہرے پر گلابی رنگ دوڑ گیا — اس نے قدموں کی رفتار سُست کر دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد فضل اس کے سامنے تھا۔ اس نے لگامیں کھینچ کر گھوڑی کو روکا —— اور پھر کود کر نیچے اتر آیا۔ بیگاں کو یوں اچانک دیکھ لینے کی خوشی سے وہ بہک سا گیا۔

باگ پکڑے پکڑے وہ بیگاں کے قریب آ گیا۔ سر تا پا اس پر

پیار بھری نگاہ ڈالی اور شوخی سے بولا "تو بیگاں ہی ہے نا ——"

"بیگاں نہیں تو اور کون ہوں ——" ابرو کھینچ کر بیگاں بولی۔

"میں سمجھا اس ویرانے میں کوئی چڑیل پھر رہی ہے" وہ چھیڑنے لگا۔

"اچھا جی ——" بیگاں نے مصنوعی غصّے کا مظاہرہ کیا اور وہ واپس ہونے کو پلٹی ——

فضل نے اس کا راستہ روک لیا "اوئے ہوئے اتنا غصّہ اچھا نہیں ہوتا ——"

"چل ہٹ"

"بس بس —— سوہنیو۔ آؤ تھوڑی دیر باتیں ہی کرلیں ——"

"میں نہیں کرتی"

"تو نہ کریں کردں گا"

"اپنے آپ سے کرے گا"

"نہیں۔ اک کالی کلوٹی سے"

"دیکھ فضل"

"ہاں"

"مجھے کالی کلوٹی نہ کہا کر"

"ہے ہی تو کیوں نہ کہوں"

"اچھی بات ہے۔ جا پھر اپنے لئے کوئی گوری چٹی کڑی

ڈھونڈ لے"

"صلاح تو اچھی دی ہے تُو نے"

وہ ہنس پڑا اور بیگاں تھوڑا تھوڑا روٹھ ہی گئی۔ فضل نے گھوڑی کی باگ چھوڑ دی اور بیگاں کو منانے لگا ـــــ بیگاں ناز و ادا دکھانے لگی۔

دونوں بیحد خوش تھے۔ اور جب بیگاں مان گئی اور دونوں اک ٹوٹی پھوٹی مٹی کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ تو فضل بولا "آج ادھر سے کیوں گھر جا رہی تھی ـــــ"

"کیا ہوا گھر ہی جانا تھا۔ ادھر سے نہ گئی ادھر سے چلی گئی۔"

"یہ راستہ ویران ہے۔ آئندہ ادھر سے نہ جایا کرنا"

"میں تو تیرے لئے ادھر آئی تھی فضلے۔ مجھے پتہ تھا تو باغوں سے اسی راستے واپس آتا ہے ـــــ"

"اچھا۔ اب سمجھا ـــ پر بیگاں پھر ادھر سے ایسے وقت میں نہ آنا کبھی"

"کیوں۔ میں کوئی چھوٹی بچی ہوں۔ جو ڈر جاؤں گی ـــ اپنا ہی پنڈ ہے ـــ ڈرنا کس بات سے"

کبھی کبھی بڑوں کی بات بلا چون وچراں مان بھی لیا کرتے ہیں"

"اچھا بابا اچھا ـــــ اب ادھر سے کبھی نہ جایا کروں گی ـــــ"

"شاباش"

دونوں باتیں کرنے لگے۔ فضل نے بیگاں کو بتایا۔ کہ مالٹوں کے باغوں نے اس دفعہ بہت منافع دیا ہے۔ بولی بہت اچھی لگی ہے۔

بیگاں خوش ہو گئی — جلدی سے بولی "نجو کے بیاہ کے لئے
اب تو تیرے پاس بہت پیسہ ہو گیا ہے نا"
"صرف نجو کے بیاہ کے لئے"
"اور کس کے لئے"
"تیرے لئے نہیں —"
"میری تو بعد کی بات ہے"
"ہوں — بیگاں"
"ہاں"
"ایک بات پوچھوں"
"پوچھو"
"تجھے بُرا تو نہیں لگتا"
"کس بات کا"
"میں جو کہتا ہوں۔ پہلے نجو کی شادی کروں گا۔ پھر اپنی"
"اس میں بُرا ماننے والی بات ہے کوئی؟"
"تو بتا نا —"
"کبھی کبھی لگتا ہے" وہ چند لمحے رُک کر بولی۔
"کیوں"
"میرا دل کرتا ہے۔ میں اور نجو کچھ دیر ساتھ ساتھ تو رہیں۔
نجو تیری بہن ہی نہیں فضلے میری بھی بہن ہے سکھی ہے —
تیری طرح مجھے بھی وہ بہت پیاری ہے"
"او جیو بیگاں"

فضل اس کی باتوں سے بیحد خوش نظر آنے لگا تھا۔
"کب کرے گا نجو کی شادی" بیگاں نے پوچھا
"کیوں۔ بہت جلدی ہے تجھے اپنی"
"ہٹ وے۔ سیدھی بات ہی نہیں کرتا۔ مجھے کیوں جلدی ہو گی ——"
"نجو کے بعد جو تیری باری آئے گی"
"پھر وہی۔ میں خفا ہو جاؤں گی فضلے"
"نہ نہ —— نہ —— ایسا ظلم نہ کرنا ——"
فضل نے اپنے مضبوط ہاتھ سے بیگاں کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"وہ تیری مامی اک شہر میں رہتی ہے۔ سنا ہے اس نے بھی اپنے بیٹے کے لئے پوچھا ہے"
"تجھے کس نے بتایا"
"بے بے کو ماسی رابو نے بتایا تھا ——"
"ہوں"
"پھر کیا خیال ہے۔ کہاں کرے گا"
"راجو ہے اپنے پنڈ کا ایک گبھرو —— بڑا محنتی بڑا ایماندار۔ اور سارے پنڈ میں اس جیسا سوہنا بھی کوئی نہیں ——"
"تجھ سے بھی سوہنا ہے" بیگاں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر وہ شرما بھی گئی۔ فضل کے چوڑے چکلے سینے میں

دل لوٹ پوٹ گیا اس ادا پر —

کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ راجو کے متعلق بیگاں کچھ کچھ جانتی تھی — خود پیار کرتی تھی اس لئے پیار کرنے والوں کے جذبوں سے آشنا تھی۔ اسے خوشی ہوئی۔ کہ فضل نے راجو کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ پنڈ کے دوسرے چوہدریوں کی طرح اس نے اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

فضل ابھی آدھ فرلانگ ہی گیا تھا۔ کہ اسے بیگاں کے چاچے کو پیغام دینا یاد آگیا۔ بہت ضروری بات تھی ـــــ فضل نے گھوڑی کی باگیں کھینچ لیں ـــــ اور اسی راستے پر واپس لوٹا ـــــ جس پر سے ابھی بیگاں کے ساتھ مل کر آیا تھا۔

بیگاں اپنے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گاؤں کی پہلی گلی تھی جہاں اس نے مڑ جانا تھا۔

لیکن

گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ٹکراؤ تاج سے ہو گیا۔ حسب عادت اس نے بیگاں کو دیکھتے ہی آواز کسا "کدھر دوڑے جا رہے ہو سوہنیو ـــــ ہماری طرف بھی اک نگاہ ڈال لو ـــــ"

بیگاں نے اس کی آواز اَن سنی کرتے ہوئے نگاہ سیدھے راستے پر رکھی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ یہ جگہ بالکل سنسان تھی۔ گھنے اور جھکے ہوئے درختوں میں گہری شام اُلجھ گئی تھی۔ اچھا خاصہ ملگجا سا

اندھیرا پھیل رہا تھا۔ درختوں میں طیور بسیرا لے چکے تھے۔ ڈوبتے دل کی سی خاموشی چھائی تھی۔

موقعہ غنیمت جان کر تاج کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ لپک کر آیا اور بیگاں کا راستہ روک لیا۔

اب بیگاں کو رکنا ہی پڑا —— ڈرنے والی تو وہ نہیں تھی۔ پھر بھی نہیں چاہتی تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات ہو —— لوگ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ وہ اب صرف نمبردار بشیر کی بیٹی ہی نہیں فضل کی منگ بھی تھی —— دو گھرانوں کی عزت کا مسئلہ تھا ——

"تاج پکا ڈھیٹ تھا۔ جب سے بیگاں کو دیکھا تھا۔ اسے حاصل کرنے کی لگن تھی —— وہ تو بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے کہتا تھا۔ "میں جس لڑکی کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لوں —— وہ مجھ سے بچ نہیں سکتی —— پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آ گرتی ہے ——"

بیگاں کے معاملے میں اسے یہ خوش فہمی تو ضرور تھی۔ لیکن اس سے جو خطرناک نتائج نکل سکتے تھے۔ وہ ان سے بھی بے خبر نہ تھا —— ملکوں سے خاندانی دشمنی تھی۔ جسے سکھیروں نے نہیں ملک فضل نے دبا دیا تھا۔ وہ صلح جو اور آشتی پسند تھا۔ اس لئے پنڈ کی روائتوں کے خلاف اس نے اپنے باپ کا خون بھی سکھیروں کو بخش دیا تھا۔ صدیوں پرانی دشمنی میں کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ کئی سہاگ اجڑے تھے —— مقدمہ بازی میں زمینیں مٹی کے مول بکی تھیں ——

یہ بات نہیں کہ فضل بزدل تھا۔ اور وہ خون خرابے سے ڈرتا تھا وہ بہت بہادر تھا ـــــ لیکن عقل مند انسان تھا ـــــ وہ دشمنی کا بیج اکھاڑ دینا چاہتا تھا۔

تاج کے بڑے بھائی بھی آئے دن کے خون خرابے اور لوٹ مار سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی تعاون کیا تھا۔ یوں بول چال تو بیشک نہ ہوتی تھی لیکن ایک دوسرے سے خار بازی بھی نہ رہی تھی ـــــ دونوں گھرانے اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

لیکن

تاج اگلی پچھلی ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیگاں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا ـــــ سانولی سلونی کسے ہوئے بدن اور کھڑے قد والی بیگاں سے دل ہار بیٹھا تھا ـــــ دل تو وہ مہر نوجوان لڑکی سے ہار بیٹھتا تھا۔ لیکن بیگاں شاید اس کے لئے چیلنج تھی۔ اس لئے جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس سے ٹکر لے رہا تھا۔

بیگاں رک گئی ـــــ لیکن اس انداز سے رکی کہ یوں لگا زمانے کا دل رک گیا ہے۔ خشمگیں نظروں سے تاج کو دیکھا اور کڑک کر بولی "بول۔ کیا کہتا ہے"

"اوہ واہ ـــــ وا ـــــ نصیبہ جاگ گیا اپنا ـــــ" تاج اس کے تیور دیکھتے ہوئے بھی ڈھٹائی سے بولا ـــــ

"تجھے تیری موت بلا رہی ہے تاجے ـــــ"

"ہر بار یہی کہتی ہے تو ـــــ"

"ہر بار رحم آجاتا ہے تیری جوانی پر ـــــ آگ سے کھیل رہا ہے
تو تاجے ۔ یہ آگ صرف تجھے ہی نہیں تیرے پورے خاندان کو
بھسم کر ڈالے گی"

تاج نے اک قہقہہ لگایا ـــــ اور بولا "سکھیرے آگ سے
کھیل کھیل کر ہی جوان ہوتے ہیں ـــــ تو کیا ڈراتی ہے مجھے ـــــ"

"تیرا مطلب کیا ہے آخر ـــــ"

"تجھے حاصل کرنا"

"اور تو جانتا بھی ہے ۔ کہ میں تیرے وڈے دشمنوں کی بہو بننے
والی ہوں"

"اسی لئے شاید تیری طلب کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے ۔"

"دیکھ تاجے باز آجا ۔ بڑا خون خرابہ ہو جائے گا ـــــ پرانی
دشمنیاں پھر سے نئی ہو جائیں گی"

"اسی میں تو مزہ ہے ـــــ"

"بس ٹھیک ہے ـــــ تیری اجل تیرے سر پہ منڈلا رہی ہے
ملکوں کے ساتھ اب تیرا مقابلہ چھٹوں سے بھی ہو گا"

"اوہ چھٹے تو میرے سوہرے بنیں گے" جوائیوں سے کوئی
دشمنی لیتا ہے ـــــ"

تاج کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر بیگاں کا خون کھول گیا ـــــ"
تجھ سے اب فضل ہی سمجھے گا ـــــ" وہ چیخی

"ہا ہا ہا ـــــ ہا" تاجے نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا
وہ بزدل ملک ـــــ جو اپنے باپ کے خون کا بدلہ بھی نہ لے

سکا ـــ ہاہا ـــ ہا ـــــ"

"تاجے ـــــ" وہ زور سے چیخی ۔

"تاجا ہنسا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک لہرائی ـــ خون میں اُبال اٹھنے لگا۔ وہ بے تکلفی سے آگے بڑھا ـــ اور بیگاں کی کلائی پکڑ کر بولا "لے میں نے تیری باہنہ پکڑ لی ہے۔ کہہ اپنے فضلے سے ہمت ہے تو چھڑا لے ـــ اب تو فضلے کی منگ نہیں رہی میری پسند ہے ـــــ"

"کمینے کتے ـــ پرے ہٹا اپنے ناپاک ہاتھ ـــ" بیگاں نے اپنی کلائی چھڑانے کو پورے بازو کو بل دیا۔ لیکن وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "دوسرے کی منگ اُڑا لینا آسان کام نہیں ہوتا پگلیے دل گردے کا کام ہوتا ہے ـــ اور دل گردے والے جب کسی کی باہنہ پکڑ لیں تو چھوڑتے نہیں ـــــ"

"ہوں" بیگاں پھنکاری اور پھر تیزی سے تاجے کے ہاتھ پر اپنے پورے دانت ساری قوت سے گاڑ دیئے ۔

تاج بلبلایا ۔ لیکن بیگاں کی کلائی نہیں چھوڑی ۔

اور

اسی لمحے فضل اپنی سفید گھوڑی اُڑاتا ادھر آگیا۔ وہ بیگاں کو چاچے کے لئے پیغام دینے آیا تھا۔

لیکن یہاں جو کچھ دیکھا

اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔

"بیگاں" اس نے گھوڑی سے چھلانگ لگاتے ہوئے زور

سے آواز دی۔

تاجے کا ہاتھ بیگاں کی کلائی سے ایک دم چھوٹ گیا۔ بیگاں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا۔

اور پھر دوڑ کر فضل سے لپٹ گئی۔

"فضلے ـــــ یہ ـــــ یہ ہمیشہ مجھے تنگ کرتا ہے۔ میں تجھے نہیں بتاتی تھی۔ لیکن یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آج اس نے میری باہنہ پکڑ لی فضلے ـــــ باہنہ" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

فضل کی آنکھوں میں خون اتر آیا ـــــ دھکے سے بیگاں کو پرے ہٹاتے ہوئے اس نے تاج کو للکارا ـــــ "اوئے سکھیریا ـــــ"

تاج کے اوسان تو اس گرجدار للکار سے ہی خطا ہو گئے بھاگنے کی بھی نیت کی۔ لیکن اب مقابلہ آن ہی پڑا تھا ـــــ اس لئے سینہ تان کر چلایا "کرلے کیا کرنا ہے ملکا ـــــ"

"تیری یہ جرأت کہ تو فضل کی منگ کی کلائی پکڑے" فضل آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کے قدموں کی دھمک سے زمین کا دل ہل رہا تھا ـــــ وہ تاج کو مسلسل گھور رہا تھا۔

"ہاں ـــــ پکڑی ہے اس کی باہنہ ـــــ اب یہ تیری نہیں میری ہے ـــــ" تاج سینہ تان کر چلایا۔

"اوئے اپنی پلید زبان منہ کے اندر کرلے۔ گدی سے کھینچ لوں گا ـــــ پھر نام لیا اس کا تو۔

"نام ہی نہیں اس کو بھی لوں گا۔ اس کا ڈولہ میری حویلی میں آئے گا ـــــ سن لے تو بھی"

"ہوں ——" فضل بپھرا ہوا شیر تھا۔ چھلانگ لگا کر تاجے پر ٹوٹ پڑا ——

"تاج بھی جوش میں آیا ہوا تھا —— اس کی رگوں میں بھی سکھروں کا خون تھا —— پنڈ کی فضاؤں میں پلا بڑھا تھا —— میں بھی فضل سے کم نہیں تھا —— اس لئے وہ بھی پل پڑا ——

دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

فضل کی پگ سر سے اتر کر دور جا گری۔ جسے دور کر بیگاں نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا —— وہ ایک طرف کھڑی ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

فضل کے خون میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ غیرت تلملا رہی تھی۔ باپ کا خون ناحق آنکھوں میں اتر رہا تھا —— وہ تاجے کی ہڈی پسلی ایک کر رہا تھا۔ تاج بھلا اس سے مقابلہ کیسے کر پاتا۔ یوں بھی شراب پی پی کر قوت دم توڑ گئی تھی۔ عورتوں کے ناز و ادا اٹھانے والا چند مکوں اور گھونسوں کی تاب بھی نہ لا سکا۔

مار مار کے فضل نے اس کا بھرکس نکال دیا —— اس کے منہ اور آنکھوں کے قریب بھی دو ایک مکے تاج کے لگے۔ لیکن تاج کے تو چہرے دانتوں اور ٹانگوں سے خون رسنے لگا

وہ بے دم ہو کر زمین پر لوٹنے لگا۔ تو فضل نے لاتوں سے اس کو ادھ موا کر دیا ——

بڑی بڑی گالیاں دیتے ہوئے فضل نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بولا "اب کبھی آنکھ اٹھا کر اس پنڈ کی طرف دیکھا بھی تو حشر

کردوں گا ——"

تاج موقعہ غنیمت جان کر اٹھا۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے درختوں کے پیچھے چلا گیا —— فضل چاہتا تو اس کا تعاقب کر کے اسے اور بھی مزہ چکھا دیتا —— لیکن اس نے اسے جانے دیا اتنا ہی کافی تھا۔

جاتے جاتے زخمی اور نڈھال تاج نے فضل کو دھمکی دی "یاد رکھنا —— بدلہ لوں گا —— دیکھوں گا بیگاں کا ڈولہ کون لے جاتا ہے ——"

"اوئے مرجا بے غیرتا ——" فضل نے اس کی طرف تھوک دیا۔ پھر وہ بیگاں کی طرف آیا —— اور غصے سے بولا —— "تو نے آج تک مجھے بتایا کیوں نہیں تھا ——"

بیگاں ڈر کر بولی "تیرے غصے سے ڈرتی تھی ——"

"آج اس کی یہ جرأت ہو گئی۔ کہ تیری باہنہ پکڑ لی"

"فضلے ناجا بڑا کمینہ ہے"

"سمجھ لوں گا —— چل تو گھر —— میں چھوڑ آتا ہوں تجھے ——"

"چل ——" بیگاں نے پگ اسے واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔

فضل نے پگ سر پر رکھ کر شملہ اونچا کر لیا —— وہ بیگاں کو چھوڑنے گلی کے سرے تک گیا "اب چلی جائے گی نا"

"ہاں"

وہ جانے لگی "رب راکھا"

"رب راکھا" فضل نے کہا۔

لیکن اس کے قدم اٹھاتے ہی بولا ـــــ "بات سن"

"ہاں"

"اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا"

بیگاں نے آنکھیں پھیلا کر فضل کو دیکھا۔ کچھ پوچھنے کو تھی کہ وہ بولا

"میں خود ہی سمیٹ لوں گا سب کچھ ـــ تو کسی سے نہ کہنا ـــــ"

"اچھا ـــــ" وہ بولی۔

"سمجھ گئی نا" فضل نے سختی سے کہا

"ہاں" وہ ڈر گئی۔

"جا اب" فضل نے کہا "میں یہیں کھڑا ہوں"

"اب چلی جاؤں گی ـــ تو جا۔ کہیں وہ راستے میں ـــــ"

"افسوس پندرہ دن تو وہ اٹھنے سے رہا ـــ خیر ـ جا تو"

"رب راکھا"

"رب راکھا ـــــ"

فضل وہیں کھڑا رہا ـــ بیگاں گلی کی کچی نالیوں سے اُبلتے سلیٹی رنگ کے ملغوبے سے اپنے پاؤں بچاتی چلی گئی۔ راستے میں اس نے دو تین بار پلٹ کر فضل کو دیکھا۔

جب وہ گلی کی نکڑ مُڑ گئی۔ تو فضل اپنی گھوڑی کی طرف واپس آگیا۔

"چوہدری جی آپ گھوڑے سے گر کیسے گئے"

"گھوڑا اڑی کر رہا تھا علمے۔ بس اب زیادہ باتیں نہ کر — ٹکور کے لئے گرم پانی بوتل میں بھر لا —"

"اچھا چوہدری جی" علما پلنگ سے پرے ہٹتے ہوئے بولا۔ تاج کو کافی چوٹیں آئی تھیں — چہرہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نیل پڑے تھے۔ جبڑے میں زخم تھا — پسلیاں بے طرح دُکھ رہی تھیں —

وہ گاؤں حویلی جانے کی بجائے فضلے سے مار کھا کر سیدھا شہر ہی آگیا تھا۔ ڈاکٹر کھنہ کو بلا بھیجا تھا — سانس لینے میں کچھ دقت محسوس ہوتی تھی — یوں لگتا تھا اک پسلی پھیپھڑے کے اندر ٹوٹ کر جا گھسی ہے۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ پسلی ٹوٹی نہیں تھی دب کھا گئی تھی۔ اس نے دوائیاں دی تھیں۔ مالش کے لئے بھی اور

کھانے کے لئے بھی ـــــ سوزش زدہ جگہوں پر مکور کرنے کے لئے کہا تھا۔

گل پروشے بھی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ جب سے وہ آیا تھا اس کے پاس بیٹھی تھی ـــــ گو ان دنوں تاج کے لئے وہ گھر کے کونے کھدرے میں پڑی بیکار سی شے تھی۔ لیکن جس ہمدردی سے وہ اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں متاثر بھی ہو رہا تھا۔

گھر میں کسی عورت کا ہونا بیحد ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی موجودگی سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ تاج نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اب گل پروشے کو واپس سوات بھیج دینے کی دھمکی نہیں دے گا۔

علما گرم پانی کی بوتل لینے گیا۔ گل پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ کر تاج کے پاؤں دبانے لگی۔

وہ بغور اس کی ٹانگوں پر پڑے نیل کے نشان دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو" تاج نے پوچھا

"تمارا ٹانگ بھی نیلا ہو گیا ہے"

"ہاں۔ سخت تکلیف ہے"

"تم گھوڑا کی سواری نہیں جانتا۔ تو بیٹھا کیوں تھا"

"چپ رہو"

"اچا سردار۔ تمارا طبیعت خراب ہے ام نہیں بولے گا"

وہ آہستہ آہستہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔

علما پانی کی بوتل لے آیا۔

"ادھر رکھ۔ میری پسلیوں کے پیچھے" وہ کروٹ کے بل ہو کر بولا۔

"لا — ادِر — وے علمے" گل پروشے نے اٹھ کر بوتل اس سے لے لی۔ اور تاج کی پشت پر پلنگ کے اوپر بیٹھتے ہوئے بوتل اس کی پسلیوں کے ساتھ لگا دی۔

"ایک کپ چائے بنالاؤ — میں گولیاں کھالوں" تاج نے علمے سے کہا۔

"اچھا چوہدری جی —" وہ بولا۔ پھر قدرے رک کر بولا "میرا تو خیال تھا۔ دودھ میں پھٹکری ڈال کر پی لیتے آپ — جی شاید اندر بھی زخم آگئے ہوں۔ دودھ پھٹکری تو پھٹ میل دیتا ہے چوہدری جی"

"بک بک نہ کر" وہ جھلایا ہوا تھا۔

"اچھا جی"

علما چلا گیا۔ گل پروشے اس کے کندھے آہستہ آہستہ دبانے لگی وہ چپ چاپ بیٹھی رہی — تاج بیحد جھنجھلایا ہوا تھا — اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ گل پروشے اور علمے کو تو اس نے کہا تھا۔ کہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا ہے۔ لیکن فضل نے جو اسے تو م کر رکھ دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا —

تاج کمینہ دشمن تھا۔ اس کے دل میں۔ اس کے دل میں کینہ تھا۔ ایک ہی مقابلہ میں اس نے جان لیا تھا۔ کہ فضل سے دو دو ہاتھ

نہیں کر سکتا ـــــ وہ تو جیسے فولاد کا بنا ہوا تھا ـــــ اک اک ضرب ایسی پڑی تھی۔ کہ کچومر نکل گیا تھا۔ ایسے آدمی سے اکیلے نپٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

ہاں

اس کو نیچا دکھانے اور زک دینے کے لئے اس کا دماغ تیزی سے منصوبے بنا رہا تھا ـــــ

اس مار کٹائی کے بعد تو بیگاں اس کے لئے چیلنج بن گئی تھی۔ غصّے اور اندھے انتقامی جذبے نے اس کے سینے میں ہلچل دی تھی ـــــ

وہ بیگاں کو ہر قیمت پر حاصل کرے گا۔

بیگاں کا ڈولہ ملکوں کی حویلی کی بجائے سکھیروں کی حویلی میں آئے گا۔

ایسا ہوگا

ضرور ہوگا

دل کی باتیں زبان پر بھی آگئیں۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

"کیا بولتا ہے تاج ـــــ" گل پروشے کچھ نہ سمجھ سکی۔

"او چپ رہو ـــــ" تاج گرجا ـــــ "خبردار جو ایک بات بھی کی"

"بوت غصہ میں ہے سردار ـــــ گھوڑے پر غصہ ہے ـــــ" گل پروشے نے ہلکی سی چوٹ کی۔

تاج غرایا اور پلٹ کر تھپڑ گل پروشے کے چہرے پر مارنے کو

ہاتھ اٹھایا ہی تھا۔ کہ درد سے بے حال ہوگیا ——
ہائے وائے سے اس نے کمرہ سر پر اٹھالیا ——
گل پروشے کے اندر کی عورت اس کی تکلیف پر کھلکھلا اٹھی ——
انتقام کسی رنگ میں بھی لیا جا سکتا ہے نا ——
علما چائے کی پیالی لے آیا۔ چوہدری کی تکلیف دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا ——
تاج نے بمشکل سرہانے پڑی میز پر سے دوائیاں اٹھائیں اور چائے پرچ میں ڈال کر ٹھنڈی کر کے اس کے ساتھ نگل لیں۔
گل پروشے پلنگ کی پرلی پٹی پر بیٹھی رہی۔
تاج چت لیٹ گیا —— وہ سانس آسانی سے نہیں لے سکتا تھا پسلی میں کافی تکلیف تھی ——
گل نے اب کچھ بھی نہ کہا۔ چپ چاپ اسے تکے گئی۔ اس کی نظریں تاج کے گال پر تھیں جہاں پانچوں انگلیوں کے سرخ سرخ نشان تھے۔ اسے پہلے بھی شبہ تھا۔ لیکن اب تو شبہ یقین میں بدل گیا۔ کہ تاج کہیں سے پٹائی کروا کے آیا ہے۔
علما سر جھکا کر کھڑا تھا۔
کئی لمحے گزر گئے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ دوائی میں شاید خواب آور گولیاں بھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تاج کی آنکھیں بند ہوگئیں —— اور وہ نسبتاً سکون سے سانس لینے لگا۔
گل پروشے نے لحاف اس کے سینے تک کر دیا۔ اور خود آتشدان کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔ قریب ہی قالین پر علما بھی اپنے

کھیس کی بکل مار کر بیٹھ گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ لیکن نیند دونوں ہی کو نہ آ رہی تھی۔

"علمے" گل پروشے ہاتھ سینکتے ہوئے بولی لکڑیاں جل کر کوئلہ بن گئی تھی۔ یہ کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کا عکس گل پروشے کے خوبصورت چہرے پر پڑ رہا تھا ——

"جی بی بی" علما بولا ——

"سردار گھوڑے سے گرا ہے ؟"

"یہی کہہ رہے تھے"

"تمارا کیا خیال ہے"

"جی —— ؟"

"یہ کدر سے پٹائی کر کے آیا ہے"

علما صرف گل پروشے کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا —— اس نوعمر لڑکی کے قیافے پر وہ حیران رہ گیا۔

"اس کا سارا بدن پر نیل کا نشان ہے"

"ہاں۔ میں نے کپڑے تبدیل کروائے تھے تو دیکھا تھا"

"گریبان بھی اور قمیض بھی پھٹا ہے۔"

"ہاں جی"

"یہ گھوڑے نے تو نہیں پھاڑا ——"

"ہاں بی بی ——"

"اس کا چہرہ دیکھ۔ انگلی کے صاف نشان ہے"

"دیکھا تھا میں نے ——"

"اس کا کس سے دشمنی ہے"

"گاؤں میں تو ملکوں کے ساتھ ہی ہے" مختصر لفظوں میں علمے نے خاندانی دشمنی کا ذکر کیا۔

"یہ آج گاؤں گیا تھا نا"

"ہاں"

"اُدر ہی جھگڑا کیا"

"پتہ نہیں بی بی ——"

"سردار اچا آدمی نیئں ہے"

علمے نے پھر چونک کر گل پروشے کو دیکھا۔

"اس نے ام سے شادی کیا۔ امارا خاوند ہے —— لیکن یہ ام کو اب پوچھتا نیئں ہے —— اور اور عورت کے پیچھے دوڑتا ہے ——"

علما چپ رہا

گل بولی "گاؤں میں اب یہ بوت جاتا ہے۔ اُدر بھی کوئی لڑکی کا چکر ہے —— امارا دل کہتا ہے ——"

علما سر جھکا کر بیٹھا رہا —— گل پروشے کی باتوں سے اس کی سوچوں کی کئی گرہیں کھل گئی تھیں —— بیگاں کے متعلق چوہدری نے اسے ایک دو دفعہ بتایا بھی تھا —— علمے کو پتہ تھا۔ بیگاں ملک فضل کی منگ ہے۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں چوہدری کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اس کا مالک اک جابر آقا تھا۔ اس بیچارے کی کہاں

سنتا تھا۔ وہ سوچوں کی کڑی سے کڑی ملانے لگا۔

اور

جب سوچیں اس نقطے پر رکیں۔ کہ آج تلج کا سامنا بیگاں کے بھائیوں یا ملک فضل سے ہوگیا ہوگا۔ تو وہ سرتاپا کانپ گیا۔

اگر یہ بات ہے تو

تو

اس کے جو ہولناک نتائج ہوں گے۔ ان کا تصور بھی لرزا دینے کو کافی تھا۔

"بکو"

"جی ملک جی"

"گھوڑی تھان پر باندھ آ"

"اچھا ملک جی"

دروازے پر آکر بکو نے گھوڑی کی باگ فضل کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ فضل صحن میں آگیا۔

اندھیرا کافی پھیل چکا تھا۔ دالان میں لالٹین جل رہی تھی۔ رسوئی گھر میں بھی تیل کا دیا جل رہا تھا۔ فضل دالان میں ماسی رابو کے پاس جانے کی بجائے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی مٹی کے تیل کا پیتل کا لیمپ روشن تھا۔ بتی نیچی کی ہوئی تھی۔ اس لئے ہلکی ہلکی روشنی پھیلی تھی۔

وہ آکر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پگ اتار کر سرہانے رکھ دی۔ اور کندھوں پر ڈالی شال بھی اتار دی۔

فضل کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ دیواریں لپی پتی تھیں۔ فیروزی اور پیلے رنگ کی دیواروں پر گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چھت کے بالوں اور شہتروں پر بھی کھدائی سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ بھی رنگین لکڑی اور پیتل کے پھولوں سے آراستہ تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ چھتی رینٹل پلیس تھی۔ جس پر بڑا سا شیشہ لگا تھا۔ شیشے پر کروشیے کا رومال پڑا تھا۔ چھتی پر کاڑھا ہوا کپڑا تھا۔ پلنگ کی چادر اور چھتی کا کپڑا انجو نے دیر کے کمرے کے لئے اپنے ہاتھ سے کاڑھا تھا۔ ایک طرف دو رنگین پیڑھا نما کرسیاں بھی پڑی تھیں — دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ کھونٹیاں تھیں۔ جن پر فضل کے کچھ کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف لکڑی کے صندوق اوپر تلے رکھے تھے جن پر جھالروں والا سفید کپڑا پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ کے کونے میں دیوار کے اندر الماری تھی اس میں موٹا سا قفل تھا۔ اس الماری میں روپیہ زیور اور زمین کے اہم کاغذات رکھے رہتے تھے۔

فضل نے اک سرسری سی نگاہ کمرے پر ڈالی۔ اور پھر جوتا اتار کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر تلے رکھ کر وہ خالی خالی نظروں سے چھت کی کڑیاں دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گیا۔

آج کا واقعہ ایسا نہیں تھا۔ جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ بے شک وہ صلح کل اور آشتی پسند انسان تھا۔ لیکن آج تاجے نے اس کی غیرت اور حمیت کو للکارا تھا۔

وہ مشتعل ہوگیا تھا۔ اور اس نے سیکھرے کو روئی کی طرح دھنک دیا تھا۔

لیکن

یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس سے مسئلہ اور سنگین ہوگیا تھا۔

اور

یہی ،

سنگینی اسے پریشان کئے ہوئے تھی۔ وہ ٹھیک طرح سوچ نہ پا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں آگ لگی تھی۔ دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا۔

اسے اب کیا کرنا چاہیئے۔ ؟

صورتِ حال سے کیونکر نپٹنا چاہیے ؟

بات گاؤں کی پنچائت میں پیش کرنی چاہیئے ؟

یا

خاموشی اختیار کر لینی چاہیئے ——— ؟

وہ اس وقت صرف سوچ ہی رہا تھا۔ کبھی ایک بات کبھی دوسری فیصلہ کرنے کی اس وقت ہمت ہی نہ تھی۔

وہ سوچوں میں گُم تھا۔ کہ سامنے دالان سے ماسی رابو کی آواز آئی ———

"جیراں ۔ نی جیراں"

"جی ماسی" جیراں شاید رسوئی گھر میں تھی

"کون آیا ہے ابھی" ماسی نے پوچھا۔

"ملک جی آئے تھے"

"فضل"

"ہاں"

"بیٹھک میں چلا گیا"

"نہیں ـــــ اپنے والان میں گئے ہیں ـــــ"

"خیر ہے۔ میری طرف کیوں نہیں آیا"

"آتا ہوں ماسی" جیراں کی بجائے فضل نے جواب دیا۔ اس نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

وہ پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔ انگلیاں الجھا کر بال درست کئے۔ دوپٹہ جھاڑ کر لپیٹی اور جوتی پہن کر کمرے سے نکل آیا۔

"جیراں" اس نے آواز دی۔

"جی ملک جی"

"نجو کہاں ہے"

"شادو کے گھر گئی ہیں سب"

"کیوں"

"اس کی بہن کا سوہریوں جوڑا آیا ہے"

"جیلاں جارو بھی"

"سب گئی ہیں ـــــ"

"پکایا کیا ہے"

"مٹراں والے چاول اور آلو ـــــ"

"نجو کھانا وہیں کھائے گی"

"توبہ کرو ملک جی۔ بھلا آپ کے بغیر وہ کھانا کھا سکتی ہے اور وہ بھی آپ کو بتائے بغیر"

"پگلی ہے"

"ویر کی دیوانی ہے"

فضل نے اک گہری سانس لی اور آہستہ آہستہ چلتا ماسی رابو کے پاس آگیا۔

دائیں ہاتھ پڑی رنگین چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "کیا حال ہے ماسی"

"آج تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا" ماسی نے اپنی چندھیائی نظروں سے فضل کو دیکھا۔

"اوہ — ہاں ماسی — پیسے لایا تھا الماری میں رکھنے گیا تھا" اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"ہو گیا سارے پھل کا نیلام"

"ہاں — باقی کل ہو گا۔ تقریباً ہو ہی گیا ہے"

"اچھے پیسے ملے"

"فضل نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا دماغ اپنی سوچوں ہی میں الجھا ہوا تھا۔

ماسی نے پھر اپنا سوال دہرایا ——

"کیا ماسی؟" وہ چونک کر بولا۔

"سن نہیں رہا۔ کیا سوچ رہا ہے"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں ——"

"میں پوچھ رہی تھی - اچھے پیسے ملے ہیں"
"کہاں سے ؟"
"باؤلا ہو گیا ہے — پھل کے نیلام سے اور کہاں سے"
"ہاں — ہاں —"
وہ اُٹھ کھڑا ہوا — وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماسی رابو اس کی ریشانی بھانپ لے —
"کدر چلے ہو"
"ذرا باہر — بیٹھک میں — لوگ آئے بیٹھے ہوں گے —"
"گل تو سن"
"کیا"
"آج راجو کی پھپھی پھر آئی تھی — جواب لینے"
"اوہ ماسی — ابھی ٹھہر جا — دے دیں گے جواب بھی"
وہ اُلجھ کر بولا — اور پھر دلان سے نکل کر صحن میں آگیا - باہر جانے ہی کو تھا - کہ نجو گرم چادر میں منہ سر لپیٹے آگئی — اس کے پیچھے جیلاں جارو اور رقیہ بھی آگئیں -
"ویر جی آگئے —" اس نے فضل کو دیکھ کر کہا -
"تو کہاں تھی ؟"
"شادو کے گھر"
"میں ذرا بیٹھک میں جا رہا ہوں"
"روٹی نہیں کھانی"
"کھا لوں گا — بھوک نہیں"

"بہت مالٹے کھالئے تھے"

"شاید ـــ تو کھالینا روٹی۔ میں ذرا بیٹھک میں جارہا ہوں"

"اوں ہوں۔ تجھے پتہ بھی ہے ویر ـــ"

"حد ہوگئی ـــ اب مجھے بھوک ہی نہ ہو۔ تو۔ تُو کھانا ہی نہیں کھائے گی"

"نہیں"

فضل چُپ ہوگیا۔ پھر بولا "چل جلدی لے آ کھانا ـــ میں بھی کھالوں گا۔ پاگل لڑکی۔ ورنہ بھوکی رہ جائے گی"

نجو رسوئی گھر کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سینی میں چاولوں کی دو پلیٹیں۔ اور آلوؤں کا پیالہ رکھے اندر آگئی۔ اچار کے آم اور مرچیں بھی ایک پیالے میں ڈال کر لے آئی۔

جیلاں پانی کے گلاس بھر کر لے آئی۔

دونوں بہن بھائی آمنے سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ نجو فضل اور ماسی رابو کو شادو کی بہن کے سُسرال سے آئے جوڑے کے متعلق بتاتے ہوئے نوالے لینے لگی۔

لیکن

وہ چونک گئی۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ فضل کھانا بیدلی سے کھا رہا تھا۔ ایک نوالہ منہ میں ڈالتا ـــ تو دوسرا اٹھانا ہی بھول جاتا ـــ

وہ چند لمحے غور سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر بولی "کیا بات ہے ویر"

"کچھ نہیں"
"کچھ پریشان لگ رہا ہے"
"ہٹ پگلی"
"نہ چھپا مجھ سے — میرا دل کہہ رہا ہے — تو پریشان ہے۔
"بس تو تو نری جھلی ہے جھلی ——"
فضل نے ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا۔ گلاس اٹھایا۔ آدھا پانی پیا اور باقی آدھے سے دروازے کے قریب آکر صحن میں ہاتھ دھو لیا۔ گلاس جیلاں کو پکڑ کر وہ باہر چلا گیا۔
نجو کا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا — کوئی بات ضرور تھی — ویر پریشان تھا — وہ اس سے کچھ چھپا رہا تھا —
وہ سوچوں میں ڈوب گئی — کھانا اس سے بھی نہ کھایا گیا۔

"بجو"

"ہوں"

"کیا بات ہے"

"کچھ نہیں"

"کوئی گڑ بڑ تو نہیں"

"کیسی ؟"

"تیرے ویر نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا"

"ہوں"

"پھپھی ماسی رابو کے پاس گئی تھی"

"مجھے پتہ ہے"

"اس نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا"

"دے دیں گی"

"انکار تو نہیں ہوگا"

"نہیں"

"یقین ہے تجھے"

"ہاں - ویر نے فیصلہ تیرے حق میں دے دیا ہے - تجھے بتا تو چکی ہوں"

"جب تک وہ میری ماں یا پھپھی سے نہیں کہے گا - میں بے یقینی سے ڈولتا رہوں گا"

"تجھے ایسا نہیں سمجھنے چاہیئے راجو — ملک فضل قول کا دھنی ہے - سب جانتے ہیں"

"ہاں — یہ بات تو ہے"

"پھر"

"پھر — تو بتا میں کیا کروں"

"یقین رکھ —"

"اچھا بھئی — اب مایوسی کی باتیں نہیں کروں گا"

راجو خوش ہوگیا - نجو چادر کی بکل مارے ٹوٹی پھوٹی سرخ مٹی کی دیوار پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی - راجو اس کے قریب کھڑا تھا — دونوں پیر صاحب کی درگاہ کے پچھواڑے ملے تھے - سہ پہر کا وقت تھا - دھوپ کی حدت ختم ہو چکی تھی - اب سائے کچھ لانبے ہو رہے تھے - کرنوں کا سنہری پن زردی میں بدل رہا تھا — آج صبح سے کچھ جھکڑ قسم کی ہوا چل رہی تھی - پیڑوں کے سوکھے پتے جھڑ رہے تھے — مٹی کے ساتھ ساتھ سوکھے پتے بھی اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے -

"بنسری سنے گی" راجو نے نجو سے پوچھا۔
"اس وقت"
"ہاں"
"نہیں"
"کیوں"
"جی نہیں چاہ رہا"
"کیا ہوا جی کو"
"بس"
نجو نے اک گہری سانس لی۔ اور پہلی بار راجو کو احساس ہوا۔ کہ نجو کچھ اداس کچھ پریشان ہے۔ وہ جلدی سے بولا "کیا بات ہے نجو ـــ اداس کیوں ہے"
نجو اپنی خوبصورت آنکھیں راجو کے چہرے پر جما کر بولی "میں بڑی پریشان ہوں راجو"
"کیوں" راجو کا بنسری والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ نجو کے چہرے پر جھکتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا "کیوں پریشان ہے"
نجو نے سر جھکا لیا اور گود میں رکھے ہاتھ مسلنے لگی۔ پھر ہاتھوں میں پڑے چاندی کے چھن کنگن آگے پیچھے کرتے ہوئے بولی "تجھے کیا بتاؤں"
"بتا تو سہی ـــ کیا بات ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں"
"تجھے تو بس اپنی پڑی ہے"
"پھر تجھے پریشانی کس بات کی ـــ تیرے ساتھ بچتی نہیں

ہے پریشانی "

" ٹھیک ہے - لیکن میں بھی کیا کروں - پتہ نہیں کیا بات ہے
میرا دیر بڑا پریشان ہے "

" فضل ! "

" ہاں "

" کیوں - کیا ہوا ؟ "

" پتہ نہیں "

" زمین کا تو کسی سے جھگڑا نہیں. "

" پتہ نہیں — ویسے میں نے پوچھا تھا اس سے "

" پھر کیا کہا "

" کہتا ہے کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ——— "

" پانی کے بٹوارے کا ؟ "

" وہ بھی نہیں ——— "

" مالٹوں کے نیلام کی کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی "

" وہ کہتا ہے یہ بات بھی نہیں ——— "

" ہوں "

راجو کی شربتی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں رینگنے لگیں -
چند لمحوں بعد بولا " اس کا سکھیروں سے تو کوئی جھگڑا نہیں - "

" نہیں - سکھیروں سے تو اس نے معاملہ ہی ختم کر دیا ہوا ہے -
بات تو کبھی نہیں ہوئی کوئی - نہ ہی سننے میں آیا ہے — بلکہ پچھلے
مہینے تو رفیق سکھیرا ہماری بیٹھک میں آیا تھا "

"واقعی"

"ہاں"

"فضل سے ملا"

"لو ہماری بیٹھک میں کیا دیواروں سے ملنے آیا تھا۔ وہی تو بڑا بھائی ہے۔ سب کا کرتا دھرتا ـــــ ویر سے اس نے چھٹی ڈالی تھی ـــــ"

"پھر ـــــ پھر کیوں پریشان ہے فضل"

"یہی تو بتاتا نہیں"

"ایسے ہی تیرا وہم ہوگا ـــــ"

"نہیں یہ وہم نہیں راجو۔ وہ بیحد پریشان ہے"

"کب سے"

"دو تین دن سے"

"میرا تو خیال ہے تیرا وہم ہی ہے۔ تو ذرا اپنے بھائی کی زیادہ ہی دیوانی ہے نا ـــــ ہو سکتا ہے اسے کوئی جسمانی تکلیف ہو۔ تجھے نہ بتانا چاہتا ہو"

"یہ بات ہے تو بتانے میں کیا ہرج ہے"

"تو اس کی تکلیف برداشت جو نہیں کر سکتی۔ یاد ہے سراجے کی شادی پر جو اسے پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی تھی ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"تیری حالت جو تھی۔ لگتا تھا۔ پیڑ فضل کے نہیں تیرے ہو رہی ہے"

"ہاں راجو - واقعی میرے پیٹ میں تین دن مروڑ پڑتے رہے تھے ——"

"اسی لئے تجھے بتاتا نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے - پیٹ ہی میں کچھ تکلیف ہو"

"نہ بتا کر مجھے زیادہ پریشان کر رہا ہے —— لیکن نہیں — راجو. پیٹ کی تکلیف نہیں اسے - بات کچھ اور ہی ہے۔"

"اور کیا ہو سکتی ہے ؟"

"یہی تو پتہ نہیں چل رہا —— نہ ہی کچھ بتاتا ہے - بہت پوچھتی ہوں. تو ہنس کر کہتا ہے تو تو نری جھلی ہے - پاگل ہے"

"زیادہ نہ پوچھا کر. شاید خود ہی بتا دے"

"اوں ہوں —— بات ضرور ہے کوئی — اور ہے بھی ایسی جسے مجھ سے چھپانا چاہتا ہے"

"یہ کیسے جان گئی تو ——"

"بھئی میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں - کوئی بات بھی تو مجھ سے نہیں چھپاتا - اپنی اور بیگاں کی باتیں بھی بتا دیتا ہے ——"

"اوہ ٹھیک"

"کیا"

"بیگاں سے روٹھا ہوگا"

"یہ بھی میں پوچھ چکی"

"کیا کہتا ہے"

"وہی - تُو تو جھلی ہے - نری پاگل ہے۔"

"تُو بیگاں سے ملی ہے"

"نہیں"

"اسی سے مل کر پوچھ لیتیں۔"

"کل جاؤں گی —— میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ کہ اس سے مل کر پوچھوں"

"لڑکیاں پیرٹ کی بلکی ہوتی ہیں۔ ضرور سب کچھ بتا دے گی"

"اور اگر اسے ویر فضل کی پریشانی کا علم ہی نہ ہوا تو"

"تو وہ پوچھ لے گی فضل سے۔ شاید اسے بتا ہی دے۔ تیرے بتانے کی بات ہی نہ ہو"

"ہوں ——"

راجو بنسری ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے سوچنے لگا۔ نجو کے چہرے پر اُداسی اور پریشانی پھیلی تھی —— سوگوار اور اُداس نجو بیحد اچھی لگ رہی تھی۔

"ویر کی پریشانی کا راز جب تک میں جان نہ لوں گی مجھے چین نہ آئے گا راجو"

"ہوں"

"آج رات میری آنکھ کھل گئی۔ صحن میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ میں نے ذرا سی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ تو ویر صحن میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا ——"

"واقعی وہ بہت پریشان ہے"

"ہاں"

"اللہ جانے کیا بات ہے"

"یقین کر راجو۔ میں مرغوں کی بانگوں تک باری میں سے اسے دیکھتی رہی - وہ صحن میں برابر ٹہلتا رہا۔ کبھی رُک کر سوچنے لگتا۔ کبھی ہاتھ ملتا۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھتا"

"یہ بات ہے ــــ پھر تو ضرور اسے کوئی بہت بڑی فکر لگی ہے ــــ"

"تو بتا - میں پریشان نہ ہوؤں"

راجو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور نجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ماسی رابو کے سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر جیلاں نے گھنٹہ بھر مالش کی۔ پھر اس کی چارپائی صحن کے مشرقی کونے میں دیوار کے ساتھ لگادی اور اوپر چوکور خانوں والا کھیس ڈال دیا۔ اس کے کپڑے بدلائے اور کنگھی پٹی کر کے اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔

"بس ماسی"

"بس جیتی رہو"

"اب میں جاؤں چھت پر"

"جا ——"

"کچھ کھائے پیئے گی"

"ابھی نہیں"

"مالٹا چھیل دوں"

"نہ۔ نہ۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔ بس حقہ دے دو مجھے ——"

جیلاں نے حقہ ماسی کے قریب رکھ کر نے اسے پکڑا دی اور

خود رنگ دار چنگیری میں گڑ اور اخروٹ ملے مکئی کے دانے ڈال کر نجو کے لئے اوپر لے گئی۔

نجو بے منڈیر کے کوٹھے پر چارپائی ڈالے بیٹھے تھی۔ قریب ہی رقیہ اور جارو دری بچھائے بیٹھی تھیں۔ محلے کی تین چار لڑکیاں اور بھی آ بیٹھی تھیں۔ رقیہ چرخہ کاتنے کی مشق کر رہی تھی۔ باقی لڑکیاں گنے چوس رہی تھیں۔ ان کے پھینکے ہوئے چھلکوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

گاؤں کے ایک منزلہ مکانوں کی چھتوں پر دھوپ سنہری جال پھیلائے تھی۔ عورتیں اور بچے کام کاج سے فارغ ہو کر چھتوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔

"لے" نجو کے سامنے چنگیری رکھتے ہوئے جیلاں بولی۔

"میں نہیں کھاؤں گی ـــ تم لوگ کھالو ـــ" نجو نے چنگیری واپس کرتے ہوئے کہا۔

"نجو ـــ تمہیں کیا ہو گیا ہے" جیلاں بولی۔

"بڑی چپ چپ رہتی ہو" ہمسایہ لڑکی نے گنا چوستے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔ بھا فضل بھی آج کل چپ چپ رہتا ہے" رقیہ بولی "ہنستا ہے نہ بولتا ہے۔"

جیلاں بھی کچھ کہنے کو تھی۔ کہ نیچے صحن سے فضل کی آواز آئی۔

"دیر آ گیا ہے" نجو چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتری۔ اور صحن میں جھانکا۔

فضل ماسی رابو کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نجو نے دیکھا وہ اب بھی پریشان تھا۔

"ماسی" فضل نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد کہا۔

"کیا ہے بیٹے"

"ماسی ——"

"ہاں ہاں۔ کیا کہنا ہے —— جھجک کیوں رہا ہے"

"میری شادی کا بندوبست کرو ماسی"

"ہیں ——— ؟ —— کیا کہا" ماسی نے پہلے حیرت پھر مسرت بھری آواز میں پوچھا

فضل بدستور سنجیدہ تھا "میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔"

"اور جو تو ہر وقت کہتا تھا پہلے نجو کی کروں گا" ماسی نے اپنی چندھیائی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

"بس۔ اب اپنی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی بھی کر دوں گا"

"ہائے پترا۔ اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو گی۔ نجو کو پتہ چلا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی ——"

فضل اس کی اَن سنی کرتے ہوئے سوچوں میں ڈوبے ڈوبے بولا "اسی چاند کی چودھویں کو —— دن مقرر کر لے جا کر پھپھی سکینہ کے ہاں۔ کہتی ہے تو میں خود بھی چلا جاؤں گا وہاں"

"اسی چاند کو چودھویں کو —— حیرت سے ماسی بولی۔ ہاں ماسی جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو ——"

"لیکن پترا ——"

"ماسی ـــ لیکن دیکن کچھ نہیں۔ پھپھی تو پہلے ہی تیار ہے۔ ہم نے کیا کرنا ہے ـــ بس جاکر کڑی لے آنی ہے"

"ماسی کچھ نہ بولی عالم اضطراب میں حقے کے پے در پے کش لینے لگی۔

اتنے میں نجو سیڑھیاں اتر کر صحن میں آگئی۔ بھائی کی طرف دیکھا ور پھر چپکے سے ماسی رابو کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"نجو بیٹی"

"ہاں ماسی"

"یہ فضل کیا کہہ رہا ہے"

نجو کے کچھ پوچھنے سے پہلے فضل بولا "کہہ رہا ہوں۔ کہ میری شادی کردو"

"سچ" نجو فرط حیرت سے چیخی۔

"ہاں" فضل نے بمشکل مسکرا کر کہا۔

"ہائے میں صدقے جاواں ـــ" نجو دونوں ہاتھ الجھا کر آنکھیں بند کر کے بولی۔

"لیکن یہ بھی تو سن پگلی" ماسی رابو اس کو خوشی سے مغلوب ہوتے دیکھ کر بولی۔

"کیا؟ ـــ کیا ماسی؟"

ماسی کی جگہ پھر فضل نے کہا "اسی چاند کی چودھویں کو شادی کرنے کا کہہ رہا ہوں"

"اسی چاند کی چودھویں کو؟" اب نجو نے حیرانگی سے کہا۔

اور

ماسی رابو انگلیوں پر دن گنتے ہوئے بولی " پورے نو دن بعد۔ آج چن کی پانچویں ہے"

" اتنی جلدی ویرا ـــــ " نجو نے فضل کی طرف غور سے دیکھا۔

" ہاں ـــــ " اس نے جواب دیا۔

" تیاری کیسے ہوگی " نجو اب بھی حیران تھی۔

" ملک فضل کی شادی اور ہفتہ کل تیاری کے لئے۔ کیسی باتیں کرتا ہے پترا ـــــ " ماسی نے آواز میں سارا پیار سمیٹ لیا۔

" تیاری سے زیادہ شادی ضروری ہے " فضل اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا " کل جاکر پھپھی سے دن مقرر کر لو ـــ بس ـــ "

وہ اُٹھ کر اپنے دالان میں چلا گیا۔ نجو چپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اور ماسی رابو اتنے کم وقت میں پنڈ کی یادگار شادی کے نہ ہو سکنے کے امکان پر بڑبڑ کرنے حقہ گڑگڑانے لگی۔

چند لمحے بوجھل سے گزر گئے۔ چھت پر لڑکیاں ادھم مچا رہی تھی۔ مکئی کے دانوں گنے اور مالٹوں پر لوٹ کھسوٹ ہو رہی تھی ـــــ بے فکری سے سب قہقہے لگاتے ہوئے چھپا چھپی کر رہی تھیں۔

نجو اپنے آپ سے اُلجھنے لگی۔ اب اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی۔ کہ فضل کی پریشانی کا تعلق کسی نہ کسی طور بیگاں سے ہے۔

لیکن

ایسی کیا بات ہے؟

اس نے تو بیگاں کی کوئی بات کبھی اس سے نہ چھپائی تھی۔ جب

بھی اسے مل کر آتا بتا دیا کرتا تھا ـــــ
کیا وہ اس سے روٹھ گئی ہے؟"
لیکن
روٹھنے کا علاج شادی تو نہیں۔

پھر؟
پھر؟
وہ الجھتی ہوئی چارپائی سے اٹھی اور فضل کے دالان میں گئی۔
فضل سر تلے دونوں ہاتھ تکیئے پر رکھے جوتوں سمیت بستر پر لیٹا چھت پر نظریں جمائے سوچوں میں گم تھا۔
ایسا گم
کہ
اسے نجو کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔
نجو کتنی دیر چپ چاپ پلنگ کے پائنتی والے ٹیک کو پکڑے کھڑی رہی۔
اچانک فضل نے اسے دیکھا
تو
اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بالوں کو سلجھاتے ہوئے خفت سے مسکرایا اور بولا "کیوں چالاکو ماسی۔ کیا لینے آئی ہے؟"
نجو اس کی بات پر ہنسی نہ مسکرائی ـــ بت کی طرح خاموش سے تکے گئی۔
"آجانا۔ کیا بڑبڑ منہ تک رہی ہے۔ ادھر آ بیٹھ میرے پاس"

فضل پلنگ کی پٹی پر ایک طرف ہو کر بولا ——
نجو ساکت سی کھڑی رہی۔
فضل نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑی اور گھما کر اپنے قریب بٹھا کر بولا " کیوں جی —— میری شادی کی خوشی نہیں تجھے —— میں میں سمجھا تھا۔ یہ بات سن کر تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ دوڑ کر سہیلیوں کو بلا لائے گی اور ڈھولک پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے گائے گی "
" ویر جی " اس کی ساری باتیں جیسے نجو نے سنی ہی نہیں۔ سنجیدگی سے بولی۔
" ہوں " فضل نے اسے ہنسانے کے لئے اس کا سر اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ادھر ادھر ہلایا۔
" ایک بات بتاؤ "
" کیا ؟ "
" بات کیا ہے ؟ "
" تو جھلی ہے بالکل "
" جو مرضی ہے۔ کہہ لے لیکن میں پوچھ کر ہی رہوں گی —— "
" کیا پوچھے گی پگلئے " فضل پہلی بار سنجیدگی سے بولا۔
" کیا چھپا رہا ہے مجھ سے کیا پریشانی ہے تجھے —— اس پریشانی کا حل شادی کیوں ہے ؟ "
وہ مسکرایا —— " اتنی ذرا سی تو تُو ہے۔ اور باتیں لقمان حکیم سی کر رہی ہے "

"میری بات نہ ٹالو ویر جی"

"تجھے بتاؤں کیا ـــ بس تو میری شادی اس چاند کی چودھویں تک کر دے"

"اتنی جلدی کیوں"

"ہے اک مصلحت"

"مجھے نہیں بتائے گا تو"

"بعض باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں"

"مجھے غیر سمجھتا ہے - یا کم عقل"

"نہیں نہیں نجو رانی -

"تو پھر ـــ"

"بس ـــ اوہ ربا ـــ کیا بتاؤں تمہیں ـــــ" فضل شش و پنج میں پڑ گیا - نجو اس کا منہ تکتی رہی - معاملے کی سنگینی کا اسے احساس تھا -

"بات یہ ہے میری بھین" بالآخر کئی لمحوں کی کشمکش کے بعد فضل نے کہا نجو کو مطمئن کرنا ضروری تھا ـــ ورنہ وہ پاگل تو سوچ سوچ کر ہی مر جاتی -

"ہاں"

"بات معمولی سی ہے - لیکن آن کا معاملہ بن گیا ہے"

نجو ہمہ توجہ بن کر بھائی کا منہ تکنے لگی -

"کیسے" وہ بولی

"کسی سے کہے گی تو نہیں - لڑکیاں پیٹ کی بہت ہلکی ہوتی ہیں -

کوئی راز راز رہنے ہی دیتیں ——"

"مجھ پر اعتبار کر ویر جی"

"ہاں تو —— شادی میں جلدی سے جلدی کرنا چاہتا ہوں۔ بیگاں میری منگ ہے —— اسے عزت آبرو سے گھر لے آؤں تو اچھی بات ہے ——"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟ بیگاں ہماری عزت ہے اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ کیسے سکتا ہے۔"

"بس یہی تو بات ہے ۔ کسی نے بُری نگاہ سے اسے دیکھا ہے" نجو کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ بھائی کا منہ ششدر سی تکے گئی —— پھر اس کے لبوں سے نکلا "کس نے ——"

"ہے کوئی پلید ——" فضل نے غصّے سے دانت پیستے ہوئے کہا ——

"کسی کی یہ مجال ——" وہ بپھرنے لگی۔

"بی بی" فضل نے ملائمت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر بات بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں۔ بیگاں کو گھر لے آؤں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس ذلیل کتے سے نپٹنے کی طاقت ہے مجھ میں ——"

نجو سر جھکا کر چند لمحے بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی "تجھے کیسے پتہ چلا ویر"

"کیا مطلب"

"یہی بات ـــ کہ بیگاں پر کسی نے بری نگاہ ڈالی ہے"
فضل جوش میں آکر بولا "کہتا کون - اس نے خود مجھے تڑی (دھمکی) دی ہے"
"تڑی ـــ ؟"
"ہاں"
"ہوں"
"کہا ہے ـــ دیکھوں گا بیگاں کا ڈولا تم لے جاتے ہو یا میں ـــ"
نجو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا اور بولی "اس نے کہا ـــ اور تم نے سُن لیا ملک فضل ـــ"
"ہونھ ـــ"
"تیرا بھائی بزدل نہیں ـــ کھال ادھیڑ دی ہے اس کی مہینہ بھر چارپائی سے نہ اُٹھ سکے گا ـــ"
نجو کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا ـــ "عزتوں کے رکھوالے ایسے ہی ہوتے ہیں ـــ"
"اچھا اب تو تیاری شروع کر دے شادی کی - عزت و آبرو سے بیگاں کو پہلے گھر لے آئیں ـــ میں نہیں چاہتا کہ کوئی گڑبڑ ہو - اور بیگاں بدنام ہو جائے"
"ٹھیک ہے"
"اچھا ـــ اب راز تو تجھے پتہ چل گیا ـــ اسے راز ہی رکھنا نجو بی بی ـــ"

"تو مجھے بالکل ہی بچی سمجھتا ہے۔

"میں تجھے سب کچھ ہی سمجھتا ہوں۔ تو ماں ہے۔ بہن ہے بیٹی ہے" فضل نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگا کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

نجو کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ محبتوں۔ چاہتوں اور عقیدتوں کو سہار لینا آسان تو نہیں ہوتا——

"بیگاں"

"ہوں"

"ایک بات پوچھوں بتائے گی"

"کیا بات ؟"

"بس جو بھی پوچھوں"

"پوچھو تو سہی"

"پہلے وعدہ کرکہ بتائے گی"

"بتانے کی ہوئی تو بتادوں گی"

"نہیں شرط کے بغیر — جو پوچھوں گی بتادے گی ؟"

"پوچھ نا"

"میرے ویر نے مجھے بتایا تھا"

"کیا ؟"

"تجھے کسی نے چھیڑا تھا۔ اور میرے ویر کو تڑی دی تھی۔ کہ —"

"ہاں — ہاں"

بیگاں گھبرا گئی — فضل نے تو اسے منع کیا تھا۔ کہ یہ بات کسی کو نہ بتائے۔ خود نجو کو بتا دی تھی۔

نجو ماسی رالو اور رشتہ کے ایک "نایا تائی" کے ساتھ بیگاں کے ہاں تاریخ طے کرنے آئی تھی۔ بزرگ تو دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پچھلی کوٹھڑی میں جہاں بیگاں چارپائی پر لحاف اوڑھے بیٹھی تھی۔ آگئی تھی۔ آج سردی بہت تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ کہیں بارش ہو گئی تھی۔ جو خنک ہوا چل رہی تھی —— نجو بھی اس کے پاس گرم گرم لحاف میں گھس گئی تھی — اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کام کی بات پوچھی تھی۔

وہ اس مردود کا نام سننا چاہتی تھی۔ جس نے اس کے گھرانے کی عزت اور آبرو پر بُری نگاہ ڈالی تھی۔

"بتانا بیگاں"

"کیا"

"کس نے یہ حرکت کی تھی"

"فضل نے منع کیا تھا"

"منع ؟"

"ہاں اس نے کہا تھا۔ کسی کو نہ بتانا۔ میں نے تو اپنے چاچا بے اور بھائیوں کو بھی نہیں بتایا ——"

"اچھا کیا ہے"

"پر میرا دل اسی دن سے بیٹھا جا رہا ہے نجو — خدا جانے کیا

ہونے والا ہے "

"تیرا بیاد ہونے والا ہے اور کیا ہونے والا ہے" نجو نے اسے چھیڑا - لیکن وہ خوفزدہ تھی ——

"وہ بڑا ذلیل آدمی ہے —— کمینے دشمن کا کیا پتہ کیا کر بیٹھے ——" بیگاں ہراساں تھی ——

نجو بستر میں اونچا ہوتے ہوئے بولی "دشمن کا واسطہ ملکوں سے پڑا ہے - ملک کسی سے ڈرتے نہیں ——"

"لیکن نجو ——"

"کیا"

"پرانی دشمنیاں ——"

"تو کیا تجھے ——" نجو لحاف پرے ہٹا کر اُٹھ بیٹھی —— غصے سے بپھرتے ہوئے بولی

"تجھے کسی سکھیرے نے چھیڑا ہے"

"ہاں"

"کس نے"

"تاجے نے"

نجو نے آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں

"دیکھ نجو" بیگاں جلدی سے بولی "فضل سے نہ کہنا - کہ میں نے تجھے بتا دیا ہے وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا - اس نے مجھے سختی سے منع کیا تھا ——"

لیکن

نجو تو اس کی بات جیسے سن ہی نہ رہی تھی۔ اسے پتہ نہیں کیا ہونے لگا تھا۔ بزدل تو وہ ہرگز نہ تھی۔ لیکن ——
پُرانی نسل در نسل دشمنی کے خیال سے وہ کانپ گئی۔
فضل نے تو یہ باب ہی بند کر دیا تھا۔
لیکن
اس کمینے تاجے نے پھر وجہ نزاع پیدا کر دی تھی ——
وہ سوچوں میں گم ہو گئی —— تاجے کے متعلق کون نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے —— اس کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کی داستانیں شہر سے اڑتی تھیں۔ اور کئی گاؤں میں بڑھ چڑھ کر پھیل جاتی تھیں۔
نجو کے ذہن میں خونی واردا تیں اُبھرنے لگیں۔ ہر سال چھ ماہ بعد دونوں خاندانوں میں کوئی نہ کوئی قتل ہو جاتا تھا —— کبھی وہ لوگ ملکوں کا بندہ قتل کر دیتے تھے۔ اور کبھی ملک سکھیرے کا کوئی فرد ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔
آخری قتل ملک رحمت علی کا ہوا تھا۔ بدلہ اب فضل نے لینا تھا لیکن اس نے یہ روائت توڑ دی تھی۔ اس نے قتل و غارت کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اس نے باپ کا خون سکھیروں کو معاف کر کے دوستی اور امن کی راہ ہموار کی تھی۔
لیکن
لیکن
اب تاج سکھیرا پھر فضل سے ٹکرا گیا تھا۔
نجو نے گھبرا کر بیگاں کو دیکھا۔ جس کا رنگ بجھا بجھا سا تھا۔ اور

جس کی آنکھوں میں حیرانی پھیلی ہوئی تھی۔

"اس سکھیرے کی موت نے اسے فضل کی راہ میں لا کھڑا کیا ہے بیگاں" نجو کئی لمحوں کے سکوت کے بعد کہا "ہم نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ ان سے لینا ہے نا۔ باری ان کی ہے۔ فضل نے صلح اور آشتی کی جو راہ اختیار کی تھی۔ لگتا ہے سکھیروں کو راس نہیں آئی ——"

"وہ بڑا کمینہ بندہ ہے نجو" بیگاں صرف اسی قدر کہہ سکی۔

"ہم نپٹنا جانتے ہیں" وہ سینہ تان کر بولی۔

"رب رحم ہی کرے۔ میرا تو دل اسی دن سے ڈوبا رہتا ہے"

"تو بزدل ہے —— حوصلہ رکھ —— تو ملک فضل کی منگ ہے —— اس چن کی چودھویں کو اس کی بیوی بن جائے گی —— پھر تو دیکھے گی۔ وہ کتنا بہادر —— کیسا جیالا اور عزت کا کتنا بڑا رکھوالا ہے"

بیگاں نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا —— نجو اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

باہر دالان میں بیٹھے فضل اور بیگاں کے بزرگ شادی کا دن اور لین دین کا مسئلہ طے کر رہے تھے۔

بیگاں کی بے بے چاہتی تھی۔ تیاری کے لئے کم از کم ایک مہینہ تو مل جائے "بھئی آٹھ دنوں میں ہم لوگ کیا کچھ کریں گے —— فضل نے تو اتنی جلدی شادی کرنے کا حکم دے بھیجا ہے۔ جیسے یہ گڈی گڈے کا کھیل ہو"

"بس یہی سمجھو ——" مائی رابو بولی "شادی اس چن کی چودھویں کو طے ہے۔ جہیز تو تم نے اتنے عرصے سے تیار کر رکھا ہے"

"پھر بھی ـــ ماسی جہیز کی سوئی سلائی ہی ـــــ" بیگاں کی بے بے نے کہا۔

"کوئی بات نہیں اپنی بیٹی ہے۔ ساری عمر لینا ہی ہے اس نے" تایا ظہور بولے۔

"چلو جی جو کچھ ہو سکے گا کر دینا۔ کون سے غیر ہیں سوہرے۔ پھر جلدی میں یہی کچھ ہو گا ـــ" تائی حلیمہ نے کہا۔

بیگاں کی بے بے تو دھوم دھام کی قائل تھی۔ نمبردار بشیر کی بیٹی کی شادی ہو اور چرچے نہ ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ جہیز تو اس نے بیشک اک عرصے سے تیار کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی تیاری کے لئے وقت چاہیئے تھا ـــــ

اب یہ لوگ مصر تھے۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

کپڑا لتا تیار تھا۔ سو بستر بھی اس نے بنا کر پیٹیوں میں ڈال رکھا تھا۔ سوا سیر سونا بھی بیگاں کے حصے کا الگ پڑا تھا۔ بھوری کے لئے گوٹے والی چادر اور ماتھے کا سونے کا ٹکہ بھی پچھلے ہفتے ہی بنوایا تھا۔ رنگین چارپائیاں بھی منگوا رکھی تھیں برتن بھانڈہ بھی کافی تھا ـــــ پوری پوری نہ سہی کچھ نہ کچھ تیاری ہو ہی سکتی تھی۔

بالآخر اسے ماننا ہی پڑا ـــ تاریخ مقرر ہو گئی ـــ سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ فضلاں گرم گرم دودھ گلاسوں میں ڈھال کر لے آئی۔ بیگاں کا بھائی تازہ تازہ جلیبیاں لے آیا۔ مبارک سلامت کے شور میں دودھ اور جلیبیاں سب نے مزے سے کھائیں۔

دن مقرر کر کے نجو سب کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔ پنڈ میں سب کو خبر ہو گئی۔ نائی مراثی گھر گھر جا کر پیغام دے آئے۔

زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں — دن کام میں گزرتا اور سر شام گاؤں کی الڑ مٹیاریں جمع ہو جاتیں۔ گانے گائے جاتے۔ سوانگ بھرے جاتے — نجو بھی ہر بات میں بھرپور حصہ لیتی۔ اس نے تو کیسری گوٹے والے کپڑے اسی دن سے پہن لئے تھے۔ جس دن تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ وہ گاتی ناچتی۔ ہنستی۔ مسکراتی۔

لیکن رات جب یہ سارے ہنگامے سو جاتے۔ تو وہ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتی۔ اک نامعلوم سا دھڑکا جی کو لگا رہتا تھا — اک وسوسہ سا پریشان کرتا رہتا تھا۔

علما کوٹھی کے بیرونی لان میں گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ مالی پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ کچھ پنیریاں لایا تھا۔ وہ بھی کیاریاں ٹھیک کر کے لگا رہا تھا۔ علما اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کام کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔

تاج ابھی تک بستر میں تھا۔ پسلیاں دُکھتی تھیں۔ زیادہ چلنے پھرنے سے ریڑھ کی ہڈی میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن پسلیوں اور ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف ابھی اسی طرح تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے رات کو درد بڑھ جاتا تھا۔ گل پروشے اور علما اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

علما ابھی اسے ناشتہ کروا کے باہر آیا تھا۔ کئی دِنوں سے وہ گاؤں جانا چاہ رہا تھا۔ لیکن مالک کی وجہ سے نہ جا سکتا تھا۔ اس وقت مالی بابا سے بھی وہ یہی باتیں کر رہا تھا۔

"چوہدری صاحب کی وجہ سے پنڈ جا ہی نہیں سکا۔ خدا کرے

وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں تو چکر لگا آؤں ——"

"چل پھر نہیں سکتے صاحب" مالی نے پوچھا

"اُٹھتے ہیں۔ لیکن زیادہ چلیں تو تکلیف ہوتی ہے"

"اس کا مطلب ہے خاصی چوٹیں آئی ہیں"

"ہاں"

"اللہ رحم کرے"

"آمین ——"

"سردیوں میں چوٹ ——"

"السلام علیکم" مالی کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیاری کے پرلی طرف ایک تنومند دیہاتی نے زوردار سلام مارا —— تو علمے نے حقہ منہ سے ہٹاتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا —— پھر خوشی سے اچھل پڑا —— ایک دم اٹھا کیاری پھلانگی اور آنے والے سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولا "آ —— بیلیا —— کیسے آنا ہوا"

"شہر آیا تھا۔ تجھ سے ملنے کو جی چاہا ادھر ہی آگیا" مصافحہ کرتے ہوئے رحمونائی بولا ——

"آ بیٹھ ——" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر لان میں لے آیا —— دونوں نکھری دھوپ میں لان کے مخملیں فرش پر آمنے سامنے بیٹھ گئے —— علمے نے حقے کی نے اس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا

"سنا سب خیر خیریت ہے نا"

"ہاں۔ فضل ہے مولا کا —— تو چنگا شہری بن گیا۔ دل ہی نہیں کرتا پنڈ آنے کو ——"

"بس مجبوری ہے رحمو۔ ورنہ اپنی دھرتی سے بچھڑنے کو کس کا دل کرتا ہے"

"چوہدری صاحب خیر خیریت سے ہیں ؟"

"ہاں ـــ ویسے تو خیر خیریت سے ہی ہیں ۔ کچھ طبیعت خراب ہے ان کی ۔ اسی لئے تو میں گاؤں نہیں آیا ـــ"

دونوں باتیں کرنے لگے۔ احمد حقے کے دو تین کش لے کر نے علمے کی طرف پھیر دیتا اور علما کش لینے کے بعد رحمو کو حقہ پیش کرتا۔ علمے نے چائے پانی بھی پوچھا رحمو نے ملائمت سے انکار کر دیا۔

دونوں گاؤں کی باتیں کرنے لگے ـــ "علمے وہ چوہدری اکبر تھا نا ـــ"

"ہاں ہاں ـــ پپلاں والی کا چوہدری"

"ہاں وہی"

"کیا ہوا اسے"

"کل فوت ہو گیا"

"او ہو ہو ـــ کیا ہوا تھا اسے"

"پیٹ ہی میں درد اُٹھا ـــ پتہ ہی نہ چل سکا اسے کیا ہوا ـــ بیچارہ ـــ اچھا آدمی تھا عمر بھی تو کچھ زیادہ نہ تھی"

"بالکل جوان تھا ابھی"

"بڑا ہی افسوس ہوا ۔ کل جنازہ اٹھا تو قیامت مچ گئی ۔ کئی پنڈ جنازے میں شریک ہوئے ۔"

"ہاں بھئی ۔ اچھا بندہ تھا ۔ رشتہ داری ۔ دوستی ۔ میل میلاپ ۔

کون رہ سکتا ہے ایسی خبر سُن کر ——"

رحمو قدرے آگے ہو کر کچھ راز داری کے انداز میں بولا "بڑی بات تو پتہ ہے کیا ہوئی کل ——"

"کیا" علمے نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

"جنازے میں سارے سکھیرے اور ملک شریک ہوئے۔ چوہدری رفیق اور شفیق تو ملک فضل کے سنگ ہی رہے سارا وقت"

"اچھا؟"

"ہاں پنڈ کے لوگ ان کو ساتھ ساتھ دیکھ کر واقعی خوش ہوئے۔ شکر ہے پُرانی دشمنی تو ختم ہوئی"

علما سوچ میں ڈوب کر صرف ہوں کہہ سکا۔

"اب ملک فضل کی شادی ہے ——" رحمو نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھا۔

"کب؟" علما چونک کر بولا۔

"اس چن کی چودھویں کو برات ہے۔ برات دو دِن کوٹلی رہے گی —— پھر تیسرے دن ولیمہ ہے۔"

"اچھا"

"بڑے ٹھاٹھ کا ویاہ ہوگا علمے۔ وہ تیاریاں ہو رہی ہیں وہ تیاری کہ کیا بتاؤں"

"پنڈ کے مانے ہوئے چوہدری ہیں دونوں طرف —— وہ شادیاں دھوم سے نہ کریں گے تو کیا ہم تم کریں گے بھئی ——"

"ہاں علمے —— وہاں تو ابھی سے دیگیں پکنا شروع ہو گئی ہیں۔

حلوائی گھر بٹھا لیا ہے ۔ وہڑیاں (جوان بھینسیں) ذبح ہو رہی ہیں۔ لوگ صبح شام وہیں کھاتے پیتے ہیں ۔ جو چلا جائے پیٹ بھر کر کھانا کھا آتا ہے ——"

"دل کی بھی بات ہوتی ہے رحمو —— دوسروں کو کھلایا یونہی نہیں جاتا ——"

"ملک اچھا بندہ ہے"

"ہوں"

"سوہرے بھی اچھے ملے ہیں —— وہاں بھی دھوم دھڑکا شروع ہے ۔ سُنا ہے داج تو جو ہوگا سو ہوگا ۔ دو مربعے زمین بھی لڑکی کو دے رہے ہیں"

"واہ وا —— موج ہوگئی ملک فضل کی"

"ساری واہی وال زمین ہے بڑی فصل دیتی ہے"

"ہاں ہاں ——"

رحمو آدھ گھنٹہ وہاں رہا اور کوٹلی ۔ پپلاں والی اور ہڈیالے کی کئی خبریں علمے کو سنا گیا۔

علمے کے لئے سب سے اہم خبر ملک فضل کی شادی تھی ۔

اسی دن علما جب چوہدری تاج کے پاؤں دبا رہا تھا۔ کوئی گاؤں کی بات ہوئی ۔ تو اس نے چوہدری اکبر کے مرنے کی خبر تاج کو سنائی۔

"نہیں نہیں" تاج کو یقین نہیں آیا ۔

"اللہ دی قسمیں چوہدری جی ۔ رحمو نائی بتا گیا ہے"

"رحمو نائی"

"اپنا یار بیلی ہے پپلاں والی کا رہنے والا ہے۔ کبھی کبھی شہر آتا ہے تو ملے بغیر نہیں جاتا"

"پپلاں والی" تاج زیرِ لب بڑبڑایا "ملکوں کے پنڈ کا"

"ہاں جی — ملک فضل کی شادی کا بھی بتا گیا ہے — وہ ——"

اس کی پوری بات سُنے بغیر تاج اچھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "کیا کہا؟"

"ملک فضل کی شادی کا بھی بتا کر گیا ہے"

"ہوں" وہ خوفناک طریق سے پھنکارا — "شادی کر رہا ہے وہ ——"

"جی — جی — چوہدری جی — اس چاند کی چودھویں کو برات ہے۔ رحمو بتا رہا تھا۔ بڑی رونقیں ہیں بڑی گہما گہمی ہے"

تاج نے مٹھیاں بند کر کے پلنگ کی پٹی پر زور زور سے ماریں۔ دانت بھینچ لئے۔ اس کی آنکھوں میں درندوں کی آنکھوں کی سی چمک لہرائی۔

"وہ سمجھتا ہے۔ مجھے مات دے لے گا — ہونہہ —— میں تاج ہوں تاج —— سکھیرا"

علما اس کی وحشیانہ حرکت اور بھڑکے ہوئے جذباتی جملوں کو سن کر کانپ گیا۔

"چوہدری صاحب ——"

"علمے"

"جی"

"بیگاں کا ڈولہ فضل کے گھر نہیں جائے گا" ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاج نے خونخوار انداز میں کہا۔

علما پوری آنکھیں کھول کر تاج کو دیکھنے لگا۔

تاج عالم اضطراب میں کبھی بستر میں لیٹ جاتا۔ کبھی مٹھیاں کس لیتا۔ کبھی خوفناک سی پھنکار میں "ہو ہخ" کہتا اور کبھی بڑبڑانے لگتا۔

اور

پھر

اسی شام اس نے اپنے دو تین ہم پیالہ ہم نوالہ دوستوں کو بلا بھیجا رات گئے تک یہ دوست بند کمرے میں بیٹھے رازداری سے باتیں کرتے رہے۔

فضل جب بڑی سڑک سے گاؤں جانے والی نسبتاً کم چوڑی سڑک پر آیا تو شام کے دُھندلکے پھیل چکے تھے۔ آج اسے کئی ضروری کاموں کے لئے شہر جانا پڑا تھا۔ یوں تو اس کے کامے (نوکر) اور رشتے کے بھائی ماموں تائے چاچے سبھی کام کر رہے تھے۔ شادی کے سلسلے میں تو ساری ذمہ داری انہیں لوگوں نے اٹھائی تھی۔ وہ تو صرف پیسہ دے دیتا تھا۔ باقی سب کچھ یہی لوگ کرتے تھے۔ کوئی شہر سے چیزیں لا رہا ہے۔ کوئی گاؤں میں چیزوں کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ کوئی دودھ اکٹھا کر رہا ہے۔ کوئی گھی کے ٹین لا رہا ہے۔ عورتیں اعلےٰ باسمتی کے چاول چھان پھٹک رہی ہیں۔ حویلی کی لیپا پوتی کر رہی ہیں — مل جل کر سارے کام ہو رہے تھے۔

فضل کو آج شہر آڑھتیوں کے پاس جانا پڑا تھا۔ گڑ اور چاول کے ہزاروں روپے کا حساب کتاب تھا۔ پیسہ تو اس نے دوپہر ہی کو وصول کر لیا تھا۔ اس کے بعد بازار چلا گیا تھا۔ نجو کی کئی فرمائشیں تھیں۔

پٹینٹ کی دو گرگابیاں لینی تھیں۔ ایک نجو کے لئے دوسری بیگاں کے لئے۔ دو دن پہلے نجو رتو کی اماں کے ساتھ آئی تھی اور گرگابیاں پسند کر گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ زیور بھی بننے کو دے رکھا تھا۔ وہ بھی لینا تھا۔

یوں سارے کام نپٹاتے سہ پہر اتر آئی —— اور گاؤں کی اس سڑک پر آتے آتے شام کے دھندلکے پھیل گئے۔

سڑک کا یہ حصہ ویرانے میں سے گزرتا تھا۔ دونوں طرف غیر آباد زمینیں تھیں۔ جن پر جنگلی پودوں کی بھرمار تھی۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور درختوں کے کئی جھنڈ ایسے تھے۔ جن کے تلے دن کو بھی اندھیرا ہی رہتا تھا —— اسی سڑک سے آگے چل کر چار گاؤں کو راستے نکلتے تھے —— اور یہ سڑک سیدھی جا کر کسی اضافی سڑک سے مل جاتی تھی۔

فضل کی سفید گھوڑی اپنی مخصوص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ کہ اچانک کسی نے فضل کو للکارا ——

"او ملکے"

اک جھٹکے سے فضل نے گھوڑی کے لگام کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا۔

"کون ہے —— اوئے" فضل کی جوابی آواز سنسان فضا میں گونج گئی ——

"تیری اجل" جواب آیا۔

"تو پھر سامنے آ" فضل نے اپنے ڈب میں رکھی ہوئی پستول پر ہاتھ رکھا۔ ان دنوں وہ بھرا ہوا پستول اپنے پاس رکھتا تھا۔ سکھیرے

سے اس دن والا جھگڑا ذہن میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کمینے دشمن سے کوئی بات بھی متوقع تھی۔ اس لئے حفاظت کے لئے وہ ہر وقت اپنے ساتھ پستول رکھتا تھا ——

تاج کی طرف سے اسے کل بھی ایک دھمکی کا پروانہ ملا تھا۔ رقعے پر نام و مقام تو درج نہیں تھے صرف یہی لکھا تھا "بیگاں سے دستبردار ہو جاؤ ورنہ"

اور

فضل کو بغیر نام و مقام کے پتہ چل گیا تھا۔ کہ رقعہ بھیجنے والا کون ہے۔ فضل چاہتا تو اس رقعے کا جواب شہر تاج کی اقامت گاہ پر پہنچ کر دے سکتا تھا۔ اس کے خون میں بھی جوش تھا اور بے غیرت بن کر جینے سے مر جانے کو بہتر سمجھتا تھا۔

لیکن

وہ ابھی کوئی جھگڑا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیگاں کو جب تک بیاہ کر گھر نہ لے آتا۔ اسے صبر و تحمل سے کام لینا تھا —— اس کے بعد ؟

اس کے بعد

فضل کے ذہن میں بھی کئی منصوبے تھے۔ اپنے باپ کا خون کبھی کبھی ایسی للکار بن کر ذہن میں گونجتا کہ فضل کو اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔

اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے اور اس تنازعے کو نپٹانے کے لئے اس کے ذہن میں بھی خونی منصوبے پل رہے تھے۔

دشمن نے ابھی اسے للکارا تھا۔ فضل جان گیا تھا۔کہ یہ خود تاجا ہے یا تاجے کے کرائے کے غنڈے۔ اور تو اس کی کسی سے دشمنی ہی نہیں تھی۔ اور ان راستوں سے وہ ہزاروں نہیں لاکھوں بار گزرا تھا۔ یہ تو دھندلکے پھیلاتی شام تھی۔ وہ تو ان راہوں سے بالکل اکیلا اور نہتا آدھی رات کو بھی گزرا تھا۔

فضل گھوڑی کی لگامیں کھینچے سڑک کے عین درمیان رکا ہوا تھا "اترا گھوڑی سے" جھاڑیوں کے پیچھے سے پھر آہنی آواز آئی "او ہمت ہے تو سامنے آ —— بزدلوں کی طرح چھپ کر کیوں للکار رہا ہے ——" فضل نے زور دار آواز میں کہا دونوں سمت کی جھاڑیوں سے دو نقاب پوش ڈاکو پھلانگ کر سڑک پر اس کے عین سامنے آگئے —— ان کے ہاتھوں میں بلم تھے ——

فضل نے لگامیں پھینک کر گھوڑی سے اڑتی ہوئی چھلانگ لگائی —— اور دونوں کے درمیان آن کھڑا ہوا —— ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے دائیں ہاتھ والے نقاب پوش کی ٹانگ میں ٹانگ اڑائی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ فضل نے اسی اثنا میں دوسرے پر حملہ کر دیا۔

جھک کر اس نے گرے ہوئے ڈاکو کی بلم اٹھائی۔ اور پھر باقاعدہ بلموں سے لڑائی شروع ہو گئی ——

گرا ہوا بدمعاش بھی کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب فضل کا ایک نہیں دو سے مقابلہ تھا۔ فضل نے پستول نکال لیا۔

سچائی اور حق کی قوت فضل کے ساتھ تھی۔ ویسے بھی بڑا جی دار اور بہادر آدمی تھا — چند منٹ کی لڑائی کے بعد ایک ساتھی تو بھاگ نکلا — دوسرے کو فضل نے قابو کر لیا — یہ بدمعاش زخمی ہو گیا تھا — بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس لئے مقابلے کی ہمت نہ تھی۔

فضل نے اسے زور دار دھکا دیا "دفع ہو جا — کرایے کے غنڈے۔ تجھے پتہ نہیں کس سے واسطہ پڑا ہے —"

پھر اس نے تانجے کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے کہا "تانجے کو کہنا کالک مل نے منہ پر — ملکوں سے دو دو ہتھ کرنا آسان نہیں — تو م کے رکھ دوں گا اس کے سارے قبیلے کو — کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔"

دونوں حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ پستول دیکھ کر تو دونوں حواس باختہ ہو گئے تھے۔

فضل نے کپڑے جھاڑے۔ پستول ڈب میں رکھا۔ اور اُچک کر گھوڑی پر بیٹھ گیا۔ گھوڑی کی گردن کو پیار سے تھپتھاتے ہوئے اس نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

گھوڑی صاف سڑک پر سینہ تان کر چلنے لگی۔

فضل گھر پہنچا۔ تو چراغ جل چکے تھے۔ گھر اور گلی میں گہما گہمی تھی۔ لڑکیاں بالیاں ہرے پیلے لال اور نیلے آنچل لہراتی پھر رہی تھیں۔ دیگیں اتاری جا چکی تھیں۔ اور اینٹوں کے بنے عارضی چولھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

صحن بھی لوگوں سے بھرا تھا - چارپائیاں بچھی تھیں - حقے گڑگڑا رہے تھے - اونچی اونچی آوازوں میں باتیں ہو رہی تھیں - کوئی کسی کو چھیڑ رہا تھا - کوئی پرانے قصّے دہرا رہا تھا - کسی کو اپنی شادی کے واقعے یاد آرہے تھے - کوئی دوسری کی شادی کے لطیفے سُنا رہا تھا —

عورتیں دالان میں جمع تھیں - گوٹے کناری والے آنچل لہرا رہے تھے - ڈھولک پیٹی جا رہی تھی - قہقہوں اور تالیوں کی گونج تھی - نجو نے لال گوٹے کے جال والا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا - وہ بھی سب لڑکیوں کے ساتھ گا بجا رہی تھی -

لیکن بار بار اس کی نظریں فضل کے انتظار میں دروازے کی جانب اُٹھ رہی تھیں — اس کا دل اس کے دیر سے آنے پر ڈانواڈول ہو رہا تھا — خوشی کے بھرپور لمحوں میں بھی دِل میں وسوسہ جاگ رہا تھا -

اور

جب

فضل صحن میں آیا تو وہ دیوانہ وار باہر دوڑی — فضل سے لپٹ گئی — "تُو نے اِتنی دیر لگا دی ویر — کبھی تو سوچا کر کہ تیری بھین تیرے انتظار میں کیسے گھڑیاں گزارتی ہے"

"بھین بھلی ہو تو اس کا میں کیا کروں" فضل نے دِلی پیار سے اسے سینے سے لگا کر اس کا سر تھپکا —

اردگرد کھڑے بیٹھے لوگ بہن بھائی کے اس پیار سے بہت

متاثر ہوئے۔ لیکن مائی جیناں ہنس کر بولی " بھیناں سنگ اتنا پیار نہ پا فضل۔ یہ تو اڈتے پکھیرو ہیں —— کل کو اسے بیاہ دے گا —— تو کیسے رہے گا اس کے بغیر —— اور کیسے رہے گی تیرے بغیر ——"

اور

بھابی زینبے ہنس کر بولی " اسی لئے تو بیاہ نہیں کرتا یہن کا ——"

"نہیں بھابی ——" جلدی سے فضل نجو کو الگ کرتے ہوئے بولا " انشاء اللہ اگلے جن میں اس کی ڈولی اٹھاؤں گا"

"ہیچ۔" کئی آوازیں آئیں۔ نجو شرما کر بھاگ گئی ——

"ہاں" فضل نے کہا

"رشتہ طے کر لیا ہے" کسی نے پوچھا

"بس کر ہی لیا ہے" فضل نے دوسری چارپائی کے قریب کھڑے راجو کی طرف ہنس کر دیکھا۔

"کہاں — کہاں کیا ہے۔ ——" کئی آوازیں آئیں۔

فضل نے آگے بڑھ کر راجو کا ہاتھ پکڑ لیا — اور قدرے اونچا کرتے ہوئے بولا۔

"راجو میری بانہہ ہے"

کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ فضل نے نجو اور راجو کے بندھن کا یہ غیر رسمی سا اعلان کر دیا۔

ہاں راجو کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا —— اور وہ بے اختیار

جذبوں کی شدّت سے مغلوب ہو کر فضل سے لپٹ گیا۔

کچھ لوگ بے انتہا خوش ہوئے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔ یہ بے جوڑ سا میل انہیں پسند نہ آیا۔

لیکن فضل اور راجو دونوں ہی خوش تھے۔

"بجو"

"کون - راجو ہے!"

"ہاں"

"کیوں"

"کہاں جارہی ہے"

"تجھے پتہ چل گیا تھا۔ کہ میں کہیں جارہی ہوں"

"کہتے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"

"اے ہے — بڑا آیا کہیں سے — رتو یا شادو نے بتا دیا ہوگا"

"اوں ہوں"

"پھر"

"پھر مجھے یقین تھا۔ کہ آج تُو شام سے پہلے ادھر ضرور آئے گی —"

"یقین"

"ہاں"

"واہ ——"

"ہاں بجو - آج تیرے دیر کی برات ہے نا - اور مجھے پتہ تھا۔ تو درگاہ میں چڑھاوا چڑھانے ضرور آئے گی"

"اچھا - تو تو میرے انتظار میں یہاں بیٹھا تھا"

"ہاں"

"جو میں نہ آتی تو ——"

"کیسے نہ آتی - سب لڑکیاں اپنے ویروں کی برات سے پہلے یہاں چڑھاوا چڑھانے آتی ہیں —— اور تیرا تو ویر تیرا پیارا بھی بہت ہے"

بجو نے اک گہری سانس لی اور سر جھکاتے ہوئے بولی "ہاں راجو۔ بہت پیارا اور بہت عزیز ہے میرا بھائی مجھے —— آج اس کی جنج ہے - وہ بیگاں کو بیاہنے جا رہا ہے —— دعا کرو خیر خیریت سے وہ بیگاں کو لے آئے"

راجو نے غور سے بجو کو دیکھا - اس کا چہرہ خوشی سے دمک نہیں رہا تھا - اک نمعلوم سی اداسی اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی -

راجو نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "ویر کی برات ہے اور تو اتنی اُداس کیوں ہو رہی ہے"

"نہیں اداس تو نہیں" اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور درگاہ کے احاطے کی کچی دیوار پر بیٹھ گئی - اس کے ہاتھوں میں آٹے کے دیئے

تھے۔ جن میں گھی ڈال کر روٹی کی — بتیاں ڈالی ہوئی تھیں — اس نے پانچ دیوں والا تھال بھی دیوار پر رکھ لیا۔

راجو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے نجو"

"کچھ نہیں"

"پھر تو اتنی اُداس کیوں ہے"

"راجو"

"ہاں"

"آج مجھے اپنی ماں اور اپنا باپ بہت یاد آرہے ہیں —" وہ بے اختیار ہو کر گلوگیر آواز میں بولی۔

راجو نے بھی سر جھکا لیا — پھر آہستگی سے سر اٹھا کر نجو کو دیکھا جو آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"آج میری ماں ہوتی — یا باپ ہی ہوتا تو —" اس نے سسکی بھری۔

"نجو" راجو جلدی سے بولا "تُو تو بڑی بہادر ہے۔ تیری آنکھوں سے آنسو بہتے اچھے نہیں لگتے — پگلی — اس میں رونے کی کیا بات ہے"

"بس راجو۔ پتہ نہیں کیوں۔ دل بار بار بھر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب روؤں"

"بدشگنی نہ کر نجو — پونچھ لے آنسو۔ خوشیاں منا — ماں باپ کی قسمت میں یہ دن دیکھنا نہیں تھا — رب کی

یہی مرضی تھی "

"ہاں" اس نے اک گہری سانس لی۔ اور آنسو پونچھ لیئے۔

"چل درگاہ میں دئے رکھ کر دعا مانگ — خدا تیرے بھائی کو یہ خوشی نصیب کرے — وہ پھلے پھولے — اور اپنی بیگاں کے ساتھ زندگی کی بہاریں لوٹے"

"آمین"

نجو دیوار سے اتر کر دیوں والا تھال اٹھاتے ہوئے بولی "ہاں میں دئے رکھ کر دعا کرنے ہی تو آئی ہوں — تو بھی دعا کر راجو میرے ویر کی خیر ہو"

"خیر ہوگی — سب خیر ہوگی —"

"اچھا میں اندر جا رہی ہوں۔ تو بھی چلا جا — لوگ آ جا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا —"

"باتیں بنائیں گے"

"اب کسے پرواہ ہے۔ بنانے دے"

"واہ وا — اب کیا ہوگیا"

"راجو تیرا ہوگیا۔ تو راجو کی ہوگئی۔ فضل نے ساری برادری میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "راجو میری بانہہ ہے —"

نجو مسکرائی۔ اور پھر نظریں جھکاتی ہوئے بولی "بانہہ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تو —"

"ہاں ہاں — ہاں" راجو شوخی سے بولا — "اب تو

دنیا کی کوئی طاقت تجھے مجھ سے چھین نہیں سکتی ــــ"

"ہاں راجو ــــ" نجو نے آہستگی سے کہا "میرا دِیر میری خوشیاں میری آنکھوں میں پڑھ لیتا ہے۔ اس نے یہ رشتہ دل سے منظور کر لیا ہے ــــ"

"یہ میری دعاؤں کا نتیجہ ہے نجو۔ تُو کیا جانے ــــ اس درگاہ پر میں نے آدھی آدھی رات کو آکر اپنے رب سے کتنی دعائیں مانگی ہیں ــــ میں اس قابل تو نہیں تھا۔ پر میرے مولا نے میرے پیار کی لاج رکھ لی ہے"

"بہت پیار کرتا ہے مجھ سے" نجو نے قدم اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"یہ تو جب تو اگلے جنم میری بن جائے گی اس وقت بتاؤں گا" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

نجو نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ اور دیئے اٹھائے درگاہ کی کچی پکی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔

نجو نے بڑی عقیدت سے دیئے مزار کے سرہانے رکھ دیئے۔ پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ــــ آج جانے اسے کیا ہو رہا تھا۔ اداسی اندر ہی اندر کٹار بن کر اتر رہی تھی ــــ دِل بیٹھا جا رہا تھا ــــ بار بار اسے اپنی بے بے یاد آ رہی تھی۔ ابا یاد آ رہا تھا۔

دُعا مانگتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے آنکھیں بند کئے آنسوؤں سے نڑگالوں

سے وہ دعا مانگ رہی تھی —
کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی۔
گھر میں برات کے لئے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ مہمانوں کا شور و غل تھا۔ بیٹھک میں بھی لوگ تھے۔ صحن میں بھی، گلی میں بھی —
برات نے کوٹلی جانا تھا — لوگوں کی سہولت کے لئے شہر سے تانگے بگھیاں منگوائی گئی تھیں۔ گھوڑے بھی سجائے گئے تھے۔ بیل گاڑیوں کو بھی آراستہ کیا گیا تھا۔ برات چونکہ رات کو جانا تھی اس لئے روشنی کے لئے شہر سے بڑے بڑے گیس منگوائے گئے تھے۔
سب لوگ تیاری کر رہے تھے۔ شام ڈھلے برات نے روانہ ہونا تھا۔ ابھی دن کی روشنی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں دالانوں میں بھری تھیں۔ کچھ رسمیں ہونا تھیں — فضل کو دولھا بن کر گھوڑے پہ بیٹھنا تھا۔ نجو نے باگ پکڑ کر بھائی سے باگ پکڑوائی لینا تھی۔ رشتے ناطے کی سب بہنوں نے فضل سے باگ پکڑائی لینا تھی۔ بھابیوں نے سُرمہ ڈالنے کی رسم کرنا تھی۔
اِسی لئے سب تیار ہو رہی تھیں — افراتفری سی مچی تھی۔ کوئی کپڑے بدل رہی تھی۔ کوئی کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ کوئی بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ اور کوئی آنکھوں میں کاجل کے دوڑے لگا رہی تھی — چوہدرانیاں جمع تھیں۔ سر سے پیر تک

سونے میں پیلی ہو رہی تھیں۔
نجو بھی دالان میں آگئی۔ جیلاں نے اس کے کپڑے کھونٹی سے لٹکا دئے تھے۔ خوب بھاری چمکیلے کام والے کپڑے تھے۔ رتو کی ماں کے ساتھ شہر جاکر وہ خود بنوا کر لائی تھی۔ جارو زیور کا ڈبہ پکڑے کھڑی تھی۔ نجو نے کپڑے بدل کر زیور بھی پہننا تھا۔

تاج کی پسلیوں میں ابھی تکلیف تھی - وہ زیادہ چلنے پھرنے کے
قابل نہیں ہوا تھا۔ مالش۔ ٹکور اور ڈاکٹر ایم بی ہسٹنگز کی تجویز کردہ
دوائیاں بھی کھا رہا تھا - ڈاکٹر نے زیادہ ہلنے جلنے سے منع کر رکھا
تھا ——

تاج ان ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ اب وہ دوستوں
کو بھی گھر پہ ہی بلا لیتا۔ پینے پلانے کا بھی یہیں اہتمام ہوتا ——
کبھی کبھی کوئی بازاری حسینہ بھی یہیں آجاتی -

گل پروشے تاج کی یہ ساری حرکتیں دیکھ رہی تھی - اسے کب
یہ سب کچھ پسند تھا۔ وہ تو ایک پرامن گھر کی شدت سے خواہاں
تھی - جہاں وہ ہوتی، تاج ہوتا اور اس کے پھول ایسے پیارے
پیارے بچے ہوتے -

لیکن

یہ خواب چکنا چور ہو چکے تھے - ان ٹوٹے پھوٹے بکھرے بکھرے

خوابوں کی کرچیاں گل پروشے کے حساس دل میں چبھتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی جنت کی متلاشی تھی۔ اس کے اندر کی عورت تلملاتی تھی۔ اپنا حق مانگتی تھی۔ اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی محبت پر کسی دوسرے کو حق جماتے دیکھ کر بگڑ جاتی تھی۔ تڑپ جاتی تھی۔ اور انتقام کی بھٹی بھڑک اٹھتی تھی۔

ویسے گل پروشے کو جب سے تاج نے سوات واپس چھوڑ آنے کی دھمکی دی تھی۔ وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ اس نے اپنے اندر کی عورت کی آواز پر کان نہیں دھرا تھا۔

تاج کی خدمت کرنے میں اس نے کوتاہی نہیں کی تھی — بے لوث خدمت کر رہی تھی — اس کی ہر زیادتی برداشت کر رہی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی۔ کہ کبھی کبھی تاج اس سے ہنس بول لیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹا رہتا — رات اپنے بیڈروم میں ہی سونے کے لئے کہہ دیتا۔

لیکن

دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے سے دور ہی دور تھے — گل پروشے کے خوابوں کی جنت تہس نہس ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سہ پہر بڑی سرد تھی۔ مطلع کئی دنوں سے ابر آلود تھا۔ برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دھوپ کی حدت تو جیسے ختم ہی ہو گئی تھی۔ کمروں میں ابھی سے تپش کے لئے لکڑیاں جلا دی گئی تھیں۔ آتش دانوں میں دھڑا دھڑ آگ جل رہی تھی۔

تاج کا کمرہ تو خاصہ گرم تھا ——
گل پروشنے اس کے لئے چائے بنا کر لائی - تاج باتھ روم میں تھا. وہ ٹرے میز پر رکھ کر آتش دان کے قریب ہو بیٹھی ——
تاج کمرے میں آیا. تو گل نے اس کی طرف دیکھا. وہ کئی دنوں کے بعد کہیں جانے کو تیار ہو کر باہر آیا تھا.
گل پروشنے اس کے لئے چائے بنا کر لائی - تاج باتھ روم میں تھا. وہ ٹرے میز پر رکھ کر آتش دان کے قریب ہو بیٹھی -
تاج کمرے میں آیا. تو گل نے اس کی طرف دیکھا. وہ کئی دنوں کے بعد کہیں جانے کو تیار ہو کر باہر آیا تھا.
"کیوں سردار ——" گل نے حیران ہو کر پوچھا
"کیوں ؟" وہ بولا.
"کدر جاتا ہے"
"ہاں"
"ڈاکٹر کے پاس"
"نہیں"
"اور کدر"
"گاؤں"
"گاؤں — ؟"
"ہاں"
"کیوں"
"کام ہے"

"کیسا کام ہے۔ تم ابھی ٹیک نیئس ہوا۔ تمارا پسلی ــــــ"

"سب ٹھیک ہے"

"اس وقت کیوں جاتا ہے۔ بار دیکو کتنا سردی ہے۔ سے ور دبڑھے گا سردار ــــــ"

"جانا ضروری ہے سمجھیں"

گل نے دیکھا تاج کی آنکھوں میں شیطانی سی چمک اور خوفناک سا ارادہ تھا۔ وہ گھبراکر اٹھ کھڑی ہوئی ــــــ

"آج وہاں ایک شادی ہے" وہ جیسے گل سے نہیں کسی اور سے مخاطب تھا۔

"شادی"

"ہاں میرے سب سے بڑے دشمن کی شادی۔"

"سردار ــــــ"

"ہاں"

"تم اُدر کیا کرے گا ــ سردار ــــــ"

"شادی میں شرکت کروں گا گل پروشے۔ ملکوں نے سکھیروں کو اس شادی میں شرکت کی دعوت دی ہے ــــــ"

تاج کھلکھلا کر ہنس پڑا ــــــ اس کے قہقہوں میں وحشیانہ پن تھا۔ درندگی تھی ــــــ

"سردار"

"لاچائے بنا"

"سردار تمارا صحت ٹیک نیئں ہے۔ اتنا تکلیف ہے۔ مت جاؤ

اس وقت وہ پھر ہنسا اور بولا " وہاں میرا حاضر ہونا بہت ضروری ہے ——"

گل چپ ہو گئی ——

" چائے بنا دے " تاج نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گل نے چائے بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ اپنے لئے اس نے چائے نہیں بنائی اس کے ذہن میں متضاد سوچیں تھیں۔

کئی دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ کہ تاج اور اس کے چند اوباش دوست بند کمرے میں بیٹھ کر صلاح و مشورے کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ تو نہ جان پائی تھی۔ کہ صلاح مشوروں کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس کبھی کبھی ضرور جاگتا تھا۔ کہ کسی تخریبی عمل کے پروگرام بنتے ہیں۔

اس نے دو ایک بار علمے سے بھی اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ لیکن علما اسے بھلا یہ سب کچھ کیسے بتا دیتا۔ اسے اپنی جان کی ضرورت تھی۔ ورنہ جانتا تو وہ سب کچھ تھا ——

چائے پی کر تاج نے علمے کو آواز دی۔

" جی چوہدری جی " وہ دروازے میں آکر بولا۔

" ڈرائیور سے کہہ گاڑی نکالے "

" اچھا جی "

وہ پلٹ گیا —— گل پروشے چپ چاپ تاج کا منہ تکے گئی۔

" کیا تک رہی ہے " تاج نے مسکرا کر کہا۔

" تمہارا ارادہ اچھا نہیں ہے " گل ڈوبے ڈوبے بولی۔

" گل پروشے " تاج نے چیخ کر کہا —— اے گل کی یہ بات بالکل

نہیں بھائی ___

"اپنی حد میں رہا کرو ___"

"سردار" گل نے اُٹھ کر اس کا راستہ روکنا چاہا۔

لیکن

تاج نے اسے دھکا دیا۔ وہ کرسی کی پشت پر گری ___ تاج غراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

گل پروشے اپنی کمر میں لگنے والی کرسی کی پشت پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے دانت پیس کر رہ گئی ___

گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

وہ دروازے کی طرف آئی۔ علما ادھر ہی آ رہا تھا۔

"علمے"

"جی"

"یہ تمارا چودری کدر گیا ہے"

"گاؤں"

"کس کا شادی ہے"

"ملک فضل کی ___"

"وہ اس کا دشمن ہے"

علما نے نظریں اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولا "بی بی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ کہ ملکوں اور سکھیروں کی صدیوں پرانی دشمنی ہے"

"پر تم نے یہ بھی بولا تھا کہ اب ملک نے سکھیروں سے صلح

کیا ہے"

"ہاں"

"پھر"

علمے نے پھر گل کو دیکھا — وہ خود بھی اس وقت خاصہ پریشان لگ رہا تھا۔

"تاج کے ارادے اسے معلوم تھے۔ جو پلان وہ بنا چکا تھا۔ اس کی بھی اسے کچھ کچھ خبر تھی۔

"تاج آج ملک فضل کی شادی میں شریک ہونے گاؤں گیا تھا۔ یہ بھی اس کی اک چال تھی۔ وہ برادری اور گاؤں کے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا۔ کہ ملک فضل سے اس کی کوئی پرخاش نہیں — اور وہ سکھیروں کو ملک فضل کی طرف سے بلاوہ دینے پر خوش ہے۔ اس کی خوشی میں شریک ہونے آیا ہے۔

لیکن

اس کے اِرادے کیا تھے ؟

علما ان ارادوں کی خوفناکی ہی سے پریشان تھا۔

اسی پریشانی ہی میں اس نے گل کو بھی بتا دیا۔

وہ حیرت زدہ سی علمے کو تکنے لگی۔

"ملک فضل بے قصور ہے" وہ کئی لمحوں کی چُپ کے بعد بولی۔

"ہاں جی۔ وہ بڑا بیبا بندہ ہے — اس نے تو اپنے باپ کا خون بھی بھلا دیا تھا۔ وہ خون خرابے کو بند کرنا چاہتا ہے -- اس نے صلح کا ہاتھ خود ہی سکھیروں کی طرف بڑھایا — حالانکہ اس کے

خاندان کے دوسرے لوگوں کو یہ بات پسند بھی نہ تھی — پھر بھی —
وہ —"

"وہ بزدل ہے" گل نے پوچھا۔

"نہیں بی بی — اس جیسا بہادر اور جی دار پوت تو ہمیں صدیوں میں جنتی ہیں —"

"اچا —"

"ہاں"

"اس کا اور بھائی بند —"

"صرف ایک بہن ہے۔ ماں نہ باپ نہ ماما نہ چاچا — آج اس کی شادی ہے"

"اور سردار اس شادی میں گڑبڑی کرے گا"

علمے نے ایک گہری سانس لی — اور بولا "خود تو نہیں کرے گا۔ کروائے گا —"

"ہوں"

وہ سوچوں میں ڈوبی ڈوبی پلٹی اور کمرے کے اندر چلی گئی — علما برآمدے میں آگیا اور کمبل کی بکل مار کر حقہ گڑگڑانے لگا۔

کوٹلی میں کسی تہوار کی سی رونق تھی۔ بشیر نمبردار کی حویلی دلہن کی طرح سجی تھی۔ رنگ برنگی کاغذی جھنڈیاں کاغذی پھول حویلی ہی میں نہیں پوری گلی میں لگائے گئے تھے۔ گلی صاف ستھری تھی۔ چونے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔

ہر گھر سے دیواروں پر لگے اُپلے اُتروا دئے گئے تھے۔ کچی نالی کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ روشنی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جا بجا گیس رکھوا دئے گئے تھے۔

حویلی کے پچھواڑے دیگیں پک رہی تھیں۔ ایک طرف تنور لگا ہوا تھا۔ حلوائی بھی بیٹھے تھے۔ مٹھائی کے تھال پہ تھال تیار کر رہے تھے دودھ کے بڑے بڑے دیگچے بھی چولھوں پر چڑھے تھے۔ چھوہارے ڈال کر دودھ اُبالا جا رہا تھا۔ منتظم اپنی نگرانی میں سب کچھ کروا رہے تھے ——

آج نمبردار کی بیٹی کی شادی تھی۔ پورا گاؤں جیسے الٹ آیا تھا۔ گاؤں

کی کسی بھی بیٹی کی شادی ہو۔ گاؤں والے کام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بیٹی سب کی سانجھی ہوتی تھی۔ لیکن یہ تو اک ٹکڑے زمیندار کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس لئے ہر کوئی بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہا تھا۔

آج برات آنے والی تھی —— نمبرداری کا نہیں پورے گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔ خاطر مدارت میں کوئی نہیں چاہتا تھا۔ کہ کوئی کمی رہ جائے۔ برات کو دو دن ٹھہرانا تھا۔ اس لئے قیام وطعام کا صحیح اور پورا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔

کئی گھروں کے دالان خالی کروا کے رنگین پایوں والی چارپائیوں پر اُجلے اُجلے کھیس اور نئے لحاف رکھے گئے تھے۔ حقے تازہ کر کے رکھدئے گئے تھے۔ عورتوں کو حویلی ہی میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

مصروفیت گھبراہٹ بنی ہوئی تھی۔ جوان لڑکے اور مرد بھاگم بھاگ کام کر رہے تھے۔ بیگاں کے بھائی دوڑتے پھر رہے تھے۔ بہنیں بھی ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ اس کی بے بے اور چاچے کو تو آج اپنا ہوش ہی نہیں تھا ——

حویلی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ڈھولک یہاں بھی لڑکیاں بالیاں پیٹ رہی تھیں۔ اُونچے سُروں میں ماہیا اور سہاگ گیت گا رہی تھیں۔

بیگاں پچھلی کوٹھڑی میں اپنی سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اس کے جہیز کے بکس پیٹیاں اور گٹھڑیاں یہاں ہی رکھی تھیں۔ ایک طرف دو چارپائیاں ساتھ ساتھ جڑی بچھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ والی چارپائی پر بیگاں تھی۔ اس کے اردگرد اس کی سہیلیاں اور رشتے ناطے کی بہنیں

بیٹھی ہنسی مذاق میں مشغول تھیں۔

بیگاں نے میلا سا پیلا مایوں کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ پنڈ کے دستور کے مطابق اس کو کئی دن پہلے پیلا جوڑا پہنا کر مایوں کی طرح بٹھا دیا گیا تھا۔ کنگھی پٹی بھی اتنے دنوں سے نہ کی تھی —— یہ خیال عام تھا کہ لڑکی مایوں سے برات تک جتنی میلی کچیلی رہے گی دلہن بننے پر اتنا ہی زیادہ روپ آئے گا

بیگاں کو ایک دن پہلے مہندی بھی لگائی گئی تھی۔ اس کے سارے ہاتھ اور پاؤں مہندی میں رنگ دیئے گئے تھے۔ مہندی اتنی رنگیلی تھی کہ یسا ہی مائل سرخ ہو گئی تھی ——

لڑکیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ اس کی ہمراز سہیلیاں فضل کے حوالے سے باتیں کر رہی تھیں۔

"نی بیگاں۔ آج تو تیرے من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں"

"فضل آنے والا ہے۔"

"تو جنج (برات) دیکھے گی نا"

"سنا ہے۔ بیاہ کا جوڑا اس نے شہر سے بنوایا ہے۔ بڑا مہنگا۔ بڑا سوہنا ——"

"کیا گبرو جوان ہے۔ دولہا بن کر تو قیامت ڈھائے گا۔"

"بیگاں پر بھی دیکھنا کیسا روپ آئے گا"

"پر فضل فضل ہی ہے"

"کیوں بیگاں کم ہے اس سے —— ایسی چھبیلی دلہن دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی —— بیہوش ہو کر گر پڑے گا۔"

"کیوں بیگاں ؟"

سہیلی نے اسے گدگدایا۔ لیکن وہ ہنس نہ سکی۔ لڑکیاں پھر باتیں کرنے لگیں۔

"بہت اداس ہے تو بیگاں"

"بھئی بابل کا گھر چھوڑنا آسان تو نہیں"

"بابل کے گھر سے سجن کے گھر تو جا رہی ہے"

"ٹھیک ہے — پر یہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے"

"آج پرائی ہو رہی ہے نا"

"چھوڑو جی — پرائی کیا ہو رہی ہے۔ اپنے ماموں کے گھر جا رہی ہے"

"ماموں کے گھر جائے یا چاچے کے — شادی ہو کر کُڑی پرائی ہو جاتی ہے"

"بیگاں جیسی پرائی تو ہر کُڑی ہو —"

"کیوں ؟"

"بھئی شادی تو ہوتی ہی ہے۔ دل کے مالک سے ہو تو بات ہی اور ہے —"

بیگاں کے اردگرد بیٹھی لڑکیوں نے پھر اسے گدگدایا۔ لیکن اب بھی وہ ہنس نہ سکی۔

"اے ہے بیگاں — کیا منہ لٹکائے بیٹھی ہے" ایک لڑکی نے کہا۔

"بھئی تیری مرضی نہیں تو بے شک اب بھی بتا دے" دوسری نے ہنس کر شوخی سے چھیڑا "میں چاچی سے کہہ دیتی ہوں — برات واپس کر دے۔

"ہائے ہائے — کیسے بُرے لفظ مُنہ سے نکال رہی ہے"

کوئی بولی۔

"یہ جو منہ بنائے بیٹھی ہے۔ ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔ یہی تو چھیڑ چھاڑ کا وقت ہوتا ہے"

"جب سے اس کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی ہے — ایسے ہی گم صم ہے —"

"ہاں بیگاں — تجھے تو چہکتے پھرنے رہنا چاہیئے —"

"ہر لڑکی پر یہ وقت آتا ہے۔ ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑنا ہی پڑتی ہے — پر کوئی تیری طرح اس طرح اُداس نہیں ہوتا"

"کڑیاں تو اپنی شادی کے سہاگ گیت بھی خود ہی گاتی پھرتی ہیں —"

"وہ خدیجہ ہے نا۔ ماسی مریم کی دھی۔ بھئی اس نے کوئی گانا چھوڑا تھا اپنی شادی پر —"

"ہاں ہاں۔ میں بھی گئی تھی — حالانکہ اس کا بیاہ بالکل غیروں میں ہو رہا تھا"

لڑکیاں آپس میں ہی باتیں کرنے لگیں۔

بیگاں نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ اور اس کی خشک ویران آنکھیں جلنے لگیں۔

"بیگاں۔ اے بیگاں" اس کی عزیز ترین سہیلی شمو نے اس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا "کیا بات ہے"

"پتہ نہیں" وہ پہلی بار بولی۔

"کیا ہو رہا ہے ۔ جی تو ٹھیک ہے نا"
"میرا جی گھبرا رہا ہے ۔ شمو"
"پانی پیئے گی"
شمو نے ناصو کو پانی لانے کے لئے کہا — سب لڑکیاں چپ ہوگئیں ۔ ناصو سلور کے گلاس میں پانی لے آئی — شمو نے گلاس بیگاں کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھ بیگاں ۔ تیری انوکھی تو شادی نہیں ہو رہی"
شمو — پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے — جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر روؤں"
"تو رو لے — دل کی بھڑاس نکل جائے گی"
"میرے پیٹ میں مروڑ بھی اُٹھ رہے ہیں — دل ڈوب رہا ہے شمو میں مر رہی ہوں"
"دفع دفعان — کیا پاگلوں والی باتیں کر رہی ہے"
"کچھ ہونے والا ہے شمو —"
"خیر مانگ جھلی" جیہ بولی ۔
"کچھ ہونے والا ہے — کچھ ہونے والا ہے — مان جاؤ کچھ ہونے والا ہے" بیگاں نے دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا لیا — شمو نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے ۔ سردی کے باوجود اس کے ہاتھوں میں پسینے آ رہے تھے ۔
اس کی سکھیاں بھی گھبرا گئیں ۔ کوئی دُودھ لینے گئی ۔ کسی نے تکیہ

ٹھیک کیا۔ بیگاں کو بستر میں لٹا کر سب نے لحاف اس پر ڈال دیا۔ شمو ہولے ہولے اس کا بدن دبانے لگی —— ساتھ ساتھ حوصلہ بھی دینے لگی۔

بیگاں کا سارا وجود پسینے پسینے تھا۔ پھر بھی لرزہ سا لگ رہا تھا۔ یوں جیسے زوروں کا بخار چڑھ رہا ہو۔

کہتے ہیں کنوار پنے کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ لیکن جب کنوار پنا ازدواجی زندگی سے ہمکنار ہونے لگے۔ تو یہ حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ حوریں اور فرشتے اپنا حسن و نکھار بننے والے دولھا اور ہونے والی دلہن پر نچھاور کرتے ہیں ——

شاید یہی بات تھی۔

فضل نے جب شادی کا نیا جوڑا پہنا اور سونے سہرے اور پھولوں کی لڑیاں اس کے ماتھے پر سجیں۔ تو اس بانکے چھبیلے گھبرو پر روپ آیا۔ کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے —— دمکتی ہوئی رنگت۔ خوبصورت پیشانی پر جھکے ہوئے بال خوابوں کو اپنی گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی جھیل ایسی گہری گہری آنکھیں۔ تنومند اور مشقت سے لوہے کی طرح مضبوط جسم۔ چوڑی چکلی چھاتی اور اونچا قد۔ آج تو فضل نے اک نیا ہی روپ دھارا تھا۔

رشتے کی بھابیوں نے سُرمہ لگانے کی رسم ادا کی۔ منہ مانگے پیسے

لئے — ہنسی مذاق ہوا — نائیوں چچیوں نے صدقے اتارے
بڑی بوڑھیوں نے دامن پھیلا پھیلا کر دعا دی —
نجو بن ٹھن کر بھائی کے سامنے آئی۔ تو اس کا رنگ روپ دیکھ کر
ششدر رہ گئی — دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔
لیکن
جانے کیوں مسکراہٹ آنسو بن گئے۔
بچھڑ جانے والے ایسے موقعوں پر ہی تو یاد آتے ہیں۔ کسی نے چوہدری رحمت کا نام لیا۔ کسی نے ان کی ماں کا۔ بس پھر کیا تھا۔ نجو کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ اور فضل بھی اپنی گیلی آنکھوں کو الٹی ہتھیلی سے صاف کرنے لگا۔ نجو بھائی کے سینے سے لگ کر بے اختیار ہو ہو کر رو دی۔ اردگرد کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ لیکن بزرگوں نے اس طرح رونے دھونے سے برا مانا۔ برات کی روانگی کے وقت یوں بلک بلک کر رونا اچھا نہیں لگا۔ کسی نے نجو کو کندھے سے پکڑ کر فضل کے بازوؤں اور سینے سے الگ کر دیا۔
نجو تو خیر نو عمر لڑکی تھی۔ اس کا دل خون ہو ہی رہا تھا۔ فضل کو بھی یوں لگا جیسے کسی نے نجو کو اس سے جدا نہیں کیا۔ اس کا کلیجہ چھپٹ لیا ہے۔
فضل کے دوست و احباب باہر جمع تھے۔ کچھ بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ وہ دولھا بنا بیٹھک میں آ گیا۔ یہاں لوگ جمع تھے۔ فضل کو دیکھتے ہی مبارک سلامت کا شور اٹھا۔
"دود و مبارکیں پترا" بوڑھے اور معتمد چوہدری نصیر نے فضل

سے کہا۔

"دو دو ؟" فضل نے سہرا ذرا سا ہاتھ پر اٹھایا۔

"ہاں بھئی — آج تیری شادی میں دیکھ تو سہی کون کون آیا ہے" ملک الہ دین نے خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ مہمانوں کی طرف اشارہ کیا۔

فضل کی نظر سب سے پہلے تاج سکھیرے پر پڑی — وہ بڑی تیکھی اور شیطانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فضل نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا۔ اس کی نظریں بھی تیکھی ہو گئیں

دونوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو نگل لیا۔

تاج کے ساتھ رفیق اور دوسرا بھائی شفیق بھی کھڑا تھا۔ رفیق دل کا نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ پورے خلوص سے فضل کی طرف بڑھا اور دونوں بغلگیر ہو گئے —

اس خوشی میں کسی نے زندہ باد کا زوردار نعرہ لگایا۔ مبارک سلامت کا غلغلہ مچا — اور اسی شور شرابے میں شفیق اور اس کے بعد تاج فضل سے بغل گیر ہوئے — تاج کے ملنے کے انداز سے فضل کو جانچ لینا مشکل نہ تھا۔ کہ اس کے دل میں کینہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ رہا ہے —

"کہو کیسے ہو — طبیعت ٹھیک ہے نا" فضل نے مصافحہ کرتے ہوئے تاج کا ہاتھ اپنی پوری قوت سے دبایا۔ اس کی آواز میں کاٹ تھی اور آنکھوں میں تمسخرانہ چمک۔

تاج بھی ہنس کر آنکھوں میں شیطانی چمک لہراتے ہوئے بولا" ایسے

ہی تو ٹھیک نہیں ہوگی" جواباً تاج نے بھی اس کا ہاتھ پوری طاقت سے کچلنے کی کوشش کی ——

فضل کچھ کہنے کو تھا۔ کہ اس کے تایا زاد بھائی نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔ وہ اسے مبارک باد دیتے ہوئے بغل گیر ہو گیا۔

اب فضل لوگوں سے مل رہا تھا۔ لوگ ملکوں اور سکھیروں کے ملاپ کی خوشی سے مغلوب مغلوب تھے۔ کوئی فضل کی تعریف کر رہا تھا۔ بھئی اس کی ہمت ہے۔ دوستی کا ہاتھ فضل ہی نے بڑھایا۔"

"بہت اچھا آدمی ہے فضل — خدا نے اسے دریا ایسا دل دیا ہے"

کچھ لوگ سکھیروں کے حامی تھے — ان میں سے ایک بولا

"ٹھیک ہے۔ پر سکھیروں کی بھی بڑی دریا دِلی ہے یارو ——"

"ہاں کیوں نہیں"

"فضل نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور انہوں نے ہاتھ تھام لیا"

"بالکل بالکل"

"خدا کرے یہ دوستی اب ہمیشہ قائم رہے۔ دونوں خاندانوں کی نبھ جائے"

"اِنشاءاللہ نبھے گی — دونوں طرف سمجھدار جوان ہیں"

"خدا کرے بھئی ہم تو دونوں کی خیر چاہتے ہیں — اللہ پاک انہیں توفیق دے"

"آمین"

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگ اس دوستی پر خوش تھے اور دل سے امن و امان کے خواہشمند تھے۔ جو ذرا جوشیلے اور غیرت کو انا کا

مسئلہ بنانے والے تھے۔ وہ چپ رہے — معاملہ فضل اور تینوں سکھیروں کا تھا — اس لئے خاموشی ہی میں مصلحت تھی۔

گلی میں شہر سے آئے ہوئے خاکی وردیوں اور لال پگڑیوں والے بینڈ باجے والے کھڑے تھے۔ فضل کے لئے گھنوں سے لدی گھوڑی دروازے پر آگئی تھی۔ براتی گلی میں نکل رہے تھے — برات کی روانگی کے وقت پنڈ کے نائیوں میراثیوں نے یہ گیس ساتھ ساتھ اٹھا کر چلنا تھا فضل کو دوست یار بیٹھک سے نکال کر حویلی کے دروازے پر لے آئے۔ یہاں اس نے گھوڑی پر بیٹھنا تھا — عورتیں اور مرد گھوڑی پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ بمشکل جگہ بنا کر چند جوانوں نے فضل کو گھوڑی تک پہنچایا۔ ان میں راجو بھی تھا۔ اس نے بھی خوب سج دھج نکالی تھی۔ وہ گھوڑی کے قریب اس لئے بھی کھڑا تھا۔ کہ ابھی بخو نے باگ پکڑنی تھی وہ اس سراپا قیامت کو قریب سے دیکھنے کے لئے ہی تو یہاں کھڑا تھا۔ دھکے لگ رہے تھے۔ لوگ پل پڑے تھے۔ لیکن وہ فضل کے قریب ہی کھڑا رہا۔

فضل گھوڑی چڑھا۔ بخو ہجوم کو ہٹاتی بمشکل آگے آئی۔ اس کا گوٹے سے بھرا دوپٹہ سر سے کھسک گیا اور سونے کے جڑاؤ کلپ جو بالوں میں لگا رکھے تھے۔ گوٹے کی تاروں میں اُلجھ گئے۔

راجو نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے جذب کرنے لگا۔ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ گوٹے سے بھرے کپڑوں اور زیور میں

بخو نے آگے بڑھ کر باگ پکڑ لی۔ میراثیوں نے گانا شروع کیا۔ بینڈ باجے والوں نے سُریلی سی دھن چھیڑ دی — لوگوں نے شور و غل

بینڈ باجے کی آواز اور میراثیوں کے گانوں کی لَے میں نجو باگ پکڑے بولی "میری باگ پکڑ وائی دے ویرا ——"

"کیا لے گی" گھوڑی پر سوار فضل نے سہرا قدرے اونچا کرتے ہوئے نجو سے ہنس کر پوچھا ——

"اونچے شملے والے ملک فضل کی خیر ——" قریب کھڑے میراثی نے نعرہ لگایا۔ نجو نے ہاتھ میں پکڑے چاندی کے بہت سارے روپے فضل کے اوپر سے نچھاور کر کے میراثیوں اور نائیوں کی طرف پھینک دئے ——

"دے دے دے ویرا۔ باگ پکڑ وائی" عورتیں تالیاں بجا بجا کر گانے لگیں۔ فضل نے کمخواب کی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور مٹھی نجو کی طرف بڑھا دی۔ نجو نے اس کی مٹھی کے سامنے ہاتھ کر دیا۔ فضل نے چاندی کا ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ——

اس مذاق پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نجو بھی ہنسی۔ جلدی سے روپیہ اونچا کرتے ہوئے کہا "دیکھو لوگو ملک فضل نے بہن کو باگ پکڑوائی دی ہے —— اپنی ایک اکیلی بہن کو —— چاندی کا روپیہ —— ایک روپیہ ——"

سب ہنسنے لگے ——

چند لمحے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ فضل نے دوسری دفعہ دو روپے دیئے۔ تیسری دفعہ تین ——

پھر اس نے سونے کے جڑاؤ کنگن نجو کے حوالے کر دئے —— نجو خوشی سے پھولی نہ سمائی —— بہن بھائی کی البیلی اٹھکیلیاں سب ہی دیکھ رہے

تھے۔ راجو کی تو باچھیں کھلی جارہی تھیں — اس کا بس چلتا تو نجو کو بازوؤں میں بھر کر پیار کر لیتا ——

کچھ ایسی ہی خواہش دیوار کے ساتھ کھڑے تاج سکھیرے کے من میں بھی جاگ اٹھی تھی۔ اس نے آج پہلی بار ملک فضل کی بہن کو دیکھا تھا۔

صرف دیکھا ہی نہیں تھا

اس پر دل بھی آگیا تھا ——

اور جس لڑکی پر اس کا دل آجاتا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے وہ کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اور یہ تو ملک فضل کی بہن تھی۔ ملک فضل جس نے تھوڑی دیر پہلے ہاتھ کے دباؤ سے اسے چیلنج کیا تھا اس نے دل ہی دل میں اک نیا فیصلہ کرلیا۔

"مر گئے"
"لُٹ گئے"
"دوڑو"
"پہنچو ——"

گلے پھاڑ پھاڑ چیختے ہوئے بدحواس جوان بھاگے چلے آ رہے تھے۔ برات کے استقبال کے لئے لڑکی والے گلی کے سرے والے میدان میں جمع تھے۔ روشنی کے لئے گیس جل رہے تھے۔ پھر بھی اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے آنے والوں کی صحیح شناخت نہ ہو سکی ——

"کیا ہوا ——"
"کیا ہوا"
"کون ہو تم"
"بتاؤ تو صحیح ——"

لوگ ان لوگوں کی طرف دوڑے —— وہ سخت بدحواس تھے۔ منہ

سے بات نہ نکل رہی تھی۔ بس چیخے جا رہے تھے۔

"چارپائی لاؤ ـــــ ان کو بٹھاؤ ـــــ آرام سے پوچھو" لوگوں نے ان کو گھیر لیا ـــــ کچھ لوگ چارپائی لینے دوڑے۔

"برات ـــــ برات" بدحواس نوجوان سینہ پیٹتے ہوئے چیخا۔

"ہاں ہاں ـــــ فضل کی برات آگئی ہے ـــــ کیا ہوا" اک بزرگ نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"برات پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ـــــ شاید ـــــ شاید ـــــ فضل" وہ بمشکل بولا۔

"کیا ہوا فضل کو" کئی چیخیں ابھریں۔

"گھوڑے سے گر پڑا ہے۔ شاید نے اسے مار ڈالا ہے ـــــ شاید خود گرنے سے مر گیا ہے ـــــ" دوسرا جوان سر پہ ہاتھ رکھ کر بین کرتے ہوئے چیخا ـــــ "اوئے فضل مر گیا جے ـــــ"

اس خبر سے جیسے کہرام مچ گیا۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے ـــــ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ـــــ حویلی کی چھت پر عورتیں برات دیکھنے کے لئے سردی اور وقت کی پرواہ کئے بغیر بیٹھی تھیں۔ باہر افراتفری مچی تو ان میں بھی کھلبلی مچ گئی۔

"کیا ہوا ہے" کوئی بولی۔

"باہر بڑا شور ہے"

"برات آگئی ہوگی"

"برات آتی تو باجے بجتے ـــــ نہ کہ یہ شور ـــــ"

"ہاں ہاں لگتا ہے کوئی رو پیٹ رہا ہے ـــــ"

"دوڑ بھاگ رہے ہیں سب"
"کوئی پتہ تو کرے جاکر"
"اللہ خیر کرے ——"

عورتیں قیاس آرائیاں ہی کر رہی تھیں۔ کہ نیچے صحن میں جیسے قیامت مچ گئی۔ کسی نے آکر خبر بد سنادی۔

بیگاں کی ماں نے دو ہتڑ سینے پر مارا اور بدحواسی کے عالم میں "ہائے میں مرگئی" کہتے ہوئے باہر دوڑی۔ اور پھر آگے پیچھے ایک دوسرے کو دھکے دیتے پرے ہٹاتے پہلے باہر جانے کی کوشش میں عورتیں گرتے پڑتے باہر دوڑنے لگیں۔ کوئی سینہ پیٹ رہی تھی۔ سر پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے بین کر رہی تھی۔ کوئی صرف چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔

لیکن ایک دوسرے کی سننے اور بتانے کا ہوش کسے تھا۔ سب بھاگ رہے تھے۔ مردوں کے ہاتھ میں جو چیز آئی تھی لے بھاگے تھے کچے راستے گھپ اندھیرا گھنی جھاڑیاں خاردار جھنڈ سبھی کو پھلانگتے دوڑے بھاگے جا رہے تھے۔ اس اچانک خبر نے دماغ سُن کر دئے تھے۔ کسی کو یقین نہ آیا تھا۔ کوئی یقین کر کے جیسے حواس کھو رہا تھا۔ اک قیامت مچی تھی۔

جائے وقوعہ پر کہرام مچا تھا۔ لوگ اونچی آوازوں میں رو پیٹ رہے تھے —— باتیں کر رہے تھے۔ حادثے کی روئداد سنا رہے تھے۔ روشنی کے لئے لائے ہوئے سارے گیس ایک جگہ رکھے ہوئے تھے۔ اور ان کے قریب فضل کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ کمخواب کی کُرتی بوسکی کی قمیض خون سے بھری تھی۔ سہرے کی سنہری اور معطر پھولوں کی لڑیاں خون میں ڈوبی تھیں۔ چھرے کا وار ایسا ہوا تھا۔ کہ سانس لینے کی بھی مہلت

نہ ملی تھی۔ بہنوں بھابیوں نے — جنہوں نے اسے دولہا بنا کر ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی تھی — منہ سر پیٹ رہی تھیں — چاچے مامے نوحہ کناں تھے۔ بزرگوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں — کچھ لوگ ٹولیوں میں بٹ کر کھڑے حملہ آوروں کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے تھے — کچھ جوان ان کے تعاقب میں بھاگے تھے۔

عورتوں کی سینہ کوبی اور مردوں کی دھاریں مار مار کر رونے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں — بین ہو رہے تھے۔ ہائیں ہو رہی تھیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ —

"ہائے کس نے ظلم کیا"

"تیرے بدلے میں مر جاتا فضلے"

"تیرے سوہرے تو تیری راہ دیکھ رہے ہیں بھا فضل —"

"یہ کیا ہو گیا"

"ظلم ڈھا دیا کسی نے —"

"او گھبرو جوانا —"

"اوئے میریا بچیا —"

"او فضلے پنڈ دی شان"

لوگ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ڈھاٹیں مار رہے تھے۔ خون سے لت پت لاش سے لپٹ رہے تھے — خون آلود چہرے پر بوسے دے رہے تھے۔

ہاں

اک

نجو تھی۔ جو بالکل بے حس و حرکت لاش کے قریب بیٹھی تھی۔ پلکیں جھپکائے بغیر پوری آنکھیں کھولے اپنے ویر کو تکے جا رہی تھی۔ اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ لیکن سب کو فضل کی پڑی تھی۔ اس کی طرف کسی نے دھیان ہی نہ دیا تھا۔

ویر کی لاڈلی

ویر کی جان

ویر کی چہیتی

نجو

پتھر کا بت بن گئی تھی بنارسی پگڑی پر بندھا سنہری لڑیوں اور خوشبودار پھولوں والا خون آلود سہرا فضل کے سر کے قریب ہی پڑا تھا۔ وہ سہرے اور چہرے کو مسلسل تکے جا رہی تھی۔

سسرال والے لوگ دوڑتے بھاگتے جائے وقوعہ پر آ پہنچے۔ تو جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ——

پھپھی سکینہ نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بال نوچ لئے۔ پیٹ پیٹ کر سینہ زخمی کر لیا۔ بیگاں کے بھائیوں نے بہنوں نے دوسرے رشتہ داروں نے تو کہرام مچا دیا۔

کئی دنوں سے برات کے استقبال کی تیاریاں کرنے والوں نے اس ویران میدان میں جمع کر لیا تھا —— براتی کون تھا —— استقبال کرنے والا کون کچھ پتہ نہ چل رہا تھا ——

حملہ آوروں کے تعاقب میں جانے والے نوجوان ناکام واپس آ گئے اس ویران اور درختوں سے بھری جگہ میں اندھیرے میں ان کو ڈھونڈا

بھی کیسے جا سکتا تھا ـــــ کچھ کیا جا سکتا تھا ـــ تو گاؤں پہنچ کر ہی کیا جا سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا۔ کہ فضل کی لاش واپس پیلاں والی لے جائی جائے یا کوٹلی۔ کوٹلی یہاں سے قریب ہی تھا بمشکل فرلانگ بھر دور ہوگا ـــ اکثریت کا فیصلہ یہی ہوا۔ کہ ابھی کوٹلی ہی لاش لے جائی جائے۔ صبح پیلاں والی جنازہ کر کے دفن کیا جائے۔

لاش ایک بیل گاڑی پر رکھی گئی ـــــ

اور

فضل جو باجے گاجے اور ناچتے گاتے لوگوں کے ساتھ سسرال بیگاں کو بیاہنے جا رہا تھا۔ بیل گاڑی پر پڑا خون میں نہایا سینہ پیٹتے بین کرتے اور دھاڑیں مارتے لوگوں کے ہجوم میں سسرال جا پہنچا ـــــ

قیامتیں ہی تو ٹوٹ پڑیں۔

"ہائے فضلے"

"وے فضل"

"اوئے فضلا"

"سوہنیا فضلا"

"شیر جوانا"

پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے والے چیخ چیخ کر فضلے کو پکار رہے تھے۔ بیگاں تو پہلی خبر سنتے ہی کوٹھڑی سے دیوانہ وار باہر نکلی تھی۔ لیکن دالان میں پہنچتے ہی پچھاڑ کھا کر گری تھی۔ اس کا فضل اب اس کے گھر آ گیا تھا صحن میں چارپائی پر پڑا تھا۔ دولھا بن کر آیا تھا۔ سہرے

باندھ کر آیا تھا۔ خون کی ندیاں چیر کر آیا تھا۔
لیکن
اسے گرد و پیش کا ہوش ہی کہاں تھا۔

"نصیباں جلیئے — اٹھ ویر کا آخری بار منہ تو دیکھ لے — کل تو
باگ پکڑی تھی راہ روکی تھی۔ آج بھی روک لے ویر کی راہ۔ نہ جانے دے
اسے۔ روک لے راہ — نہ جانے دے اسے — چہرہ دیکھ لے آخری
بار — عمر بھر تڑپے گی — روئے گی۔ پھر فضلے کو کہاں دیکھے گی —
نجو — جارہا ہے تیرا ویر — جارہا ہے تیرا پیارا بھائی — جارہا
ہے۔ روک لے رستہ۔ نہ جانے دے اسے"

ماسی رابو نجو کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بین کر رہی تھی۔ لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے
تھے۔ جنازہ اٹھنے کو تھا۔ ساری تیاریاں ہو گئی تھیں۔ شہر والے ماما جی اور
ان کے وکیل بیٹے شاہد نے تھانہ میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ لاش
پوسٹ مارٹم کے لئے بھی لے گئے تھے۔ اب شام ہونے کو تھی۔ کفن دفن کا
انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا۔

کل جس صحن میں فضل دولھا بن کر بیٹھا تھا۔ آج بے حس و حرکت سفید
کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ تیاریاں کل بھی زوروں سے ہوئی تھیں۔ آج بھی

زوروں سے ہو رہی تھیں۔ کل فضا قہقہوں سے معمور تھی۔ آج آہوں اور آنسوؤں سے بھرپور تھی۔ عود و عنبر کی ماتمی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ میت پر ڈالے گئے بے شمار پھولوں کی مہک بھی سوگوار تھی —— ایسی قیامت کب کہیں ٹوٹی تھی —— جس گھر میں شادیانے بجنے تھے وہاں آہ و بکا اور نالہ و شیون تھا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو مسلسل برس نہ رہی ہو —— اپنے تو اپنے بیگانے بھی اس خونی حادثے پر اشکبار تھے۔ اپنے بھائی کی اتنی چہیتی اور لاڈلی بہن —— جو بھائی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی جس کا پیار سارے پنڈ میں مشہور تھا۔ جو اس کے بغیر کھانا نہ کھاتی تھی۔ جو اس کے دم سے دم لیتی تھی۔ آج اکیلی رہ گئی تھی۔ ماں تھی نہ باپ قریبی چاچا ماما بھی نہ تھا —— بھائی بھی اتنی خاموشی اور ایسے چپ چاپ منہ موڑ گیا تھا۔ ایک ہی وار میں ختم ہو گیا تھا۔

بجو کی حالت جوں کی توں تھی۔ بیگاں کے گھر سے اسے یہاں اپنے گھر لایا گیا تھا —— اسے ہلایا جلایا گیا تھا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ لیکن سکتے کی کیفیت نہ ٹوٹی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔

جنازہ اٹھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لوگ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے آگے بڑھ بڑھ کر آخری دیدار کر رہے تھے۔ اور تاب ضبط نہ لا کر چیخیں مارتے ہوئے پلٹ رہے تھے۔

وقت جا رہا ہے۔ اب جنازہ اٹھا لیں —— "کسی بزرگ نے آنسوؤں سے تر چہرے سے کہا۔

"ہاں —— اب کس کا انتظار ہے۔ کسی اور نے کہا۔

"لے چلیں!" سرہانے کھڑے راجو نے ہچکیوں سے روتے ہوئے کہا

"اس نصیبوں جلی — کرموں والی کو تو بھائی کا چہرہ آخری بار دکھادو —" سینہ پیٹتے ہوئے پھپھی سکینہ نے نجو کی طرف اشارہ کیا۔

اور

ماسی رابو نے جوش گریہ سے بے حال ہوتے ہوئے نجو کو جھنجھوڑ ڈالا وہ روئے جا رہی تھی۔ اور نجو کو جھنجھوڑے جا رہی تھی۔

"روک لے راستہ ویر کا۔ نہ جانے دے اسے — دیکھ لے منہ اس کا۔ کہاں سے دیکھے گی پھر — اُٹھ — اُٹھ کرماں ماریئے"

جنازہ اٹھانے کے لئے ڈھیر سارے مرد صحن میں آگئے — اور پھر زوردار آوازوں میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے چار آدمیوں نے فضل کا جنازہ اٹھایا — اک کہرام مچ گیا۔

اور

اس کہرام میں نجو چلائی "کہاں جا رہے ہو ویر جی — کیا ہو گیا ہے — کدھر جا رہے ہو —"

وہ دیوانہ وار دوڑی اور پلنگ کے پائے کو پکڑ کر چیخی "چھوڑ دو — چھوڑ دو میرے ویر کو — ظالمو کہاں لے جا رہے ہو — کیا ہو گیا ہے اسے — چھوڑ دو —"

حویلی کے دروازے کے باہر جنازہ رکھ دیا گیا۔

اور

پھر

جو نجو پر بیتی اور اس کا اظہار اس نے جس جس طرح کیا انسان تو انسان در و دیوار بھی کانپ اٹھے۔ زمین کا کلیجہ شق ہونے لگا۔ آسمان کا رنگ

کالا پڑ گیا۔

وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ لوگوں کے قابو میں نہ آ رہی تھی بال کھل کر بکھر گئے تھے ـــــ دوپٹہ جانے کہاں گیا تھا۔ چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا تھا ـــــ

مر جائے گی کڑی۔ اسے سنبھالو ـــــ" چوہدری نذر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مر تو گئی ہے اور کیا مرے گی ـــ رہ ہی کیا گیا ہے اس کے پاس"

"ویر ہی کو تو دیکھ دیکھ جیتی تھی ـــــ"

"حوصلہ دو اسے"

"نہیں جی ـــ رو لینے دو جی بھر کے ـــــ"

"رات سے سسکتے ہیں تھی۔ اب کھل کر بین کر لینے دو ـــــ ورنہ اس کا دل پھٹ جائے گا ـــــ"

"پیار کر لے فضل کو ـــ جی بھر کر دیکھ لے اسے ـــــ پھر کہاں دیکھے گی"

رو رو کر بے حال ہوتے ہوئے لوگ نجو کے متعلق کہہ سن رہے تھے۔ اسے رتو کی اماں نے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ لیکن وہ اپنا آپ چھڑا کر جنازے پر گری جا رہی تھی ـــ جنازہ اٹھانے ہی نہ دیتی تھی ـــــ

"ویرا"

"بیگاں کو کیوں نہیں لایا"

"بزدلا"

"دشمنوں سے پٹ بھی نہ سکا"

"میں نہیں ٹونگی — میں نہیں ٹونگی —"

اس نے سینے پر ہاتھ مارا — اور ہاتھ مارتے مارتے بیہوش ہوگئی — یہی موقعہ غنیمت تھا — جنازہ اٹھالیا گیا — نجو کا رشتے کا ماما اسے ہاتھوں پر اٹھا کر اندر لے گیا — پلنگ پر ڈال کر ارد گرد کھڑی عورتوں سے کہا " اسے ہوش دلاؤ۔ دودھ کے گھونٹ منہ میں ڈالو —" عورتیں اس کے پلنگ کے گرد جمع ہوگئیں۔ ماما جنازے کو کندھا دینے کے لئے باہر چلا گیا۔

نجو کی حالت بیحد تشویش ناک تھی۔ تسلی و تشفی تو کوئی کیا دیتا۔ اس کے تو انداز مجنونانہ تھے۔ کبھی بے تحاشا رونے لگتی۔ کبھی بالکل چپ ہو جاتی کبھی مٹھیاں بند کر کے دانت پیستے ہوئے شعلہ برساتی آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑانے لگتی۔

غشی تو دوروں کی صورت طاری تھی۔ بار بار غش کھا جاتی۔ دانت بند ہو جاتے مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ جسم اکڑ جاتا۔ کئی دفعہ دانتوں تلے زبان آکر لہولہان ہوگئی۔

فضل کو لوگ سپردِ خاک کر کے واپس لوٹ آئے۔ اس کا دکھ تو سبھی کو تھا۔ لیکن نجو کی حالت سے سبھی متوحش تھے۔ اگر وہ ایسے ہی کرتی رہی تو اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ یہ سب ہی کا خیال تھا۔

ادھر

بیگاں کو ہوش ہی نہ آرہا تھا — دوسری شام اس نے پلکیں جھپکائیں —

اس کے منہ سے ہائے نکلا — پھر وہ اٹھ بیٹھی — اتنی لمبی بیہوشی کے

بعد ہوش میں آئی
تو
ہوش ہی کھو بیٹھی ——
اس کی نظروں سے پہچان اور شناخت کی قوت چھن چکی تھی۔ وہ سب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
اس کا ذہنی توازن درہم برہم تھا۔ سوچ سکتی تھی نہ کچھ سمجھ سکتی تھی۔ ہاں اپنے مہندی سے رنگے ہاتھ پاؤں پر نظر پڑی تو دیوانہ وار چیخ اٹھی ——
"لہو"
"لہو"
"لہو"
پھر وہ مسلسل ایک ہی لفظ کی رٹ لگائے گئی —— "لہو لہو لہو" کبھی اٹھ کر باہر بھاگنے لگتی۔ کبھی چادر میں منہ سر لپیٹ لیتی — کبھی قریب بیٹھے لوگوں کو مارنے دوڑتی ——
اتنے بڑے اندوہناک حادثے کے ساتھ بیگاں کا دماغی توازن کھو دینا اپنوں کیا بیگاں کے لئے بھی تکلیف دہ تھا۔

"راجو"

"ہاں چاچی"

"وے تُو تو فضل کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ تھا۔ تجھے بھی نہ پتہ چلا دشمن کیسے ٹوٹ پڑا ——"

"کچھ سمجھ نہیں آیا چاچی کیا ہوا —— سب کچھ منٹوں میں ہوگیا ——"

"روشنی نہیں تھی"

"گیس والے تو ساتھ ساتھ تھے —— ایک دائیں طرف دوسرا بائیں طرف"

"پھر"

"ایک دم گیس گرے —— اندھیرا ہوگیا۔ سب گیسوں کی طرف لپکے ہی تھے۔ کہ فضل کی چیخ سنائی دی ——

"ہائے میرے ملکا ——"

"شور شرابہ مچ گیا۔ لوگ آگے پیچھے اپنی اپنی دُھن میں جا رہے تھے۔

چیخ سن کر بھاگے — گیسوں کے آنے تک فضل کے سانس پورے ہو رہے تھے "

"کہا تھا کچھ مرتے دم ——"

"کیا بتاؤں چاچی — شاید کچھ کہا بھی ہو۔ لیکن اس وقت تو اتنی افراتفری مچی تھی۔ ہا ہا کا —— کہ کچھ پتہ ہی نہ چل سکا "

"ہائے کس ظالم نے یہ ظلم کیا ؟"

"ہاں چاچی —— کوئی کافر دل ہی ہے —— عین شادی کے دن قتل کر دیا "

"پتہ ہے راجو "

"کیا ؟"

"لوگ سکھیروں کا نام لے رہے ہیں "

"نہیں چاچی — ان کے ساتھ تو فضل نے صلح صفائی کر لی تھی —— برات والے دن تینوں بھائی آئے تھے "

"ہاں یہ تو سبھی کہہ رہے ہیں ——"

"پھر —— وہ تو فضل سے گلے مل مل کر مبارک باد دے رہے تھے۔

"ہوں "

"ویسے بھی دیکھا جائے نا چاچی —— تو مارنے کی باری فضل کی تھی۔ ان لوگوں سے تو فضل نے بدلا لینا تھا اپنے باپ کے خون کا "

"ہاں ملک رحمت علی کے قاتلوں کو کون نہیں جانتا "

"لیکن خدا بخشے فضل کو اس نے دشمنی کی بنیاد ہی ختم کر دی تھی۔ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا سکھیروں کی طرف "

"پھر کس کا کام ہے یہ؟"

"اللہ جانے"

"پنڈ میں تو اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی"

"کیا خبر چاچی۔"

"ہائے بیچارہ فضل — دل کی رل ہی میں لے گیا"

راجو اور رتو کی اماں اپنے دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ راجو ان دنوں بہت پریشان تھا۔ نجو کی حالت اس سے دیکھی سنی نہ جاتی تھی۔ لیکن کچھ کر بھی تو نہ سکتا تھا۔ بیچارہ رتو کے ہاں آ بیٹھا — رتو یا اس کی اماں سے باتوں باتوں میں نجو کے بارے میں پوچھ لیتا —

آج بھی وہ رتو کے پاس آیا تھا۔ لیکن رتو نجو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت نجو کے پاس گزارتی تھی۔ نجو کے درد کا اس کے پاس مداوا تو نہیں تھا — نہ ہی نجو اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی — وہ تو بالکل گم صم رہتی تھی۔

پھر بھی

سہیلی تو تھی —

رتو کی اماں زمین سے آئی گھاس کی گانٹھ کھول کر بیٹھ گئی۔ راجو سر جھکائے چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اسے رتو کے آنے کا انتظار تھا۔

"دودھ پئے گا راجو — کاڑھنی میں گرم گرم ہے پی لے"

"نہ چاچی۔ دل نہیں کرتا —"

"تجھ پر بھی ترس آتا ہے پُتڑا — زندگی نے مہلت ہی نہ دی۔ جو فضل نجو کے ساتھ تیری بات ہی پکی کر دیتا —"

راجو چند لمحے چُپ رہا

پھر

آہستگی سے بولا " وہ تو ٹھیک ہے چاچی — پرجنج والے دن فضل نے میری بانہہ پکڑ کر سب میں کہا تھا۔ راجو میری بانہہ ہے "

" ہاں یہ تو میں نے بھی سنا تھا "

" یہ باتیں تو بعد کی ہیں چاچی۔ فکر تو مجھے نجو کی ہے۔ وہ تو ویر کے غم میں جان دے دے گی "

" ہائے پترا — تجھے کیا پتہ کتنا پیار تھا بھائی بہن میں —— "

" ہاں "

" اس کا تو باپ بھی وہی تھا بھائی بھی وہی — لاڈوں پالی تھی فضل نے — اچانک ہی، ناں دے گیا۔ بیچاری کیا سنبھلے گی "

" اس کو تسلی دیا کرو چاچی "

" رتو روزانہ اسی لئے تو جاتی ہے — اس کے ساتھ بھی تو زیادہ بولتی چالتی نہیں۔ بس سارا وقت فضل کے دالان میں بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے خون والے کپڑے اور سہرا دیوار پر لٹکا رکھا ہے — اسے ہی تکتی رہتی ہے —— "

" کہیں کہیں پاگل نہ ہو جائے "

" صدمہ اتنا ہے پترا — بیگاں کو نہیں دیکھتے — بالکل جھلی ہو گئی ہے "

" یہی تو مجھے ڈر ہے۔ کہیں نجو —— "

بات ادھوری ہی رہ گئی۔ رتو اور شادو آ گئی تھیں — دونوں کے چہرے

اداس اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں ——

"کیا حال ہے نجو کا" رتو کی اماں نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھتے پوچھا۔

"ہائے اماں کیا ہوگا نجو کا" رتو رو پڑی۔ شادو بھی آنکھیں پلو سے پونچھنے لگی

"ہوش میں تو ہوتی ہے نا" جلدی سے راجو نے پوچھا —— وہ بیقرار ہوگیا۔

"پتہ نہیں بھاراجو ——" رتو آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "اسے تو کسی آنے کا پتہ ہے نہ گئے کا۔ اتنے دن ہوگئے۔ بس بھا فضل کے دالان میں ہی بیٹھی رہتی ہے۔ اور اس کے خون والے کپڑے اور سمرے کو تکتی رہتی ہے ——"

"تمہارے ساتھ باتیں نہیں کرتی"

"کبھی کبھی کرتی ہے —— کھانا بھی زبردستی منہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اس کا کیا بنے گا ——"

"یہی غم مجھے بھی ہے بھین رتو"

"پیلی ہوگئی ہے —— ہمت طاقت تو رہی نہیں" شادو بولی "آج پلنگ سے اتری تو چکر آگیا۔"

"کھاتی پیتی جو کچھ نہیں دن رات یا روتی رہتی ہے یا سوچوں میں ڈوبی رہتی ہے —— کمزور تو ہونا ہی ہے" رتو بولی۔

"ہاں دھئی —— وہ بھی کیا کرے ——" رتو کی ماں نے گہری سانس لی۔ "صبر آتے آتے ہی آتا ہے۔ تھوڑی تو نہیں ہوئی اس کے ساتھ"

"اماں نجو کیسے جئے گی" رتو پھر رونے لگی۔

راجو نے تڑپ کر رتو کو دیکھا۔ بے چینی میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "رتو بھین ——"

"ہاں بھا" وہ بولی

"میں ۔میں ——" بالکل آہستگی سے کہا۔

رتو اس کا مطلب سمجھ گئی —— اسی آہستگی سے بولی "گھر سے تو وہ نکلتی ہی نہیں —— آج فجر کی بانگ ویلے وہ فضل کی قبر پر گئی تھی —— ماسی جیناں نے اسے کہا تھا قبر پر جایا کرو —— تو قرار آجائے گا ——"

"کل بھی جائے گی"

"پتہ نہیں۔ ماسی جیناں تو روز ہی اسے کہتی ہے۔ مائی رابو نے بھی کہا تھا۔ آج تو گئی تھی —— پتہ نہیں کل جائے گی یا نہیں —— رب اسے شاید قبر پر جانے سے ہی صبر دے دے ——"

"رب کرے"

"بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ کلیجہ کٹتا ہے اسے تک تک کر ——"

"اب اس کا والی وارث کون ہوگا" شادو نے اک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا

"ماسی رابو" رتو بولی۔

رتو کی اماں نے دونوں کی باتیں سن کر کہا —— "ماسی رابو تو اس کی رکھوالی ہے ——"

دور پار کے کئی رشتہ دار ہیں —— دیکھا نہیں سبھی ڈیرہ ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"ہاں آج بیس بائیس دن تو ہو گئے ہیں ـــ سب یہیں بیٹھے ہیں ـــ"

"مجھے تو لگتا ہے بنجو سے ہمدردی کی خاطر نہیں اس کے دھن دولت کی خاطر یہ لوگ بیٹھے ہیں ـــ" رتو کی اماں نے جہاندیدہ انداز میں کہا۔

"ہر کوئی وارث بننے کی کوشش کرے گا بنجو کا ـــ"

"ہاں چاچی مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ فضل کی بیٹھک میں یہ لوگ زمینوں اور اثاثے ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں"

"وہ جو کالی سی سونے کے لونگ والی فضل کی ماں کی رشتے کی بھرجائی ہے نا" رتو کی اماں نے رتو سے کہا

"ہاں ـــ" شادو بولی "چالاکوسی۔"

"بڑی زہر لگتی ہے مجھے ـــ" رتو نے کہا۔

"وہ بڑی آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے بنجو کے ـــ" رتو کی اماں بولی۔

"پر اماں" رتو نے کہا "بنجو تو گم صم ہی رہتی ہے۔ اس کے آگے پیچھے ہونے سے فائدہ"

"تو نہیں جانتی کڑیئے ـــ لوگ بڑے چھل فریب کرنے والے ہوتے ہیں ـــ اللہ ہی حافظ ہے بیچاری کا ـــ"

راجو اندر ہی اندر تڑپ گیا ـــ حالات نے اچانک ہی جو نیا رخ لیا تھا۔ وہ بیچارہ بکھر بکھر جا رہا تھا۔ باقاعدہ منگنی ہو گئی ہوتی تو اس کا حق بھی بنتا تھا۔ کہ بنجو کے مفاد کے لئے عملی قدم اٹھائے۔

لیکن

اب

اب وہ صرف تڑپ ہی سکتا تھا۔ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"بی بی" علمے نے ہراساں ہو کر کہا۔
"کیوں" گل پروشے صوفے پر بیٹھی تھی۔ تیکھے لہجے میں بولی
"آئندہ یہ بات منہ سے نہ نکالے گا" علما انتہائی دھیمی آواز میں بولا ——

"ام حق بات کرے گا کہے گا —— تمارا چوہدری ظالم آدمی ہے۔ شادی کا دن ملک کو قتل کروایا۔ امارے پاس ثبوت ہے"
"بی بی۔ آپ تاج محمد سکھیرے کی قوت اور طاقت کو نہیں جانتیں"
"کیا ام جھوٹ بولتا ہے۔ تم نے بھی تو دیکھا —— ان دو بدمعاش آدمی کو سردار نے کتنا پیسہ دیا ——"
علما چپ ہو گیا۔
"کس بات کا پیسہ دیا سردار نے؟"
علمے نے اک گہری سرد آہ بھری اور سر اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ اسے تاج کے منصوبوں کا بھی علم تھا —— اس نے

دو چھٹے ہوئے بدمعاشوں کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ وہ سکھیروں کا نسل در نسل ملازم تھا۔ اس کا سارا خاندان سکھیروں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ بذاتِ خود سفاک تھا نہ ظالم — لیکن مالکوں کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔

دو سال پہلے اس نے ایک معمولی سی بات پر تاج سکھیرے کی مخالفت کی تھی۔ تو تاج نے اس پر عتاب توڑنے کی دھمکی دی تھی — "تو میرا ذاتی ملازم ہے علمے — میرے سارے راز تیرے سینے میں ہیں۔ یہ راز سینے ہی میں دفن رہے۔ جس دن یہ راز سینے سے باہر آئے یاد رکھ لے تیرا سینہ باقی نہ رہے گا —"

علما چپ ہو گیا تھا۔ تاج نے اس سے بھی بڑی دھمکی دی تھی — "تیری بیٹی اٹھوا دوں گا۔ ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا تو —"

علما جانتا تھا۔ یہ لوگ جو بات منہ سے نکالتے ہیں اسے عملی جامہ پہنانے سے گریز کرتے ہیں نہ دیر لگاتے ہیں — اور ان کو پوچھنے والا بھی کون ہوتا ہے۔ غریب کی ان کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے۔ اور تاج سکھیرے کے تو ہاتھ اوروں سے کچھ زیادہ ہی لمبے تھے۔

علما سب کچھ جانتے ہوئے بھی چپ رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب تاج کا موڈ اچھا ہوتا تو اسے شفقت سے سمجھانے کی کوشش ضرور کرتا۔

لیکن

جب وہ غصے میں ہوتا تو کچھ کہنے کی اسے مجال نہ ہوتی

علما دل کا نرم تھا — گل پروشے سے بھی اسے ہمدردی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا گل کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلے جو تاج کے عتاب کو دعوت

دے۔ بعید نہیں تھا — یہ بات تاج سن لیتا تو گل پروشے کو شوٹ کر دیتا۔

شوٹ کرنے کے علاوہ بھی اسے غائب کروانے کے گر آتے تھے گل پروشے لاکھ عزم و ارادے کی پکی سہی — تاج کے سامنے اس کی تنکے کی سی حیثیت تھی۔

فضل کے قتل کی خبر یہاں بھی پہنچی تھی۔ علمے کو تو اتنا دکھ ہوا تھا۔ کہ دو تین دن اس سے روٹی کا نوالہ ہی حلق سے نیچے نہ اتارا جا سکا۔

گل پروشے کو بھی خبر ملی تھی۔ اسے شک گزرا تھا۔ لیکن شک کو تقویت اس دن ملی جس دن اس نے پروشے کے پیچھے سے تاج کو ڈھیر سارے نوٹ ان بدمعاشوں کو دیتے دیکھا تھا۔

تاج نے دونوں کو شاباش دیتے ہوئے کہا تھا "تم نے بڑی صفائی سے کام تمام کر دیا ملک کا — کسی کو ہم پر شک بھی نہیں ہوا — میں اسی لئے تو اس کی برات میں گیا تھا — گاؤں میں اب کوئی بھی ہم پر شک نہیں کر سکتا"۔

گل پروشے سرتاپا کانپ گئی تھی۔

ملک فضل کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اک بے قصور نوجوان کی عین شادی کے دن موت — وہ سوچ سوچ کر ہی نڈھال ہونے لگی تھی۔

اور

جب علمے سے باتوں ہی باتوں میں اسے پتہ چلا تھا۔ کہ اک لڑکی کے چکر میں تاج نے سب کچھ کیا ہے۔ تو وہ بپھر گئی — تاج سے اسے نفرت

محسوس ہوئی۔ اس سے گھن آنے لگی ـــ منصوبے تو اس کے من میں اپنی ہر ناکامی پر بنتے ہی رہتے تھے۔ لیکن اب ان منصوبوں نے کوئی اور ہی صورت اختیار کر لی ـــ

ظلم و تشدد جبر و استبداد کو سزا ملنی چاہیئے ـــ سزا ملنی چاہیئے سزا ملنی چاہیئے۔

وہ اب صرف یہی سوچتی رہتی۔

علمے نے سنجیدگی سے اس معاملے میں زبان بند رکھنے کا مشورہ دیا ـــ وہ جوشیلی آواز میں بولی "ام کب تک اس کا ظلم برداشت کرے گا۔ یہ ام کو پوچھتا بھی نہیں ـــ ام اس کا بیوی ہے۔ یہ اور اور لڑکی کے پیچھے دوڑتا ہے۔ ام اس کا یہ راز سب کو بتائے گا ـــ"

"بی بی" علما بولا "تاج محمد سکھرا اپنے راز فاش ہونے سے پہلے فاش کرنے والے کو ختم کر دیتا ہے ـــ آپ کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتی ہیں ـــ وہ آپ کو منٹوں میں ختم کروا دے گا ـــ"

گل کی آنکھیں پھیل گئیں ـــ پھر ان آنکھوں میں نمی تیر گئی ـــ گلوگیر آواز میں بولی "تو پھر ام کیا کرے علمے"

"چپ چاپ زندگی گزارتی رہیے ـــ آپ کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے ـــ"

"لیکن ـــ"

"بی بی ـــ آپ یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتیں ـــ کیا سوات واپس جانا پسند کریں گی؟"

"نئیں نئیں ـــ"

"پھر — اور کہاں جائیں گی — اور جب کہیں جا نہیں سکتیں۔
تو چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں — "
" ظلم کا تماشا — "
" مجبوری سمجھئے — آپ نے اس سلسلے میں کوئی لفظ بھی چوہدری
کے سامنے منہ سے نکلا۔ تو وہ آپ کو ختم کرانے میں توقف نہیں کرے
گا — "

گل چپ ہو گئی — اس کے ذہن میں منصوبے بن بن کر بگڑ رہے
تھے۔ بگڑ بگڑ کر بن رہے تھے۔ بے چینی سی لگی تھی۔ وہ اس لڑکی کے بارے
میں سوچ رہی تھی۔ جو دلہن بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ جس کے خواب تکمیل کی
حدوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے تھے۔

اور

جب اسے علمے سے باتوں باتوں میں پتہ چلا۔ کہ فضل کی بہن دنیا
میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے — اس کا اور کوئی بھی نہیں رہا۔ تو اسے آن
دیکھی اس لڑکی سے بھی بے پناہ ہمدردی محسوس ہونے لگی۔
اسے یوں لگا جیسے فضل کی بہن نہیں اک اور گل پروشے دنیا میں
یکہ و تنہا مصائب و آلام کے سمندر میں غوطے کھانے کے لئے رہ گئی ہے۔
گل پروشے بے تابی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ علما قالین پر سر جھکائے
بیٹھا رہا —

پھر گل پروشے کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد تاج آگیا۔
علما اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھ کر تاج کے ہاتھ سے
اوور کوٹ پکڑ لیا۔

"کیا کر رہے تھے علے" اس نے یونہی پوچھا

"کچھ نہیں چوہدری صاحب - کمبل کی بکل مارے بیٹھا تھا۔ جی نہیں چاہ رہا تھا اُٹھنے کو ـــــ آپ ہو آئے پنڈ"

"ہاں"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا"

"اوہ ـــــ بالکل ٹھیک"

تاج مسکراتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھا ـــ جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "سنا ہے فضل کی بہن نے فضل کے قتل کی چھان بین سے منع کر دیا ہے"

"چھان بین ہو رہی تھی"

"ہاں ان کے کوئی رشتہ دار شہر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے رپورٹ درج کروائی تھی۔ پولیس چھاپے مار رہی تھی۔

"اچھا!"

"ہاں ـــــ اب اس کی بہن نے معاملہ ختم کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں"

علما نے تاج کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ چمک بلاشبہ شیطانی تھی۔

"شکر ہے" تاج بولا "اس کی بہن نے یہ بیان دے کر کم از کم ہمارے خاندان کو لوگوں کا موضوع بننے سے بچا لیا ہے۔ سب لوگ سکھیروں اور ملکوں کی دوستی پر یقین کرنے لگے ہیں"

علے نے آہستگی سے سر ہلایا "اچھا ہی کیا اس نے۔ بیچاری اکیلی کس

کس سے نپٹتی"

"جا علمے چائے بنوالا —— سردی بہت ہے —— "تاج نے جلدی سے بات بدل دی۔

علما کوٹ اٹھائے ڈرائینگ روم سے باہر نکل گیا۔

تاج صوفے میں تساہل سے پڑ کر سگریٹ کے کش لینے لگا — وہ گاؤں تقریباً روزانہ ہی جا رہا تھا —— جانے کے پس پردہ کئی باتیں تھیں ——

ایک تو وہ لوگوں سے مل کر یہ تاثر دیتا رہتا تھا۔ کہ فضل کی موت کا اسے بہت صدمہ ہے۔ کئی من گھڑت باتیں بھی بناتا رہتا تھا۔ کہ فضل جب بھی شہر جاتا تھا۔ اس سے مل کر ضرور آتا تھا۔

دوسری لگن گاؤں جانے کی یہ بھی تھی۔ کہ دل نجو سے ہار بیٹھا تھا۔ فضل کے گھوڑے کی باگ پکڑنے والی شوخیاں کرتی خوبصورت نار اس کے دل و دماغ پر نشہ بن کر چھا گئی تھی۔

ماتم پرسی کے حیلے وہ فضل کے گھر بھی گیا تھا۔ لیکن نجو کا دیدار نصیب نہ ہوا تھا ——

آج وہ بہت خوش تھا۔ نجو سے ملنے کی اُمید بندھ گئی تھی —— آج کھیتوں پر اس نے عورتوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ کہ نجو فجر ویلے روز بھائی کی قبر پر جاتی ہے۔ یہ اس نے معمول بنا لیا ہے۔

وہ نجو سے ملنے اور اسے دیکھنے کے دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگا۔

"نجو۔ خدا کے لئے اپنے آپ پر رحم کرو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ خدا کی یہی رضا تھی۔ اس طرح کرے گی تو کیا ہو جائے گا۔ فضل اب واپس تو نہیں آ سکتا —— اس کی مغفرت کے لئے دعا کیا کر۔ اس طرح تو تُو خود بھی ختم ہو جائے گی"

قبر کے سرہانے دو زانو جھکے راجو نے نجو سے کہا۔ جو قبر کے پہلو میں بیٹھی اپنا ہاتھ کچی سرخ مٹی پر آہستہ آہستہ پھیر رہی تھی۔ کئی دفعہ اس نے اپنا سر بھی قبر پر یوں رکھ دیا تھا۔ جیسے مٹی کے ڈھیر پر نہیں فضل کی شفقتوں بھرے سینے پر رکھ دیا ہو۔

راجو درد بھرے انداز میں نجو کو صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ نجو کی آنکھیں ویران تھیں۔ بال سوکھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے مٹی پر بیٹھنے سے مٹیالے ہو رہے تھے۔ وہ بالکل لٹی پٹی نظر آ رہی تھی۔

راجو کتنی دیر سے اس کے قریب بیٹھا تسلی دے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔

نجو بڑی باقاعدگی سے قبر پر جاتی تھی۔ وہ کئی دفعہ تو اذان سے پہلے ہی چلی جاتی۔ دن اور رات کا اسے ہوش ہی کب تھا۔ کہ امتیاز کرتی۔ جب دل گھبراتا قبر پہ آجاتی۔ پہروں بیٹھی رہتی۔ کبھی آنسو بہاتے بہاتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔ کبھی چپ چاپ بیٹھی تازہ قبر کی سرخ مٹی کو گھورتی۔ کبھی مرجھائے ہوئے پھول مسلتی۔ کبھی تازہ پھول بکھیرتی۔ وہ فضل سے باتیں بھی کرتی۔ یہاں آکر اسے تسکین ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا بھائی بچھڑا نہیں۔ جان بوجھ کر منہ پھیر گیا ہے۔ اسے ستانے سے مزہ لے رہا ہے۔ جبھی تو قبر سے نکل نہیں آتا۔

کبھی وہ قبر کی مٹی کو چوم لیتی۔ اور دل ہی دل میں عہد کرتی۔ فضل کے دشمنوں سے بدلہ لینے کا منصوبہ بناتی ——

صدمے نے اس کے دل و دماغ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ کوئی بات دلجمعی سے نہ سوچ سکتی تھی نہ اس پر عمل کر سکتی تھی۔

کئی دنوں سے راجو بھی قبر پر آرہا تھا۔ گھر پہ تو نجو سے ملنا مشکل تھا۔ اس کے بغیر وہ ماہی بے آب تھا۔

نجو پہلے دن تو اسے دیکھ کر بے اختیار ہو گئی تھی۔ اس کے گلے لگ کر اس بے اختیاری سے روئی تھی کہ راجو کے صبر و ضبط کے بند بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اسے چپ کرانے کی بجائے وہ خود بھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا تھا۔

"راجو —— میرا ویر کہاں گیا —— میں اسے کہاں سے لاؤں۔
کیسے ڈھونڈوں —— میرا ویر —— میرا سہریاں والا
ویر ——"

راجو کے بازوؤں میں نڈھال ہو ہو کر وہ گرتے ہوئے فریاد کرتی رہی تھی۔

راجو روز ہی اسے تسلیاں دیتا۔

لیکن

نجو کے من میں تو زخم ہی زخم تھے۔ سوچیں ہی سوچیں تھیں۔ تسلیوں سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ کبھی وہ چپ چاپ اس کی تسلیوں کے سامنے سر جھکا دیتی۔ کبھی ایک آدھ بات کہہ دیتی۔

آج بھی وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"نجو — اپنا دھیان کسی اور طرف لگایا کر — رو رو کر تڑپ تڑپ کر تو کیا کرے گی —"

نجو نے اپنی ویران آنکھوں سے راجو کو دیکھا اور پھر قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"راجو — میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی"

راجو اس کی بات نہ سمجھا جلدی سے بولا "مر جائے گی"

"نہیں — میں ابھی مروں گی نہیں۔ ابھی مروں گی نہیں۔ میرا وِیر میرے سر پہ بہت سا قرض چھوڑ گیا ہے"

"قرض" راجو نے حیرانگی سے نجو کو دیکھا۔

"ہاں"

"تو — تُو"

"میں نے وہ قرض چُکانا ہے — اور جب تک قرض نہ چُکا لوں گی — مروں گی نہیں"

"نجو تیری باتیں مجھے سمجھ نہیں آرہی ـــــ"

نجو نے اسی انداز میں مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تو سمجھے گا نہیں راجو ـــــ سمجھے گا تو وہ جس کے من کو لگی ہے ـــــ"

"مجھے تیرے دُکھ درد کا احساس ہے نجو۔ یہ نہ سوچ کہ میں تیرے درد کو سمجھتا نہیں ـــــ تجھے سمجھاتا تو اس لئے ہوں۔ کہ اب لاکھ روئے لاکھ تڑپے ـــــ فضل واپس نہیں آسکتا ـــــ"

"ہاں یہ بات تو ہے"

"پھر "

"پھر ـــــ چھوڑ راجو ـــــ تو نہیں سمجھ سکتا"

"تو سمجھا دے۔ میں تیرے دُکھ سکھ کا ساجھی ہوں"

"میرا ویر قتل ہوا ہے راجو"

"ہاں"

"جب تک میں اس کے قاتل سے بدلہ نہ لوں گی ـــــ میں جی سکوں گی نہ مر سکوں گی ـــــ مجھے اپنے ویر کے خون میں ڈوبے سہرے کی قسم ـــــ میں بدلہ لوں گی"

"لیکن ـــــ لیکن بدلہ کس سے لے گی"

"اس کے قاتل سے"

"پولیس کی تفتیش تو تُو نے بند کرادی۔ سب کو کہدیا۔ کہ تیرے ویر کا کوئی دشمن نہیں قاتل ملے گا کیسے ـــــ"

"ہونہہ" وہ تلخی سے بولی ـــــ پھر ایک گہری سانس لے کر سر قبر پر رکھ دیا۔

راجو کئی لمحے اسے تکتا رہا ——

"نجو"

"نجو"

"نجو"

اس نے بار بار بلایا تو نجو نے سر اٹھایا —— اس کے بالوں میں مٹی لگ گئی تھی —— مٹی جھاڑنے کی نجو نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

"راجو" اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے راجو کو دیکھا

"ہاں"

"تو روز یہاں نہ آیا کر"

"کیوں"

"کیا لینے آتا ہے یہاں"

"تجھے تسلی دینے"

"میری تسلی باتوں سے نہیں ہوتی"

راجو چپ ہو گیا۔

"تو یہاں نہ آیا کر راجو" نجو نے مستحکم لہجے میں کہا

"تیری یہی مرضی ہے۔ تو میں نہیں آیا کروں گا" راجو کی آواز حلق ہی میں گھٹ گئی ——

"تو یہاں آتا رہا نا — تو — تو میں ——"

"کہدے کیا کہنا ہے نجو ——"

"راجو میں نے اپنے ویر کا قرضہ چکانا ہے۔ تو میری راہ میں آگیا۔ تو یہ قرضہ اُترے گا نہیں —— میں نے اپنے ویر کے خون کی قسم کھائی ہے۔

اس کے سہرے اور خون میں ڈوبے کپڑوں کو دیکھ کر عہد کیا ہے ــــ
کہ ــــ " وہ بڑے جوشیلے لہجے میں مٹھیاں بند کرکے بولتے بولتے
ایک دم چپ ہوگئی
راجو جلدی سے بولا ــــ " نجو ــــ چپ کیوں ہوگئی ہو ــــ
بتاؤ نا۔ کیا کہہ رہی تھیں ــــ "
" کچھ نہیں ــــ " وہ اپنی چادر جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
" مجھ سے بھی چھپاتی ہو باتیں " راجو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
" راجو تم چلے جاؤ "
" نجو "
" میں نے کہا ہے راجو تم چلے جاؤ ــــ تم مجھے میری راہ سے بھٹکا دوگے "
" کیا کہہ رہی ہو نجو ــــ "
نجو نے اس کے سراپا پر اک گہری نگاہ ڈالی ــــ پھر چادر اچھی طرح
سے لپیٹتے ہوئے پلٹی ــــ
راجو قدم بڑھا کر اس کے سامنے آگیا ــــ " کھل کر کہو کیا کہنا چاہتی ہو "
نجو نے دوسری طرف سے راستہ بناتے ہوئے کہا " مجھے دیر ہو رہی
ہے۔ میری راہ نہ روکو راجو ــــ میں نے آج کوٹلی بھی جانا ہے "
" کیوں "
" وہاں میرے ویر کی جھلی کملی دوہٹی (دلہن) ہے۔ بیگاں ــــ اسے
دیکھنے ــــ "
راجو نے اک ٹھنڈی آہ بھری " پیار کی لاج رکھ لی بیگاں نے ہوش
کھو کر "

"مجھ سے تو وہی اچھی ہے — مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہو گی نافضل سے — میں کیوں جھلی نہ ہو گئی راجو ——"

راجو دکھ بھری نظروں سے اسے تک کر رہ گیا۔

نجو خود ہی بولی "بیگاں نے بھی اپنا بار مجھ پر ڈال دیا ہے۔"

راجو نجو کی باتوں سے کچھ بھی نہ سمجھ سکا —— وہ یہی سوچ کر چپ ہو گیا کہ نجو کے دل و دماغ پر اس صدمے نے بیحد بُرا اثر کیا ہے۔ اسی لئے بے سر و پا باتیں کر رہی ہے۔

نجو آہستہ آہستہ چلتی قبرستان سے باہر آ گئی۔ راجو اس کے ساتھ ساتھ باہر آیا۔

پھر

وہ اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ہو لی۔ راجو قبرستان کی پکی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا اسے جاتے تکتا رہا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ مشرقی گوشہ آسمان پر نورانی سا اجالا پھیلا تھا۔ باقی آسمان پر ابھی دُھندلے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ نجو بستر سے نکلی۔ اور گرم چادر کو لپیٹ کر صحن میں نکل آئی۔ سردی کا زور اب ٹوٹتا جا رہا تھا۔ گاؤں کے باسی تو اب اس سردی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن رات کا یہ آخری پہر خاصہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔

نجو نے نماز پڑھی اور دیر تک مصلے پر بیٹھی دعا مانگتی رہی۔ وہ بھائی کی مغفرت کی دعا مانگ رہی تھی۔ یا اپنے عہد کے استحکام کی خدا سے دعا گو تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔

فضل کا چالیسواں ہو گیا تھا۔ تعزیت کو آئے لوگ واپس جا چکے تھے۔ سب کی زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ وہی ماسی رابو اور اس کا گڑگڑاتا حقہ تھا وہی کمو تھا وہی جیراں اور وہی اس کی تینوں بیٹیوں کے حویلی کے مشترکہ کام۔ کبھی کبھی کوئی افسوس کرنے آ جاتا —— تو فضل کی باتیں ہونے لگتیں۔ ہاں نجو کی زندگی معمول پر نہیں آئی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ بھائی کی جُدائی کا تیر زیادہ ہی کلیجے کے پار ہو رہا تھا۔ بیگاں کی ہوش سے بیگانگی بھی سینے کا چرکہ تھی۔ نجو کسی کسی دن اسے دیکھنے چلی جاتی تھی۔

وہ کل بھی کو ملی گئی تھی۔

بیگاں کے گلے لگ کر وہ چیخ چیخ کر روئی تھی۔

"بیگاں —— مجھے دیکھ بیگاں۔ میں فضل کی بھین ہوں۔ فضل تو تجھے دغا دے گیا۔ میں تو تیرے سامنے ہوں۔ مجھ سے باتیں کر مجھے پہچان۔ مجھے بتا —— میرے وِیر کی باتیں مجھے بتا ——"

لیکن

نجو کی کسی بات کا بیگاں پر اثر نہ ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ مسلسل ہاتھوں کو گھورتی رہی تھی۔

ہاتھوں کی مہندی کا رنگ اب اُڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہاتھوں کو تکتی رہتی تھی۔ اور تکتے تکتے "لہو لہو لہو" چیخنے لگتی تھی۔ اس سے زیادہ اسے جیسے کچھ کہنا ہی نہ آتا تھا۔ ماں باپ بھائی بہن سبھی تھک ہار رہے تھے نجو نے کوشش کی تھیں۔ لیکن بیگاں کے ذہن پر صدمے نے ایسا وار کیا تھا۔ کہ ٹھکانے پہ آتا ہی نہ تھا۔

نجو کو ایک طرف بھائی کی جُدائی تڑپاتی تھی۔ دوسری طرف بیگاں کی ہوش و خرد سے بیگانگی —— بیگاں نے پیار میں یوں لٹ کر نجو کے دل میں جو مقام بنا لیا تھا۔ وہ عقیدتوں کا مرکز تھا۔

بیگاں پر جس ظالم نے ایسا ظلم ڈھایا تھا۔ اس کو نجو معاف نہیں کر سکتی تھی ——

نماز سے فارغ ہو کر وہ مصلے سے اٹھی۔ مصلا تہہ کر کے ایک طرف رکھا۔ پھر مٹی کے گھڑے کے اوپر ڈالے پھولوں کے ہار تھالی میں رکھے اور صحن پار کر کے دروازے سے باہر نکل گئی

دن ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی آسمان کی سیاہیاں نیلاہٹوں میں بدل رہی تھیں۔ گلیوں میں اِکا دکا بزرگ نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں رکھوالی کو سونے والے ابھی کھدر کے لال لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ قریب بندھے ڈھور ڈنگروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں ان کی خفیف سی حرکت سے بج اٹھتی تھیں۔ کھیتوں میں حد نگاہ گندم کی سر اٹھاتی فصل تھی۔ دن کی روشنی تا حال نہیں پھیلی تھی۔ اس لئے سبزہ کچھ سیاہی مائل نظر آ رہا تھا۔ پرندے ابھی درختوں کی شاخوں پر ہی پھڑ پھڑا رہے تھے۔

نجو پھولوں کی تھالی اٹھائے چادر کی بکل مارے قبرستان کی طرف جا رہی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ یہاں آنی ضرور تھی۔ کبھی تو فجر کی اذان سے پہلے ہی آ جاتی۔ کبھی نماز پڑھ کر۔

وہ کچے راستے سے ہوتی پگڈنڈی پر آئی۔ اور پھر پنڈ کے اس طویل و عریض شہر خاموشی میں داخل ہو گئی۔ قبریں ہی قبریں تھیں۔ برسوں پرانی بھی نئی بھی —— ٹوٹی پھوٹی بھی اور خاردار جھاڑیوں سے چھپی بھی۔ کئی پکی اینٹوں سے بنی قبریں تھیں۔ سرہانے کتبے لگے تھے۔ کئی بالکل بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے کھلے دہانے خوفناک لگتے تھے۔

لیکن

نجو کے من میں تو خوف و ہراس تھا ہی نہیں۔ وہ تو یوں کھنچی چلی جا رہی

تھی۔ جیسے مقناطیسی کشش ہو۔
تازہ مٹی کے ڈھیر کو اس نے دُور سے دیکھا۔ ایک لمحہ کو وہ ٹھٹکی کوئی
قبر کے سرہانے سر جھکائے کھڑا تھا۔
"راجو" نجو کے لبوں سے نکلا — پھر اس نے اک گہری آہ بھری
اور آہستہ آہستہ چلتے قبر تک آپہنچی — اس نے دیکھا وہ راجو نہیں تھا۔
وہ
وہ
تاج سکھیرا تھا —
تاج
سکھیرا
نجو کے اندر ہی اندر جیسے اک خوفناک زلزلہ آگیا۔ اس سے کھڑا رہنا
مشکل ہوگیا وہ مٹی کے اس ڈھیر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کی
آنکھیں جلنے لگی۔ اس کی کنپٹیاں پھڑپھڑانے لگیں — اس کے دماغ
میں آتشیں غبار بھرنے لگا۔ پھولوں کی تھالی گر گئی تھی — نجو مٹی میں مٹھیاں
یوں بھر رہی تھی۔ جیسے فضل کو جھنجھوڑ رہی ہو —
"تم ملک فضل کی بہن ہو نا" تاج نے آہستگی سے کہا۔
نجو نے قبر پر سر رکھ دیا — اور اس کے منہ سے بڑے ہی جذباتی
انداز میں نکلا۔
ویرا — ویرا"
تاج بھی لہر کے سرہانے بیٹھ گیا۔
"تمہارا نام نجو ہے نا" اس نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

نجو نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا ۔ فیصلوں کی کئی منزلیں وہ پار کر چکی تھی ۔ فضل کا خون میں ڈوبا سہریوں والا چہرہ اس کی نگاہوں میں جذب ہو رہا تھا — بیگاں کی ہوش و خرد سے بیگانہ شکل ذہن میں کلبلا رہی تھی —

"نجو ہو نا تم" تاج نے پھر پوچھا

"ہاں" اک آہنی آواز نجو کے نحیف سے وجود سے نکلی

تاج سراپا اشتیاق اسے تکنے لگا ۔

نجو بھی اسے تک رہی تھی ۔

"بڑا افسوس ہے ۔ ملک کے مرنے کا" تاج کو کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی ۔

نجو نے کھلی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اضطرابی عالم میں قبر پر پھیلائے ہاتھوں سے مٹی کی مٹھیاں بھرنے لگی ۔

"تم مجھے پہچانتی ہو ؟" تاج نے چند لمحے بعد پوچھا ۔ نجو کی نظروں کی وہ تاب نہ لا رہا تھا — اسے یوں لگ رہا تھا ۔ جیسے یہ نظریں اس کے آر پار ہوتی جا رہی ہیں "

"پہچانتی ہو مجھے"

"ہاں"

"میں تاج ہوں"

"تاج محمد سکھیرا"

"ہاں ۔ بالکل بالکل ۔ تو تم مجھے پہچانتی ہو"

"بہت اچھی طرح سے پہچانتی ہوں"

آواز تاج کے اندر کسی کٹار کی طرح اتر گئی۔ لیکن اس نے پہلو بدل کر
نجو کو دیکھا اور بولا "ملک اچھا آدمی تھا۔ بڑا جیالا۔ بڑا بہادر"
"کینہ پرور بزدل دشمن کے ہاتھوں مارا گیا"
تاج کا دل دھک سے ہوا۔ جلدی سے نجو کو دیکھا اور ہکلاتے ہوئے
بولا "تم۔ تم میرا مطلب ہے اس کے دشمن کا پتہ چلا"
نجو نے اک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی اور گہری آہ بھر کر بولی "نہیں۔"
"سنا ہے تم نے تفتیش بھی رکوا دی ہے"
"ہاں"
"کیوں"
"کوئی فائدہ نہیں تھا"
"شاید دشمن کا پتہ چل جاتا"
"میرے ویر کا کوئی دشمن نہیں تھا"
"واقعی"
"ہاں"
"پھر کس نے؟"
"رب جانے"
"کوئی تو ہوگا۔ کسی سے تو دشمنی ہوگی"
"کسی سے بھی نہیں۔ میرے ویر کا کسی سے بیر نہیں تھا۔ اس نے تو
اپنے سب سے بڑے دشمنوں کو بھی معاف کر دیا تھا ——"
"سکھیروں کو"
"تم اچھی طرح جانتے ہو"

"ہاں ۔ مجھے اعتراف ہے ۔ فضل نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا — پرانی دشمنی ختم کر ڈالی تھی —"

"ہوں"

"اسی لئے تو اس کے مرنے کا دُکھ ہے —"

"تمہیں دُکھ ہے ؟"

"ہاں"

"میرے دُکھ کا اندازہ کر سکتے ہو — ؟ ویر مارا گیا اور بیگاں اس صدمے سے پاگل ہو گئی —"

"اوہو —"

"تم نہیں جانتے بیگاں کے متعلق —"

"نہیں"

"تو سُن لو — وہ پاگل ہو گئی ہے —"

تاج نجو کے انداز تکلم سے کچھ گھبرا گیا من میں چور جو تھا — لیکن اپنے آپ پر اسے اعتماد بھی تھا — سنبھل کر بولا — بیچاری پر صدمہ ہی ایسا گزرا —"

"صدمہ تو مجھ پر بھی گزرا — لیکن میں — پاگل نہیں ہوئی — سکھیرے —"

وہ چپ ہو گیا ۔

نجو کے چہرے پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی ۔ اس کی آنکھوں میں خیرہ کن چمک لہرائی — وہ تیز تیز سانس لینے لگی ۔ اک پھنکار سی اس کی سانسوں میں گھل رہی تھی ۔

تاج قبر کے سرہانے بیٹھا تھا۔ نجو قبر کے پہلو میں تھی۔ وہ بڑی مضطرب تھی۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا رہی تھی۔

تاج کے سینے میں نجو کو پا لینے کے جذبات مچل رہے تھے۔ سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ نجو کی قربت سے مسحور ہو رہا تھا۔

کئی لمحے گزر گئے۔

"تم یہاں روز آتی ہو" تاج نے پوچھا

"ہاں" نجو بولی

"کل بھی آؤ گی" تاج نے اپنا شوق چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

"روز آتی ہوں" نجو نے بھی یوں کہا۔ جیسے اسے آنے کی دعوت دے رہی ہو۔

"میں جتنے دن یہاں ہوں۔ جی چاہتا ہے روز ملک فضل کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آؤں"

"کیوں"

"وہ میرا بہترین دوست تھا"

"اچھا! ؟ ؟ ؟"

"ہاں"

"تو آجایا کرو۔ ثواب ہی کا کام ہے"

"بالکل ——"

"فاتحہ پڑھ لیا"

"ہاں۔ اب میں جاؤں۔ دن نکل آیا ہے"

"روشنی سے ڈرتے ہو۔ سچی ہوتی ہے نا۔ اسی لئے ڈرتے ہو"

"نہیں تو"

نجو ہنس پڑی۔ اور اس کے ہنسنے کی ادا پر تاج لوٹ پوٹ گیا۔

چند لمحوں بعد وہ نجو کو خدا حافظ کہہ کے واپس چل دیا۔ وہ پہلے ہی دن نجو پر اپنے جذبات واضح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو آج نجو سے ملنے آیا تھا۔ اونچ نیچ اسے پرکھنے اور اس کے خیالات جاننے کے لئے آیا تھا۔

وہ قبریں پھلانگتا خاردار جھاڑیوں سے دامن بچاتا ہڑیالے کی طرف جا رہا تھا۔ نجو ایک ٹک اسے تکتی رہی۔ دو ایک بار تاج نے مڑ کر اسے دیکھا اور اپنی طرف ہی تکتے پایا۔

اپنی کامیابی کا اسے کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔

شرا دو بیگی اور رتو فضل کے دالان میں بچھی دری پر بیٹھی تھیں۔ نجو کے
کے پاس وہ اکثر آ بیٹھتی تھیں۔ مطلب نجو کو بہلانا ہوتا۔ وہ خود تو بہت
کم بولتی چالتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں اِدھر اُدھر کی باتوں میں اسے لگائے
رکھنے کی پوری کوشش کرتیں۔

شام کچھ زیادہ ہی ٹھنڈی تھی۔ جھکڑ نما ہوائیں سارا دن چلتی رہی تھیں
مطلع بھی ابر آلود تھا — بارش ہونے کا امکان تھا — جیلاں نے
مٹی کی انگیٹھی میں چولھے کی راکھ اور کوئلے ڈالے تھے۔ وہ انگیٹھی دالان
میں اٹھا لائی — کمرے میں روشنی کے لئے اس نے پیتل کا لیمپ
بھی جلا دیا۔

نجو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی۔ کہ اس کی نظریں
سامنے کی دیوار پر لگی کھونٹی پر تھیں۔ اس کھونٹی پر فضل کے خون آلود
کپڑے اور سرا ٹنگے تھے۔ نیچے زمین پر طلے والا کھسہ رکھا تھا —
شادی کا یہ خون آلود جوڑا مع جوتوں کے نجو نے کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔

بنارسی پگڑی بھی کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ خون کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ اور کپڑے اکڑ گئے تھے۔

لڑکیاں فضل کی باتیں کر رہی تھیں۔ نجو جیسے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ وہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہائے بھا فضل۔ کتنا اچھا تھا۔ مجھے تو کہا کرتا تھا۔ تیرے لئے تجھ جیسا کالا کلوٹا دولھا لاؤں گا"، رتو یادوں میں کھو کر بولی۔

"مجھے بھی تو چھیڑا کرتا تھا — ہائے کتنا مخولی تھا بھا فضل" شادو نے کہا۔

"جہاں بیٹھتا رونق لگا دیتا"، بیگی بولی۔

"اس عید پر مجھے بھی شہر سے جوڑا لا کر دیا تھا۔ کہنے لگا تو بھی میری نجو جیسی پھلین ہے"

"مجھے بھی عیدی دی تھی"

"میرے لئے شہر سے کوئی نہ کوئی چیز لے کر ضرور آتا"

"وہ نجو کی سہیلیوں کو اپنی بہنیں ہی سمجھتا تھا"

"آہ — ! — کتنے دن گزر گئے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کبھی دنیا میں آیا ہی نہیں تھا — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپ گیا —"

"نہیں — نہیں — وہ چھپ نہیں گیا" نجو بڑبڑائی۔ سب لڑکیاں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ ویر کی دیوانی نجو چنبیلی کے پھول کی طرح زرد ہو رہی تھی — لڑکیاں سمجھیں وہ ہوش میں نہیں ہے۔ وہ سہرے کو ایک ٹک جو تکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"نجو" رتو نے اس کے کندھے کو ہلایا۔

"ہاں"

"کیا کہہ رہی ہو"

"کہہ رہی ہوں۔ میرا دِیر چھپ نہیں گیا۔ وہ دیکھو سہرے میں سے
اس کا چمکتا ہوا چہرہ مجھے دیکھ رہا ہے"

لڑکیاں کچھ خوفزدہ سی ہو کر ایک دوسرے کے قریب سمٹ آئیں۔
اور حیرانگی سے سہرے کو تکنے لگی۔

"نجو" رتو نے ذرا ہمت کی اور نجو کو پھر مخاطب کیا۔

"ہاں" نجو نے نظریں وہاں سے ہٹا کر لڑکیوں کو دیکھا۔

"ایک بات کہوں نجو ——" رتو بولی

"کہہ"

"میری بات مانے گی"

"مان لوں گی"

"تو یوں کر —— یہ سہرا اور کپڑے اللہ واسطے کے دے دے
کسی کو"

نجو نے گھبرا کر رتو کو دیکھا۔ وہ سرتاپا کانپ گئی "کیوں"

"جب تک یہ کپڑے اور سہرا تیری نظروں کے سامنے رہے گا۔ تو
بھا فضل کو بھلا نہ سکے گی"

"رتو —— رتو —— میں کیسے بھلا سکتی ہوں اسے۔ کیوں بھلاؤں
اسے ——"

"ٹھیک ہے" شادو نے کہا "بے شک وہ تجھے کبھی نہیں بھول
سکتا لیکن تو یہ سب چیزیں یہاں سے ہٹا دے —— کیا ملتا ہے تجھے

نجو — دل زیادہ ہی تڑپتا رہتا ہے نا یہ دیکھ دیکھ کر —"

"تم کیا جانو پگلیو —" نجو نے گہری سانس لی۔ پھر آہستگی سے بولی "مجھے اپنے ویر کا خون سے بھرا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں وہی دیکھتی رہتی ہوں"

"کیا ہوتا ہے اس سے"

"بہت کچھ"

"تیرا خیال ہے جھلّئے۔ ورنہ بچھڑے اور مرے ہوئے کہاں ملتے ہیں —"

"مجھے تو میرا ویران کپڑوں اور سروں میں دکھائی دیتا ہے — اس کا چہرہ خون خون ہے۔ نچڑ رہا ہے خون — خون —"

لڑکیاں ڈرنے لگیں — سہمی سہمی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے قریب قریب ہو بیٹھیں۔

نجو "ذرا ہٹ کر بیٹھی انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے بولی" فضل تیرا تو ویر تھا — تجھے تو اس کے بچھڑنے کا جو دکھ ہے سو ہے خود مجھے یوں لگتا ہے۔ کہ بھا فضل کے مرنے سے ساری حویلی اندھیری ہو گئی ہے یہ چراغ یہ لیمپ یہ بتیاں بھی اس اندھیرے کو دور نہیں کر سکتیں — لگتا ہے بھا فضل ہی روشنی تھا — جو ہر طرف پھیلی رہتی تھی — پر اب اپنے دل کو ڈھارس دے۔ صبر کرے گی تو آئے گا۔ اس طرح تو تو بھی بیگاں کی طرح ہو جائے گی"

"ہاں ہاں" شادو بولی۔

"اِدھر اُدھر دھیان کیا کر" رتو نے کہا "ہمارے گھر ہی چلی آیا کر"

"جب تک یہ سہرا اور کپڑے یہاں سے نہیں ہٹیں گے نجو کی حالت ٹھیک نہیں ہوگی ——" شادو نے کہا

"نہیں —— سکھیو" نجو نے گہرے گہرے بے اطمینانی کے سانس کھینچتے ہوئے کہا "نجو کی حالت تو اس دن ٹھیک ہوگی۔ جس دن وہ اپنے ویر کے قاتل سے بدلہ لے گی —— بیگاں کے جھلی ہونے کا انتقام لے گی ——"

لڑکیاں حیرانگی سے نجو کو دیکھنے لگیں۔ وہ اب بھی کپڑوں اور سہرے کو تکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"کبھی کبھی مجھے اس سہرے میں اک مکروہ چہرہ نظر آتا ہے۔ اور میں — میں —— میں یہی چاہتی ہوں۔ اس چہرے پر بھی ایسا ہی سہرا ہو —— خون سے بھرا ہوا —— خون آلود چہرے پر خون میں ڈوبا سہرا —— پھر — پھر ——"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"نجو —— نجو" لڑکیوں نے اسے جھنجھوڑا۔ بیگی کچھ زیادہ ہی ڈر گئی۔ وہ جلدی سے دالان سے مائی رالبو اور رسوئی گھر سے جیراں اور بکو کو بلانے گئی۔

"اے مائی رالبو —— مائی رالبو ——" اس نے لحاف میں پڑی رالبو کو جھنجھوڑ ڈالا

"کیا ہے"

"ابھی سے سو گئی ہے ——"

"نہیں سونا کیسا دھی۔ نیند تو فضل ساتھ ہی لے گیا۔ تجھے کیا ہوا ہے"

"مجھے نہیں نجو کو کچھ ہو گیا ہے"

"ہائے میں مرگئی"
ماسی رابو لحاف پرے پھینک اُٹھ بیٹھی۔ "کہاں ہے وہ"
"بھا فضل کے دالان میں"
بیگی اسے اٹھا کر رسوئی گھر کی طرف لپکی "وَے بکو۔نی جیراں"
"کیا ہے — کیا ہوا" چولھے کے پاس بیٹھی جیراں لڑکی کو ہراساں دیکھ کر بولی۔ بکو بھی پیڑھی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ حیرانگی سے اسے دیکھ کر بولا
"نجو کو کچھ ہو رہا ہے" بیگی واپس پلٹی
"ہائے اللہ"
"میرے ربا"
دونوں اس کے پیچھے بھاگے۔ صحن میں ابھی ابھی چوہدری سردار اور محمد حسین آئے تھے۔ انہیں یوں بے ترتیبی سے بھاگتے دیکھا تو حیران ہوئے
"کیا ہوا — کیا ہوا" کہتے وہ بھی دالان میں آگئے۔
لڑکیاں خوفزدہ تھیں۔
"کیا ہوا ماں صدقے" ماسی رابو نے اپنے ہلتے جلتے وجود کو نجو کے قریب پٹخ دیا اور نجو کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔
"دھئی — کیا ہوا" چوہدری سردار اور محمد حسین نے بھی پوچھا۔
"کچھ نہیں چاچا" نجو نے اپنے آپ کو ماسی رابو کے نرغے سے نکال کر دونوں بزرگوں کی طرف دیکھا۔
"آؤ بیٹھو چاچا" اس نے فضل کے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔
دونوں نے آگے بڑھ کر باری باری نجو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا اور

دعائیں دیتے ہوئے بولے "رانے صبر کر — تو جتنی بے چین رہے گی تیرے ویر کی روح کو اتنی ہی تکلیف ہوگی"

"میرے ویر کی روح کو تکلیف رہے گی چاچا۔ جب تک اس کے قاتل سے میں بدلہ نہ لیا جائے گا"

"اوئے جھلئے دھئی — "چوہدری سردار نے آہ بھر کر کہا "کاش تیرا کوئی اور ویر ہوتا — یا چاچا ماما ہی ہوتا — ڈھونڈ نکالتا قاتل کو — تو نازاں پلی دھی ہے — کہاں سے ڈھونڈے گی قاتل کو — پتہ ہی نہیں چلا کون ظالم تھے"

"نہ سوچا کر ایسی باتیں" محمد حسین نے کہا

"چاچا" جلدی سے رتو بولی "جب تک بھا فضل کا یہ سہرا اور کپڑے یہاں ٹنگے رہیں گے۔ یہ ایسی ایسی باتیں سوچتی ہی رہے گی"

"میں نے تو کتنی دفعہ سمجھایا ہے" رالو بولی۔ "مرنے والوں کے ایسے کپڑے گھر میں نہیں رکھا کرتے"

"بالکل بالکل" شادو نے کہا۔

"سہرے کو کہیں دفن ہی کر دینا چاہئے" بکو بولا — "یہ تو سینے پر آرے کی طرح لگتا ہے"

سب نے کچھ نہ کچھ کہا — لیکن نجو بولی "ابھی وقت نہیں آیا —"

"کب آئے گا" رتو نے پوچھا۔

"جب ایسے ہی کپڑے میرے ویر کے قاتل کے بھی رہ جائیں گے" نجو نے مستحکم آواز میں کہا — "ایسا ہی خون میں لتھڑا سہرا! — ایسے

ہی کپڑے ——"

ماسی رالبو سر پر ہاتھ رکھ کر بین کرنے لگی - لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ——

چوہدری سردار اور محمد حسین نجو کو تسلیاں دینے لگے -

نجو

اس وقت

تسلیوں سے بے نیاز دکھائی دے رہی تھی -

قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ تاج چلا جا رہا تھا۔ اس نے خوبصورت اور قیمتی گرم دوشالہ کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ اور سگریٹ کے کش لیتا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رومال تھا جس میں پھول تھے۔

پو پھٹ چکی تھی۔ اک ملگجا سا اجالا چاروں طرف پھیلا تھا۔ نمازی گاؤں کی باہر والی مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ فجر کی نماز زیادہ تر لوگ وہاں ہی پڑھتے تھے۔

تاج نجو کے لگن میں قبرستان جا رہا تھا۔ وہ روزانہ بھائی کی قبر پر آتی تھی۔ ملنے کا اچھا موقعہ اور بہانہ تھا۔ کل بھی وہ اسے یہیں ملا تھا۔ اک نشہ سا اس کے حواس پر چھا گیا تھا۔ رات بھر وہ نجو ہی کے سپنے دیکھتا رہا تھا۔ وہ گھاگ شکاری تھا۔ نجو کو بھی طریقے اور سلیقے سے رام کرنا چاہتا تھا۔

ٹوٹی ہوئی منڈیر پھلانگ کر وہ قبرستان کے اندر آ گیا۔ فضل کی قبر مشرقی طرف ایک چھدرے سے درخت تلے تھی۔ تاج نے دور ہی سے دیکھا۔ قبر کے پہلو میں نجو بیٹھی تھی۔ خوشی کی اک لہر سی تاج کے من میں دوڑ گئی۔

وہ قبریں پھلانگتا وہاں جا پہنچا۔

نجو قبر پر سر رکھے بازو مٹی پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ تاج چند لمحے قبر کے قریب کھڑا رہا پھر ہولے سے کھنکارا۔

نجو نے سر اٹھایا گال پر لگی مٹی جھاڑتے ہوئے تاج کو دیکھا۔

تاج قبر کے دوسری طرف دوزانو ہوتے ہوئے بولا "میں کچھ پھول چڑھانے آیا تھا ——"

نجو ایک لمحہ کو بت بنی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ہونٹوں پر اک دلنواز مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولی "تم آ گئے"

"ہاں ——"

"پھول چڑھانے آئے ہو"

"بالکل یہ دیکھو"

تاج نے پھول اور پتیاں قبر پر پھیلا دیں۔

نجو نے اک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

تاج نے جلدی سے نجو کی طرف دیکھا "کیوں ہنسی ہو"

"تم بھی چاہتے ہو۔ کہ میں ہمیشہ روتی رہوں"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں"

"تو ——"

"ویسے ہی تمہارا قہقہہ —— خیر —— میں تو چاہتا ہوں۔ تم سدا ہنستی مسکراتی رہو"

"سچی"

"بالکل"

تاج محبت بھری نظروں سے بنجو کو تکنے لگا ـــ بنجو کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی ـــ وہ مسکراتے ہوئے بولی

"فاتحہ نہیں پڑھو گے"

"اوہ ہاں" تاج نے خفت سے کہا اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا دئے۔

"پڑھنا آتا بھی ہے یا ـــــ" بنجو پھر شوخی سے مسکرائی۔

"لو حد ہو گئی"

"تم تو شہری بابو بن گئے ہو نا ـــ سنا ہے شہری لوگ بے دین ہو جاتے ہیں"

"یہ کس نے کہا"

"سنا ہے"

"کہو تو اونچی آواز میں پڑھوں فاتحہ"

"نہیں ـــ دل ہی دل میں پڑھو ـــ دل کی باتیں دل ہی میں رہنی چاہئیں"

"لیکن ـــــ"

"کیا؟"

"دل کی باتیں دل میں رکھنے کا میں قائل نہیں ـــــ"

"کیا کہنا ہے کہہ ڈالو ـــ"

"کہہ دوں"

"کہو ـــــ"

"برا تو نہیں مان جاؤ گی"

"نہیں ـــــ"

"اچھا فاتحہ پڑھ لوں پہلے"

وہ فاتحہ پڑھنے لگا۔ نجو اس کے پھول قبر پر پھیلاتے ہوئے بڑبڑائی۔
"ویر ــــ آج تیری قبر پر پھول چڑھے ہیں ــــ دیکھ تیرے بجن کیسے کیسے لوگ ہیں ــــ ہوں ــــ ہیں نا ــــ"
وہ پھر تلخی سے مسکرائی۔
ہاتھ چہرے پر پھیر کر تاج نے نجو کی طرف دیکھا ــــ "نجو"
"ہاں"
"تو تو بالکل اکیلی رہ گئی ہے نا"
"ہاں ــــ بالکل اکیلی ــــ"
"تیری ــــ"
"کیا کہنا چاہتے ہو"
"تیری منگنی ونگنی تو نہیں ہوئی نا ابھی"
"کیوں ؟"
"ایسے ہی پوچھ رہا ہوں"
"یہ بات ایسے ہی پوچھنے کی تو نہیں۔ کچھ تو ہے ــــ"
"سنا تھا فضل نے تیری بات ــــ"
"فضل کی بات گئی فضل کے ساتھ" چند لمحوں کے توقف کے بعد نجو نے سپاٹ لہجے میں کہا ــــ
"وہ راجو ــــ"
"ہاں فضل کو بہت پسند تھا"
"اس نے رشتہ بھیجا تھا تیرے لئے"
"تجھے یہ سب باتیں کس نے بتائیں"

"میں نے معلوم کرتی ہیں"

"کیوں ؟"

"نجو ـــ میں یہ کہو ـ کہ تو مجھے ـــ تو مجھے اچھی لگتی ہے ـــ تو ـــ"

نجو نے سر جھکا لیا۔ چند لمحے جھکائے ہی رکھا۔ اس کے من میں ایسی، اُتھل پتھل ہو رہی تھی کہ اس کا وجود جھٹکے پہ جھٹکے کھا رہا تھا۔

"بُرا مان گئی ہو" تاج نے گھبرا کر پوچھا۔

نجو نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ تاج کو کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ دیکھے گئی ـــ دیکھے گئی ـــ اس کا رنگ فق تھا۔ ہونٹ سوکھے تھے۔ حلق میں گولا سا پھنس رہا تھا ـــ

"کیا تک رہی ہے۔ بُرا مان لیا ہے ؟"

"نہیں ـــ"

"سچ نجو"

"ہاں ـــ"

"اور ـــ اور ـــ وہ ـــ جو راجو ہے ـــ"

"اس کی بات نہ کر"

تاج نے غور سے نجو کو دیکھا ـــ اس کو یقین نہ آیا۔ نجو اور راجو کے متعلق اس نے اڑتی اڑتی خبریں سنی تھیں۔ برات والے دن تو لوگ اس رشتے کے چرچے بھی کر رہے تھے۔ فضل نے کچھ لوگوں کے سامنے اس رشتے کا اعتراف کیا تھا ـــ میت دفنانے کے بعد بھی لوگ کچھ یہی باتیں کر رہے تھے۔

"شکر ہے فضل اپنے ہاتھوں بہن کا رشتہ طے کر گیا" یہ بات اس نے

کئی لوگوں کے منہ سے سنی تھی۔

"نجو ——"

"ہاں"

"تیرا رشتہ فضل نے راجو کے ساتھ طے کیا تھا؟"

نجو نے اپنا بے رنگ چہرہ اونچا کیا۔ اک آہ بھری اور بولی۔ "فضل نے جو کچھ کیا تھا وہ ختم ہو گیا ——"

"واقعی"

"ہاں"

"کیوں کیا راجو تجھے پسند نہیں"

"فضل کو پسند تھا"

"ہوں ——"

تاج کے چہرے پر خوشیاں لہریں لینے لگیں۔ دل بے اختیار ہو ہو کر دھڑکنے لگا —— اسے کہاں امید تھی۔ کہ اپنا مقصد اتنی جلدی پالے گا —— وہ تو راجو کو راہ کی دیوار سمجھ رہا تھا۔ اور اس دیوار کو گرانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ یہاں معاملہ ہی اور تھا ——

پھر بھی پورا یقین کرنے سے پہلے اس نے نجو سے کہا "راجو کے متعلق تو لوگ کہتے ہیں"

"کہ وہ میرا منگیتر ہے"

"ہاں۔ فضل نے برات والے دن کچھ لوگوں سے کہا تھا"

"اور تو جانتا ہے۔ کہ فضل اب اس دنیا میں نہیں"

"ہاں ——"

"وہ دل کی باتیں دل ہی میں لے گیا ——" نجو نے بڑے کربناک لہجے میں کہا "سارے ارمان —— ساری خوشیاں —— ساری باتیں —— اس مٹی کے ڈھیر میں دفن ہو گئی ہیں"

"تاج احمقوں کی طرح سر اثبات میں ہلانے لگا۔ وہ کئی لمحے چُپ رہا۔ تو نجو بولی " لیکن —— تو کیوں ان ساری باتوں کو کریدرہا ہے تاجے "

"مجھے تیرے اکیلا رہ جانے کا بڑا دُکھ ہے"

"واقعی —— ؟"

"ہاں"

"پھر کیا سوچا ہے ——"

"بتاؤں گا ——" وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرایا۔ تو جواباً نجو بھی مسکرادی۔

نجو کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔

"تاج اس مسکراہٹ سے اور لٹو ہو گیا۔ اس کے جذبات کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اور اس جذباتی ریلے میں اس نے نجو کے قبر پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

نجو نے کمال جرأت سے اس کا ہاتھ تھام لیا ——

"تاج نجو کے برف ایسے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس پاکر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے اس ہاتھ پر اس نے گرمجوشی سے دباؤ ڈالا۔

نجو نے ہاتھ نہیں چھڑایا بڑی مستحکم اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "تو نے ملکوں کی دھی اور ملک فضل کی بھین کا ہاتھ پکڑا ہے تاج سکھیرے"

تاج سہم گیا۔ ڈرتے ڈرتے نجو کی طرف دیکھا بمشکل آواز حلق سے نکلی

"ہاں" "یہ ہاتھ اب چھوٹے گا نہیں" وہ اس آہنی لہجے میں بولی۔
تاج خوشی سے جیسے دیوانہ ہوگیا۔ جلدی سے دوسرا ہاتھ بھی نجو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا ـــ "کبھی نہیں چھوٹے گا ـــ کبھی نہیں ـــ"
"ٹھیک ہے" نجو نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا۔ اور بولی "فضل نے ملکوں اور سکھیروں کی دوستی کا جو خواب دیکھا تھا۔ ہم اسے پورا کریں گے ـــ کیوں تاجے ـــ"
"بالکل بالکل" وہ تو جیسے خوشیوں کی یلغار سے بہکا جا رہا تھا۔
کئی لمحے گزر گئے
پھر نجو اٹھی۔ تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
"کل آؤ گی نا" تاج نے شوق اور بیقراری سے پوچھا
"ہاں" نجو نے اس کی آنکھوں میں مسکراتی آنکھیں ڈال دیں۔
چند لمحوں بعد وہ رب راکھا کہہ کر واپس چلا گیا۔ اور سر جھکائے سوچوں میں ڈوبی نجو آہستہ آہستہ چلتی گھر آئی۔

"تو بولا چپ چپ رہتا ہے بھارا جو"

"ہوں"

"کیا بات ہے"

"بات ؟"

"ہاں"

"کیا بتاؤں بھین رتو ——"

"کیوں"

"بس کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——"

"نجو نے کچھ کہہ دیا"

"یہی بات ہے بھین راجو ——"

"کیا کہا اس نے"

"کچھ نہیں —— بس ملتی نہیں اب —— دو چار دن قبرستان جاتا رہا، وہاں مل جاتی تھی اس نے وہاں آنے سے منع کر دیا"

"کیوں"

"پتہ نہیں ——"

"تو تُو جاکر پوچھ لے نا اس سے"

"کہاں جاؤں"

"اس کے گھر"

"دو تین دفعہ گیا ہوں — ماسی رابو اور بکو کے پاس ہی بیٹھ بیٹھ کر چلا آتا ہوں"

"کیوں — نجو گھر پہ نہ تھی"

"تھی"

"سامنے نہیں آئی"

"نہیں — فضل کے والان کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھی رہی"

"تیرے آنے کا اسے پتہ چلا"

"کیوں نہ چلا ہوگا - صحن میں اس والان کے باہر چارپائی پر بیٹھا رہا - ماسی رابو سے باتیں کرتا رہا - بکو سے باتیں کرتا رہا"

"ہوں"

"میرا دل بہت پریشان رہتا ہے بھین رتو — پتہ نہیں نجو کو کیا ہو گیا ہے"

"ہاں اسے واقعی کچھ ہو گیا ہے — مجھے تو اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ہی نظر نہیں آتی - میری کتنی پکی سہیلی ہے - پر میرے ساتھ بھی بس اوپری اوپری باتیں کرتی ہے ——"

"میرے متعلق کبھی کچھ کہا ——"

رتو نے نفی میں آہستہ آہستہ سر ہلا دیا۔ راجو جو پہلے ہی پریشان تھا — اور پریشان نظر آنے لگا۔

"صدمہ تو اس پر بڑا بھاری گزرا ہے" راجو بے چینی سے بولا — "پر وقت کے ساتھ ساتھ اسے صبر آنا چاہئے تھا"

"میں تو دیکھ رہی ہوں۔ کہ وہ دن بدن زیادہ ہی ڈوبتی جا رہی ہے ہر وقت سوچوں میں کھوئی رہتی ہے۔ گھر بار کا تو اسے پتہ ہی نہیں۔ کل میں گئی۔ تو بھا فضل کی زیور پیسے والی الماری کھلی پڑی تھی۔ میں نے بجو کو بتایا۔ تو بولی اب اور کیا لٹے گا رتو۔ سب کچھ تو لٹ گیا ——"

"اُف ——"

"بھا راجو"

"ہاں"

"تو اس سے کسی طرح مل — شاید تیرے سمجھانے سے اس کو صبر آجائے ——"

"یہی سوچتا ہوں۔ لیکن ملوں کہاں"

"ہائے ہائے — قبرستان تو وہ روز ہی جاتی ہے"

"لیکن اس نے مجھے منع کر دیا ہے وہاں آنے سے"

"کیا ہوا ——"

"میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا بھین رتو ——"

"تو یوں کر ——" رتو کچھ سوچنے لگی۔

"کیا؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"قبرستان سے باہر مل لینا —— وہ جس راستے سے جاتی آتی ہے۔

تجھے پتہ ہی ہے "

"ہاں "

"بس اس کی مرضی کے خلاف بھی نہ ہوگی بات اور تو بھی مل لے گا "

"یہ ٹھیک کہا تو نے"

"فجر کی نماز پڑھ کر اور کبھی اس سے پہلے جاتی ہے وہ "

"میں آدھی رات ویلے ہی راہ مل کر بیٹھ جاؤں گا "

رتو کو راجو کی بات پر ہنسی آگئی۔ لیکن وہ جس قدر پریشان تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر وہ ہنسی روک کر سنجیدگی سے بولی "میں آج نجو سے بات کروں گی ——"

"کس کی "

"تیری "

"کیا کہے گی اسے "

"کہوں گی جو مناسب ہوگا "

"کچھ نہ کہنا "

"کیوں "

"صبح میں خود اسے مل لوں گا"

"ٹھیک ہے "

راجو چوہدری نظام دین کی زمینوں میں واہی کرتا تھا۔ گندم کی فصل سر اٹھا رہی تھی۔ وہ ایک کھیت کے کنارے بیٹھا تھا۔ رتو اپنے باپ اور بھائیوں کو بھتہ دے کر واپس آرہی تھی —— علیک سلیک کے بعد نجو کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ راجو ان دونوں قدرے کم صم رہنے لگا تھا۔ رتو کے گھر بھی آتا تو خاموش

رہتا تھا۔ آج رتو نے موقعہ پاکر اس سے پوچھ ہی لیا۔

وہ نجو کی پکی سہیلی تھی۔ راجو اور نجو کے پیار سے واقف تھی۔ حالات یوں پلٹا نہ کھاتے تو اب تک نجو راجو کے سنگ ازدواجی زندگی کی بہاریں لوٹ رہی ہوتی۔ فضل نے اپنی شادی کے بعد اس کی شادی فوراً ہی کرنا تھی۔

"اچھا بھاراجو۔ میں چلوں"

"جاؤ"

"رب کرے کل نجو تجھ سے ٹھیک طرح ملے۔ کبھی کبھی تو وہ یوں ملتی ہے جیسے پہچانتی ہی نہ ہو"

"شادو بھی یہی کہہ رہی تھی"

"اس سے تو بات بھی نہیں کرتی۔ سارا وقت پتہ نہیں دروازہ بند کر کے اکیلی کیا کرتی رہتی ہے"

"روتی رہتی ہوگی"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ سب کے سامنے اب بالکل نہیں روتی۔ پر دل تو بھر آتا ہوگا نا۔ اسی لئے بند کمرے میں رو لیتی ہوگی"

"ہائے — ہائے — اللہ پاک اسے جانے کب صبر دے گا"

"میں تو بس دعا ہی کرتی رہتی ہوں — اچھا — بھاراجو — میں چلی"

"رب راکھا بھین"

"رب راکھا"

رتو کی تجویز راجو کو ٹھیک لگی۔ اس نے صبح نجو سے ملنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ دوسری صبح فجر کی اذان سے بہت دیر پہلے وہ اٹھ بیٹھا۔ کھیس کی کل ماری

اور نجو کی راہ دیکھنے اس طرف چلا گیا۔ جہاں سے وہ قبرستان جاتی تھی۔
انتظار کا ایک ایک لمحہ کٹھن تھا۔ وہ بیقراری کے عالم میں مصلیوں کے ٹوٹے پھوٹے کچے گھروں کی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا ـــــ دیواریں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ اور تازہ اور پرانے اپلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر بھی قریب پڑے تھے ـــــ ان گھروں میں صبح کی بیداری کے آثار ہوئے۔ بچوں کے رونے اور ماؤں کی تھپکانے کی آوازیں آئیں تو راجو آگے بڑھ گیا۔
آہستہ آہستہ چلتے وہ پانی کی آؤ تک آگیا۔ یہاں بھی اکا دکا لوگ جاگ اٹھے تھے ـــــ وہ سر جھکائے قبرستان کی طرف چل دیا۔ یہاں ویرانی تھی۔ سناٹا تھا۔ خاموشی تھی۔ ملگجا اندھیرا تھا۔
وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اس راستے پر جمی تھیں جس پر نجو نے آنا تھا۔
نجو آرہی تھی۔ راجو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کتنے دن ہو گئے تھے۔ دل کے اس جانی کو دیکھے ہوئے۔ شوق بے قرار ہوا ـــــ آرزو بھڑکی۔ تمنا بیدار ہوئی۔ اور وہ تیز قدم اٹھائے نجو کی طرف لپکا اس نے نجو کے سامنے آتے ہوئے پکارا ـــــ "نجو"
نجو نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ راجو اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اسے یوں لگا اس کی راہ میں راجو نہیں کوئی پہاڑ سی روکاوٹ آن کھڑی ہوئی ہے۔ وہ مضطرب ہوئی ـــــ لیکن عزم نے سنبھالا دیا ـــــ
"کیا ہے" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔
"نجو ـــــ تجھے دیکھے اتنے دن ہو گئے تھے۔ تجھے کیا بتاؤں مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میں تیرے بغیر اک اک پل جس اذیت سے گزارتا ہوں۔ تجھے کیسے

بتاؤں ——"

نجو نے کوئی جواب نہ دیا۔ راجو کے دائیں ہاتھ سے آگے گزر جانا چاہا

"نجو" راجو کا دل کٹ گیا۔ وہ اس کی طرف پلٹ کر انتہائی درد بھرے لہجے میں اسے پکار اٹھا ——

نجو نے صرف اک نظر اس پر ڈالی پھر بولی "مجھے قبر پر جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے ——"

"نجو —— تیرے اس ویرے سے —— میں مر جاؤں گا ——"

"ہونہہ —— کوئی نہیں مرتا راجو —— میں فضل کے لئے نہ مر سکی —— تو کون کسی کے لئے مرے گا"

"نجو ——"

"مجھے جانے دے۔ دیر ہو رہی ہے ——"

"میری بات تو سُن"

وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکی —— پھر راجو کو ایک گہری نظر سے دیکھا سر جھکایا اور آہستگی سے بولی "پہلے تو میری بات سن"

"کہہ ——"

"تو ادھر نہ آیا کر ——"

راجو کے سینے میں جیسے تیر کی انی چبھ گئی۔ بلبلا اٹھا "کیوں ——"

"بس میں نے کہہ دیا ہے۔ تو ادھر نہ آیا کر ——"

"تو مجھے مار ڈالے گی نجو ——"

"راجو"

"ہاں"

"تو مجھ سے پیار کرتا ہے نا؟"

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے"

"ہاں اقرار کر ——"

"کیسے یقین دلاؤں تجھے ——"

"میری بات مان کر ——"

"بجو ——"

"پیار کی منزلیں بڑی کٹھن ہوتی ہیں راجو —— مشکلیں پڑ جائیں۔ تو قربانی دینا پڑتی ہے ——"

"تجھے کون سی مشکل آن پڑی ہے بجو مجھے بھی تو بتا — میں تیرے ساتھ مل کر اس کو حل کر دوں گا ——"

وہ تلخی سے ہنس پڑی —— کربناک انداز میں راجو کو دیکھا اور بولی "تُو تو پہلے قدم پر ہی ڈگمگا گیا ہے —— میرا ساتھ دینے کے لئے تو پہاڑ کا جگر چاہئے ——"

"بجو تیری کوئی بات بھی مجھے سمجھ نہیں آتی ——"

وہ پھر زرناک ہنسی ہنستے ہوئے بولی "تو پیار کو جسمانی حدوں سے آگے نہیں لے جا سکتا راجو —— اس کی حدیں تو بہت دُور تک ہیں۔ بہت دور تک۔ تو ان تک نہیں پہنچ سکتا"

"بجو —— رب کے واسطے بھول بھلیوں میں مجھے نہ ڈال سیدھی سیدھی بات کر —— مجھے بتا دے تو کیا چاہتی ہے ——"

"یہی کہ تو ادھر نہ آیا کر ——"

"کیوں"

"اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اگر تیرا پیار اُچا اور سُچا ہے نا تو تُو
میرے راستے سے ہٹ جا —— اب ادھر کبھی نہ آنا ——"

نجو پلٹی ——

راجو گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آئی۔

نجو قبرستان کے اندر چلی گئی —— اس نے ایک بار بھی پلٹ کر راجو کو نہیں
دیکھا ——

راجو چند لمحے دل گرفتہ سا کھڑا رہا۔ پھر سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا واپس
آ گیا۔

ماما نظام دین اور مامی شہر سے آئے ہوئے تھے۔ نظام دین کو زمینوں اور فصل کی دیکھ بھال کے لئے کبھی کبھی گاؤں آنا پڑتا تھا۔ راجو بڑا ایماندار اور محنتی مزارع تھا۔ پھر بھی اپنی فصل کو دیکھنے کے لئے وہ آیا کرتا تھا۔

فضل کی شادی اور مرگ کے سلسلہ میں تو وہ کئی دفعہ آیا تھا۔ بیوی اور بچے بھی آئے تھے — چالیسویں پر تو دو دن رہے تھے۔

اب وہ راجو سے ملنے آرہا تھا۔ تو مامی بھی تیار ہو گئی تھی۔

"کیا کروگی" نظام دین نے پوچھا تھا۔

"بنجو کو دیکھ آؤں گی"

"لگتا ہے بنجو کی لگن تیرے من میں ہے ابھی"

"ہاں"

"لیکن فضل نے تو تیری بات کا جواب نہیں دیا تھا"

"اس بیچارے کو فرصت ہی کب ملی"

"میں نے تو سنا ہے اس نے بنجو کا رشتہ وہیں گاؤں میں کرنا تھا"

"کیا تو نہیں تھا نا ——"

"پتہ نہیں"

"میں جا کر پتہ کرتی ہوں۔ بیچاری لڑکی بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ ہم لوگ ہی اس کے کچھ لگتے ہیں — ہم نہ سوچیں گے تو کون سوچے گا"

"سکینہ بھی تو ہے"

"ہائے — ہائے — وہ بیچاری تو مر گئی جیتے جی۔ جوان بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔ وہ کیا سوچے گی نجو کے متعلق ——"

"تو چلو —— لیکن بات کس سے کرو گی"

"ماسی رابو سے ——"

"ماسی رابو کو ہوش مت ہی کہاں ہے"

"لو جی — اچھی بھلی ہے۔ صرف آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے — چندھیائی ہوئی لگتی ہیں — وہی تو اب سارے گھر کی کرتی دھرتی ہے —"

"عجیب ہی لگتا ہے"

"چل کر دیکھ لیتے ہیں نا۔ اب لڑکی کا رشتہ طے تو کرنا ہی ہے"

"ہمارا ہی طرح کے دور پار کے اور رشتہ دار بھی تو ہیں"

"ان سے بھی صلاح مشورہ کر لیں گے — لڑکی بڑی پیاری ہے — رشتہ ضرور لینا ہے میں نے"

ماما نظام دین مامی کو ساتھ لے آیا۔ مامی کو رشتہ تو جو پسند تھا۔ سو تھا۔ اب اس رشتے سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کہ ساری زمینوں کی مالک نجو ہی تھی اب کئی مربعے زمین اور باغات تھے۔ حویلی تھی سونا موتی تھا ڈھور ڈنگر تھے۔

دونوں حویلی آگئے۔ ماسی رابو صحن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ محلے کی دو تین عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی صحن میں کھیل رہے تھے جارد اور جیلاں آج مردانے کی بیٹھک کی صفائی کر رہی تھیں۔ اجڑ ہی گئی تھی بیٹھک۔ کوئی بھی تو نہ آتا تھا وہاں ـــــ جو کوئی بھی آتا تھا۔ گھڑی دو گھڑی ماسی رابو کے پاس صحن یا دالان ہی میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔

نجو فضل کے دالان میں تھی۔ دری پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے رحل پر جزدان سمیت کلام پاک رکھا تھا۔ سپارہ پڑھ کر اب وہ آنکھیں بند کئے ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔

چوہدری نظام دین اور مامی اب شہری طرز معاشرت اپنا چکے تھے۔ عورتیں دونوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ خاص کر مامی کے ہاتھ میں پکڑا بٹوہ ان کی دلچسپی کا باعث تھا۔

سلام و دعا کے بعد دونوں ماسی رابو کے پاس بیٹھ گئے۔

"نجو کہاں ہے" مامی نے پوچھا

"اندر سپارہ پڑھ رہی ہے" رابو کے ساتھ بیٹھی کالے کرتے اور نیلے تہمند والی عورت زمین پر پھیلتے اپنے بچے کو اٹھاتے ہوئے بولی۔

مامی اٹھ کر اندر گئی۔ نجو رحل اور کلام پاک الماری کے اوپر بنے طاقچے میں رکھ رہی تھی ـــــ

اس نے پلٹ کر مامی کو دیکھا ـــــ "سلام مامی"

"جیتی رہو" مامی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کب آئیں"

"ابھی ابھی"

"اکیلی"

"نہیں ــــ تمارا ماما بھی آیا ہے"

"کہاں ہیں"

"باہر بیٹھے ہیں ــــ"

نجو ماموں کو سلام کرنے باہر نکل آئی۔ مامی بھی دالان پر سرسری سی نگاہ ڈا
ہوئے باہر آگئی۔ فضل کا سہرا اور خون آلود کپڑے دیکھ کر اسے جھرجھری
سی آگئی۔

نجو نظام دین کو سلام کر کے ماسی رابو کے قریب چارپائی کے کنارے
بیٹھ گئی۔ گلی کی عورتیں اٹھ کر چلی گئیں ــــ بچے بھی ان کے پیچھے بھاگ گئے
مامی اور ماما دونوں فضل کی باتیں بڑے دکھ سے کرنے لگے۔ نجو کی آنکھیں
بھر بھر آئیں۔ لیکن وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسو آنکھوں ہی میں
پیتی رہی ــــ

رقیہ رسوئی گھر میں تھی ــــ جیراں نے مکھن دیگچی میں ڈال کر چولھے پر چڑھ
رکھا تھا گھی بنا رہی تھی ــــ کاڑھنی میں دودھ اُبل رہا تھا۔ جیراں نے رقیہ
کے ہاتھ دو گلاس دودھ کے باہر مہمانوں کے لئے بھجوا دئے۔

شہری لوگ دودھ کے کہاں عادی تھے۔ ماسی ہنس کر رقیہ سے بولی
"تیرا ستیاناس اتنا دودھ کون پئے گا ــــ"

"چائے بنوا دوں" نجو بولی۔

"پتی ہوگی" ماسی رابو نے پوچھا پھر آہ بھر کر بولی "فضل ساری چیزیں
شہر سے لاکر رکھتا تھا۔ اب تو ہوش ہی نہیں رہا ان چیزوں کا ــــ یہ ماں
بیٹیاں ہی اب بندوبست کرتی ہیں ــــ چیز ہے یا ختم ہوگئی انہیں ہی پتہ

ہوتا ہے ـــــ"

نجو خود اٹھ کر باورچی خانے میں گئی ـــ مختلف ڈبے چھتی رکارنس پر رکھے تھے۔ سب کے ڈھکنے کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک ڈبے میں چائے کی پتی مل گئی۔ اس نے رقیہ کو چائے بنانے کے لئے کہا۔

اور

خود پیڑھی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی طبیعت اکھڑی اکھڑی اور اچاٹ اچاٹ تھی ـــ دل کسی کام میں لگتا ہی کب تھا۔ لوگوں کی باتوں سے بھی اکتا جاتی تھی۔ ذہن میں اور ہی ادھیڑ بن ہوتی تھی۔

چائے پینے کے بعد مامی مانجی زابو کے قریب ہو بیٹھی۔ نجو دالان میں چلی گئی۔ اور دروازہ آہستگی سے بند کر لیا۔

ماما نظام دین زمین میں چلا گیا۔ پچھلے پہر انہوں نے واپس جانا تھا۔ اس لئے فصل دیکھنے اور دوسرے لوگوں سے ملنے چلا گیا۔ کچھ حساب کتاب بھی راجو سے کرنا تھا۔

مامی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی "فضل ایک دن ہمارے گھر آیا تھا ـــ"

"شہر"

"ہاں"

ماسی رابو بولی "ہاں مرنے سے کچھ دن پہلے کی بات ہے شاید"

"ہاں ہاں ـــ"

"بتایا تھا اس نے"

"میں نے شاہد کے لئے نجو کی بات کی تھی ـــ خیر سے وکیل بن گیا ہے۔

وکالت کر رہا ہے"

"ہاں پتہ ہے مجھے"

"اب نجو کے لئے آئے ہیں ہم"

"لیکن ——"

"کیا؟"

"نجو کا رشتہ تو فضل نے طے کر دیا تھا"

"کب؟ کہاں؟"

"یہیں اپنے پنڈ میں ——"

"کس کے ساتھ ——"

"اپنا راجو ہے نا ——"

"راجو ——" مامی حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی "ہمارا مزارع ——؟"

"ہاں ——"

"فضل کو اور کوئی نہیں ملا تھا ——"

"بس اپنی مرضی تھی نا —— اس کی ماں اور پھپھی کئی بار رشتے کے لئے آئیں ——"

مامی بڑے تمسخر سے ہنسی —— "حیرانی کی بات ہی ہے —— کیا دیکھ کر فضل نے رشتہ کیا"

"شرافت —— محنتی لڑکا ہے۔ پھر سب اس کے خاندان کو جانتے ہیں آج ان کے پاس زر ہے نہ زمین —— لیکن کبھی تو کئی مربعوں کے مالک تھے"

"ہونہہ ——"

"بی بی — جو فضل نے مناسب سمجھا تھا کیا تھا۔ ہمیں کیا پتہ اس نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا —"

"نجو راضی تھی"

"نجو سے اس نے پوچھا تھا یا نہیں ؟ مجھے نہیں پتہ۔ ہاں ایک دفعہ یہ ضرور پوچھا تھا۔ کہ اسے شہر پسند ہے یا گاؤں"

"تو"

"نجو نے کہا تھا۔ وہ پنڈ کی کُڑی ہے۔ پنڈ ہی میں جیئے مرے گی"

"ہوں"

"ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے بھین کا عندیہ لیا ہو"

مامی کے جوش و جذبے ٹھنڈے پڑ گئے — پھر بھی بولی "ہمیں تو کسی نے بتایا نہیں۔ کہ رشتہ طے ہو چکا ہے"

"ابھی بات اس نے اشارۃً ہی کی تھی۔ باقاعدہ رشتہ دینے کا تو اسے وقت ہی نہ ملا۔ ظالموں نے اسے مہلت ہی نہ دی —"

"ہوں"

رشتے کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ قتل اور قاتلوں کے متعلق مامی نے پوچھا "کچھ پتہ چلا ؟"

"نہیں —"

"تفتیش بھی رکوا دی تم لوگوں نے"

"کیا کرتے — ہمارا کون تھا۔ جو دوڑ دھوپ کرتا — کسی پر شک بھی نہیں آتا — فضل تو بڑا بیبا پتر تھا۔ اس نے تو سکھیروں کو بھی معاف کر دیا تھا سب سکھیرے شادی پر آئے تھے۔ دونوں پنڈ اس ملاپ سے خوش تھے۔"

مامی نے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی۔ کچھ دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مامی نے پوچھا " تو رشتہ طے ہے راجو اور نجو کا ـــــ"

" ہاں میرے خیال میں طے ہی ہے ـــــ فضل نے برات والے دن سنا ہے بیٹھک میں راجو کو بڑا پیار کیا تھا۔ اور کہا تھا یہ میری بانہہ ہے"

" بس ؟ ؟ "

یہی بتایا ہے لوگوں نے ـــــ فضل کی کھل کر مجھ سے بات تو نہ ہوئی تھی کبھی۔ ہاں جب بھی راجو کی ماں اور صاحباں رشتے کے لئے آئیں ـــــ وہ سنجیدہ ہو جاتا تھا ـــــ"

مامی سوچوں میں ڈوب گئی۔

ماسی رابو ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی " سب کچھ ادھورا ہی چھوڑ گیا فضل۔ آبادی کی جگہ بربادی ہو گئی ـــــ وہ تو اپنی شادی کے اگلے چن نجو کی ڈولی اٹھانے کا سوچ رہا تھا ـــــ ہائے ـــــ"

شام ماما اور مامی واپس چلے گئے۔ تو نجو نے ماسی رابو سے پوچھا " کیوں آئے تھے ماما مامی ـــــ"

" کیا کہتی فضل نے تو راجو کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ یہی کہہ دیا"

نجو کے کلیجے میں جیسے تیر اتر گیا ـــــ کرب و اذیت سے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

لیکن

دوسرے لمحے اس کے لبوں سے ہلکی سی پھنکار نکلی " ہونہہ ـــــ "

ماسی رابو کچھ نہ سمجھیں۔

نجو اٹھ کر دوسرے دالان میں چلی گئی۔

"راجو۔ سوہنیا"

"کیوں ماں"

"کیا ہوا ہے تجھے۔ جی تو ٹھیک ہے نا۔"

"بس — ٹھیک ہی ہے ماں"

"پریشان کیوں ہے اتنا"

راجو نے سر جھکا لیا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ننگی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ ماں قریب ہی پیڑھی پر بیٹھی چاول تھال میں ڈالے چن رہی تھی — پھوپھی صاحباں نے برآنڈے کے کونے میں بنے مٹی کے چولھے پر ہانڈی چڑھائے ہوئے تھی۔ وہ تھوم پیاز چھیل رہی تھی۔ راجو کچھ نہ بولا۔ تو ٹھنڈی آہ بھر کر صاحباں نے کہا "پریشان تو ہے ہی — فضل نہ مرتا۔ تو آج ہمارا گھر بھی آباد ہو گیا ہوتا"

"لیکن صاحباں" راجو کی ماں بولی "اس میں ایسا پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں — کچھ دن اور گزر جائیں۔ تو —"

"نہیں ماں" راجو نے سر اٹھا کر ماں کو بڑے کرب سے دیکھا۔
"کیوں"
"کچھ نہیں"
"کیا بات ہے بتاتا کیوں نہیں"
"کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی"
"بجھ سے تیرا رشتہ فضل طے کر گیا ہے۔ پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں بجو بیچاری کی بری حالت ہے۔ تو پترا، غم سہارتے سہارتے اسے بھی صبر آ ہی جائے گا۔ ابھی تو دن ہی کتنے ہوئے ہیں فضل کو مرے۔ چار چھ ماہ گزارنے ہی پڑیں گے۔ ابھی تو ہم اس رشتے کے لئے کچھ کہتے اچھے بھی نہیں لگتے فضل بیچارے کی تو ابھی کفن بھی میلی نہیں ہوئیں۔

"ہاں راجو" پھپھی صاحباں نے بھی آہ بھری "بجو کا غم آہستہ آہستہ غلط ہو ہی جائے گا۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ لیکن غم بھی تو ایک دم غلط نہیں ہوتا ـــــ فضل کے ساتھ بجو کو پیار بھی تو بہت تھا۔ ویر کی دیوانی تھی۔ اس کے بچھڑنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے ـــــ"

"وقت تو لگے گا اسے سنبھلتے" ماں بولی

"اسے تو گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہا۔ قبر پر بیٹھی ہوتی ہے۔ یا کمرے میں فضل کے خون میں ڈوبے سہرے کو تکتی رہتی ہے۔ اس نے تو سکھیوں سہیلیوں کا سنگ بھی چھوڑ دیا ہے ـــــ" پھوپھی ہانڈی میں تھوم پیاز ڈالتے ہوئے بولی۔

"آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی ـــــ" ماں نے کہا "بیچاری اکیلی جان پر صدموں کا پہاڑ بھی تو اچانک ہی ٹوٹا ہے ـــــ"

راجو چپ چاپ دونوں کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ لیکن راجو کا ذہن مفلوج سا ہو رہا تھا۔

اسے تو بجو کے رویے سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم بدل گئی تھی۔ اسے یہی بات تو سمجھ نہ آ رہی تھی۔ فضل سے واقعی اسے بہت پیار تھا۔ اس کے غم میں وہ دیوانی بھی ہو سکتی تھی ہوش و خرد سے بیگانہ بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن

وہ جھلی ہوئی تھی نہ پاگل —— ہوش و حواس ہی میں رہتی تھی۔ باقاعدگی سے روزانہ قبر پر جاتی تھی۔ اور دانستہ اسے اپنی راہ میں آنے سے منع کرتی تھی۔

کیوں ؟

کیوں ؟

کیوں ؟

یہ کیوں جٹا زہرناک ہوا جا رہا تھا۔ راجو کو اس کیوں کا جواب نہ مل رہا تھا۔ اسی لئے وہ بے چین تھا پریشان تھا مضمحل تھا۔

پوری رات اس نے الجھن اور بے چینی میں گزاری۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تو بھیانک خواب نظر آتے۔ جاگ اٹھتا تو پریشانی گھیر لیتی۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی وہ بستر سے نکل آیا۔ چادر کندھے پر ڈالی صحن میں آیا۔

کھٹکے سے ماں چونک کر بولی "کون ہے"

"میں راجو ہوں ماں کھیتوں پر جا رہا ہوں"

"اچھا"

وہ کنڈی کھول کر گلی میں نکل آیا۔ سپیدۂ سحر ابھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی

قدرے خنک تھی۔ کہیں کہیں آسمان کے سینے میں ٹکے تارے جھلملا رہے تھے۔ وہ کھوہ پر آیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اور چادر سے پونچھتا پگڈنڈی پر چل دیا۔

اس نے آج نجو سے کھل کر بات کرنے کی سوچھی تھی۔ اس کا غم بجا سوگ اپنی جگہ۔ لیکن یہ بے رخی کیسی تھی۔ وہ آج اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

پگڈنڈی سے اتر کر وہ کچے راستے پر ہو لیا۔ یہ راستہ قبرستان کو جاتا تھا۔

نجو اسے قبرستان کے قریب ہی مل گئی۔ وہ چادر لپیٹے اپنے خیالوں میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔

"نجو" راجو نے اسے پکارا۔

نجو رُکی۔ پلٹ کر دیکھا۔ راجو اس کے قریب آ گیا۔

"نجو ——" اس کی آواز فرطِ جذبات سے بھرا گئی۔

نجو کے وجود پر اک غیر محسوس سی کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ اس نے راجو کی طرف دیکھا۔

لیکن فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

"نجو" راجو کی بے تابی دید کے قابل تھی۔

"راجو ——" وہ قدرے توقف کے بعد کھنک دار لہجے میں بولی۔

"ہاں"

"تو آج پھر یہاں آیا ہے"

"ہاں"

"کیوں"

"تجھے پتہ نہیں ——"

"میں اپنے ویر کی قبر پر جاتی ہوں ۔ اور تو میرا راستہ روک لیتا ہے"
"بخو خدا کے لئے اپنے اوپر رحم کر۔ مجھ پر رحم کھا ـــــ"
بخو نے اک ٹھنڈی آہ بھری اور سپاٹ لہجے میں بولی "تو ادھر نہ آیا کر"
"تو کدھر آیا کروں ۔ کچھ مجھے بھی تو بتا ۔ تیری بے رخی مجھے مار ڈالے گی ۔
تو کیوں بدل گئی ہے بخو ۔ کیوں بدلتی جا رہی ہے ـــــ پہلے والی بخو ـــــ"
"مر گئی اپنے ویر کے ساتھ ہی" بخو کی آنکھوں سے شعلوں کی لپک اک
لمحہ کو دکھائی دی ۔ راجو کی بات کاٹتے ہوئے اس نے آہنی لہجے میں کہا "اب
صرف فضل کی بھین زندہ ہے ـــــ"
"بخو" راجو کچھ نہ سمجھا ۔
تجھے میں نے پہلے بھی کہا تھا ۔ اب بھی کہہ رہی ہوں ۔ میرے راستے میں
نہ آیا کر ـــــ"
"بخو ۔ بخو تجھے کیا ہو گیا ہے"
"جو اک پیارے ویر کی لاڈلی بھین کو ہونا چاہئے ـــــ"
راجو جذباتی سا ہو گیا ـــ بولا "پگلی ۔ جھلی کملی ـــ تیرا ویر مر چکا ہے ۔
تو جو کچھ بھی کرے ۔ وہ واپس نہیں آ سکتا ـــ زندگی کی سچائی کا مقابلہ کر بخو
اس طرح کرنے سے کیا ہو گا ـــــ"
"میں سب جانتی ہوں سب سمجھتی ہوں ۔"
"بخو ـــــ"
"چلا جا راجو ـــــ اور اب نہ آنا ادھر ۔"
جلدی سے قدم اٹھاتے ہوئے بخو نے کہا ـــ راجو مونگوں کی طرح
سے ٹکٹکی باندھ گیا ۔

وہ قبرستان کے اندر چلی گئی ـــــ راجو کچی منڈیر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ صبح کی نورانی روشنی چاروں اور پھیل گئی۔ قبرستان کے سوگوار ماحول میں پرندوں کی چہکاریں گونجنے لگیں۔ کچے راستے پر لوگ آنے جانے لگے۔ بیل گاڑیوں میں جتے بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مخصوص آوازیں فضا میں ترنم بکھیرنے لگیں۔

راجو منڈیر سے اٹھا۔

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے چادر کندھے پر درست کی۔ کپڑے جھاڑے اور ہاتھ چادر سے پونچھتے ہوئے حسرت بھری نظروں سے قبرستان کو دیکھا۔ نوکیلے خاردار درخت کے نیچے فضل کی قبر پر بجو بیٹھی تھی۔

وہ ایک دم چونک گیا۔

بجو اکیلی نہ تھی۔

دوسری طرف کوئی مرد بیٹھا تھا۔ کشمیری دوشالہ کندھوں پر ڈالے قبر کے پہلو میں بیٹھا۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔

راجو کا دم تیزی سے دھڑکا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مرد کی اس کی طرف تقریباً پشت تھی۔ وہ پہچان نہ سکا۔

"شاید فضل کا کوئی رشتہ دار ہو قبر پر فاتحہ کے لئے آیا ہو" اس نے سوچا۔

لیکن

اس کی چھٹی حس نے اس کے من میں وسوسہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور درختوں کی آڑ میں ہوتا۔ قبر کے نزدیک جا پہنچا۔

اس کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ آسمان گھومنے لگا۔ اور آنکھوں میں رنگ برنگے دائرے اُترنے لگے۔

وہ تاج سکھیرا تھا۔

تاج سکھیرا۔

جس کے ساتھ نجو ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

اسے اپنی بصیرت پر یقین نہ آیا۔ آنکھیں ملیں اور پھر پوری آنکھیں کھول کر دونوں کو دیکھا۔

دونوں باتوں میں مشغول تھے۔ دونوں نے ہاتھ قبر پر اوپر تلے رکھے تھے۔

"تو ادھر نہ آیا کر — تو ادھر نہ آیا کر" نجو کی آواز راجو کے من میں گونج گونج گئی۔

وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگا۔ اک قبر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔

اور

کئی لمحے گرا پڑا رہا — اس کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"تاج"
"ہاں"
"ایک بات کہوں"
"سو کہو — سو ہنیو"
"میں سنجیدہ ہوں"
"تو کہو۔ میں بھی سنجیدگی سے سنوں گا۔ بخورانی"
"تو نے میرے دِیر کی قبر پر میرا ہاتھ پکڑا تھا"
"ہاں ایک عزم کے ساتھ پکڑا تھا۔ اور اس عزم پر میں قائم ہوں"
"تیرے قائم ہونے سے بات نہ بنے گی"
"تو ——"
"تو ——"
"ہاں ہاں"
"اب مجھے ہی کہنا پڑے گا۔ تو نہیں سمجھتا — اب اور کتنی دیر انتظار"

"شادی ؟ "

نجو نے اک ادائے دلربائی سے سر اثبات میں ہلایا۔ تاج خوشی سے دیوانہ ہو گیا — بے اختیاری سے بازو پھیلا دئے۔

لیکن

نجو نے اس کے پھیلے بازو اپنے دونوں ہاتھوں سے روک کر کہا۔

"ابھی — نہیں تاج "

"پہلے شادی" وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں "

"ٹھیک ہے "

"کب ؟ "

"بہت جلد"

"بات یہ ہے تاج ——— " نجو درخت کے ساتھ کمر ٹکائے ہوئے سر جھکا کر شرمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

تاج کے جذبات میں طوفانی ہلچل مچی تھی۔ محبوب کی ان اداؤں پر مر مٹا۔ جلدی سے بولا ——— "کیا بات ہے "

تجھے پتہ نہیں ہے شاید "

"کس بات کا "

"میرے لئے ڈھیر سارے رشتے آئے ہیں"

"اچھا ؟ "

"ہاں "

"کہاں کہاں سے "

"ہمارا ایک مامی ماما شہر میں رہتا ہے"

"چوہدری نظام"

"ہاں"

"پھر"

"وہ ماسی رابو کے پاس دو تین دفعہ آئے ہیں۔ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بن گیا ہے"

"ہاں میں اسے جانتا ہوں"

"اور شاہ پور کے چوہدریوں نے بھی رشتہ بھیجا ہے"

"اوہ میرے خدا"

"اور تو یہ بھی جانتا ہے نا۔ کہ فضل میرا رشتہ راجو سے کرنا چاہتا تھا"

"ہاں"

"کچھ لوگ تو کہتے ہیں برات والے دن فضل نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا تھا"

"یہی سُنا تھا میں نے بھی۔"

"اب وہ اسی شہر پر اپنی ماں اور پھپھی کو ہمارے گھر بھیجتا ہے"

"رشتے کے لئے"

"ہاں — وہ لوگ کہتے ہیں فضل رشتہ انہیں دے گیا تھا"

"پھر — پھر نجو —"

"گھبراتے کیوں ہو — فضل اب اس دنیا میں کہاں ہے"

نجو نے غور سے تاج کو دیکھا۔ تاج کچھ مضطرب سا نظر آیا — دونوں ڈھلتی شام کو درگاہ کے پچھواڑے سنسان جگہ پہ درختوں اور جھاڑیوں کے

جھنڈوں میں چھپی جگہ پہ کھڑے تھے۔ اب نجو نے اسے قبر پر آکر ملنے سے منع کر دیا تھا۔ ملاقات کے لئے یہ جگہ بھی اس نے تجویز کی تھی۔

تاج بے تابی کے عالم میں اپنے ہی ہاتھ مروڑے جا رہا تھا۔ نجو اسے دیکھ کر ہنس پڑی

"کیوں ؟ کیوں ہنسی ہو"

"پھر وہی بات۔ کیا تو بھی مجھے ہنستے نہیں دیکھنا چاہتا ——"

"بعض اوقات تو بڑے بے تکے پن سے ہنس دیتی ہے"

"اور تجھے لگتا ہے میں جھلی ہو گئی ہوں"

"نہیں —— یہ بات نہیں"

"پھر ؟"

"چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا راجو کے گھر والوں کو تم نے کیا جواب دیا"

"ابھی دیا نہیں"

"کیوں"

"جب تک تیری طرف سے کوئی رشتہ لے کر نہیں آئے گا۔ میں اسے کیسے جواب دے سکتی ہوں —— ماسی رابو تو ایکدم میرا ہاتھ مامے نظام دین کے بیٹے۔ یا شاہ پور کے چوہدریوں کے ہاتھ میں دے دے گی"

"نہیں —— نہیں نجو ——" تاج بے اختیاری سے بولا۔

"میں کب یہ چاہتی ہوں تو تسلی رکھ۔ پر ——"

"میں آج ہی بھارفیق سے بات کرتا ہوں"

"جو وہ نہ ——"

"نہ مانے ؟"

"ہاں"

"توبہ کر نجو ـــــ وہ تو اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے"

"واقعی"

"ہاں۔ ان کی بھی فضل کی طرح یہ خواہش ہے۔ کہ سکھیروں اور ملکوں کی دوستی قائم رہے"

نجو نے غور سے تاج کو دیکھا۔ وہ گھبرا کر بولا "کیا دیکھ رہی ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بھا رفیق اور بھا شفیق دونوں ہی دنگے فساد کو برا سمجھتے ہیں"

"اور تو؟"

تاج اس سوال پر سرتاپا کانپ گیا۔ نجو اسے سرتاپا مجسم سوال دکھائی دی۔ وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے تکنے لگا۔

نجو ہنس پڑی ـــــ اور بڑی دلنوازی سے بولی "اب تو کیوں مجھے اس طرح تک رہا ہے"

"کچھ نہیں کچھ نہیں" وہ نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا

"کچھ نہیں تو نہ سہی ـــــ" نجو اب بھی شان محبوبی دکھا رہی تھی۔

"میں نے تجھے بتا دیا ہے۔ اب جو جی چاہے کر ـــــ دیر کر دی۔ تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا"

"میں آج ہی بات کروں گا نجو ـــــ اور اگر وہ نہ بھی مانے تو بھی میں تجھے مانگ لوں گا ـــــ"

"ہائے مر ہائے ـــــ" وہ شوخی سے کھلکھلا کر ہنس دی۔

تاج ایک بار پھر لوٹ پوٹ گیا ـــــ

نجو بولی "تو تو مجھ سے بڑا پیار کرنے لگا ہے سکھیرے"

"ہاں ـــ اتنا ـــ اتنا ـــ کہ بتا ہی نہیں سکتا ـــ"
"اپنی بات پر قائم رہے گا نا"
"ہمیشہ ـــ ہمیشہ ـــ" وہ جذباتی لہجے میں بولا ـــ" اور تو ـــ"
"میں ؟"
"ہاں"
"میں تو تجھے چھوڑوں گی نہیں سکھیرے ـــ" وہ ہنستے ہوئے بولی۔
"اچھا تو کب بھیجے گا بھابی کو ہمارے گھر ـــ"
"کل ـــ کل نہیں تو پرسوں ـــ"
"تجھے پکا پکا یقین ہے نا۔ مان جائیں گے تیرے گھر والے"
"بالکل بالکل ـــ"
"بس ٹھیک ہے ـــ فکر دُور ہوگئی میری ـــ"
"اور ـــ" تاج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"کیا بات ہے" بجو نے نیم باز نظروں سے اسے دیکھا۔
"وہ ـــ وہ جو راجو ہے نا ـــ"
"ہاں ہاں"
"اس نے کوئی پھڈا ڈال دیا تو ـــ"
"راجو نے ـــ ؟ وہ کیوں ؟"
"بھئی پنڈ میں بہت سے لوگ کہتے ہیں۔ کہ فضل نے تیرا رشتہ اس سے کر دیا تھا ـــ"
"ہائے ہائے سکھیرے ـــ اتنا بزدل ہے تُو ؟"

"میں بزدل نہیں ہوں پر ——"

"او کیا کر سکتا ہے راجو —— " نجو نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا" جب میں تیری ہوں —— میرا کون ساماں باپ بیٹھا ہے یا بھائی ہی ہے جو میری تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔ فیصلہ تو میں نے ہی کرنا ہے۔

"ہاں یہ تو ہے"

" اور تو جانتا ہے —— فیصلہ میں نے تیرے حق میں کر بھی لیا ہے"

او نجو ——

او نجو —— نجو ——

نجو ہنس پڑی۔

"خوش ہو گیا ہے"

"ہاں"

"راجو کا دھڑکا دل سے نکال دے"

"جب تو میرے ساتھ ہے تو دھڑکا کس بات کا —— میں اسے خاطر میں لاتا ہی نہیں"

"شاباش —— اور دیکھ ——"

"ہاں"

"راجو اول تو غریبی کا مارا تیری راہ میں آنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا —— اور اگر اس نے چوں چراں کی تو پتہ ہے کیا کرنا ——"

"کیا ؟"

نجو نے شوخی سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے گردن کاٹنے کا ہاتھ سے

اشارہ کیا ، یوں "
وہ خود ہی ہنس پڑی ۔
تاج کے من کا چور مچل اٹھا — گھبرا کر اس نے نجو کو دیکھا
نجو نے بات ہنسی میں اڑا دی ۔

"نی ماسی رابو"

"ہاں"

"کچھ سُنا ہے میں نے"

"سب نے ہی سنا ہے"

"سچ ہے بات"

"ہاں۔ رفیق اور شفیق دونوں بھرا آئے تھے۔"

"تو ——"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا ——"

"تاجا اچھا آدمی نہیں ہے"

"سنا تو یہی ہے"

"پھر؟"

"پھر میں کیا بتاؤں"

"بجو کو پتہ ہے"

"ہاں ——"

"عجیب حالات ہیں —— فیصلہ کون کرے گا"

"رشتے پہ رشتے آرہے ہیں۔ شہر سے فضل کا ماما می آئے تھے"

"ان کا پتر بڑا پڑھا لکھا ہے"

"ہاں وکیل ہے"

"پر رشتوں کی بات ہو کیوں رہی ہے۔ فضل نے تو راجو کے ساتھ بات طے کی تھی ——"

"کاش وہ پکی بات کر گیا ہوتا۔ شگن ہی کر دیا ہوتا۔ تو میری جان چھوٹ جاتی ——"

سکھیرے رشتہ لے کر کیا آئے تھے۔ غریب رابو کی جان عذاب میں آگئی تھی۔ جو کوئی بھی سنتا تحقیق کے لئے اس کے پاس دوڑتا۔

عورتیں اور مرد اس کے پاس آرہے تھے۔ یہ عجیب اور انہونی سی بات تھی۔ گو فضل نے سکھیروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ سارا پنڈ جانتا تھا۔ پھر بھی لوگ یہ بھی نہیں بھولے تھے۔ کہ فضل کے باپ ملک رحمت علی کو انہیں سکھیروں نے مار ڈالا تھا۔ تاج کا باپ نذر سکھیرا ملک رحمت علی کے جانے پہچانے قاتلوں میں سے تھا۔

اب باپ کے قاتلوں نے رشتہ مانگا تھا۔ وہ بھی اسی صورت میں کہ فضل نجو کی بات غیر رسمی طور پر راجو کے ساتھ طے کر گیا تھا۔ لوگوں کے لئے حیرت اور اچنبھے کا باعث تھی۔

سکھیرے آئے بھی تو خاموشی سے نہیں تھے نا۔ گیارہ سینیاں مٹھائی کی لے کر آئے تھے۔ بڑے سے بڑا زمیندار بھی رشتہ لینے اس دھوم سے نہ جاتا

ہوگا۔ خوش بھی بہت تھے۔ اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے برملا کیا تھا۔

لیکن

لوگوں کو موضوع مل گیا تھا۔ بات انہونی تھی۔ باپ کے قاتل سکھیرے رشتہ لینے آئے تھے۔ رشتہ بھی تاج کے لئے۔ جو شہری بابو بن گیا تھا۔ جس کی فحاشی اور عیاشی کی داستانیں شہر سے اُڑ کر پنڈ پہنچتی تھیں۔ جو زانی تھا شرابی تھا عورتوں کا دلدادہ تھا۔ ناچ گانے کا رسیا تھا۔

اور

جس نے ایک پٹھانی عورت گھر میں ڈال رکھی تھی۔

کھیتوں میں گلیوں میں دو دو چار چار مرد عورتیں سر جوڑے یہی قصے کر رہے تھے۔

راجو کی ماں کھیتوں کو جا رہی تھی۔ سر پر راجو کی روٹی اور لسی کا گڈوا رکھا تھا ـــ جامو میراثی راہ میں مل گیا ـــ ملتے ہی بولا "چوہدرانی بڑا افسوس ہے ـــ"

"کس بات کا"

"تُو نے نہیں سنا"

"کیا"

"سکھیروں نے ملک فضل کی بھین کا رشتہ مانگا ہے"

"کیا ؟"

"مولادی قسمے ـــ سارے لوگ یہی باتیں کر رہے ہیں"

"نہیں دے ـــ"

وہ کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ چھوٹی گلی سے برکتے اور شادو نکل آئیں

"ہائے چاچی" شادو ایک دم بول اٹھی۔
"کیا ہوا" راجو کی ماں کے سر پر گڈوا ڈول گیا۔
"بجو کا رشتہ سکھیروں نے مانگا ہے۔ تاج سکھیرے کے لئے ——"
برکتے بولی۔

راجو کی ماں سنبھل کر بولی "تو کیا ہوا۔ جہاں بیری ہو وٹے آتے ہی ہیں ہم نے بھی تو رشتہ مانگا ہوا ہے —— اور فضل کو اللہ بخشے —— یہ رشتہ طے بھی کر گیا تھا ——"

"ہوں ہوں" برکتے نے مایوسی میں سر ہلایا "طے کر دیا ہوتا۔ تو بات ہی نہ ختم ہو جاتی۔ ساری گل تو یہی ہے کہ رشتہ اس نے طے نہیں کر دیا تھا۔ صرف بات کی تھی —— اسی لئے تو سکھیرے لے آئے رشتہ ——"

راجو کی ماں کا دل ڈوبنے لگا بیٹے کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔
اداس پریشان اور زبوں حال راجو —— شاید اسے پہلے سے یہ بات معلوم تھی ——

راجو کی ماں کھیتوں پر جانے کی بجائے واپس لوٹ آئی ——
"کیوں بھابی" صاحباں کچے صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی مرغیوں نے بیٹھ بیٹھ کر سارا صحن گندہ کیا ہوا تھا۔
راجو کی ماں کچھ کہے بغیر چارپائی پر آ بیٹھی گڈوا نیچے رکھا اور دستر خوان میں بندھی روٹی اور ساگ چارپائی پر رکھتے ہوئے بولی "صاحباں"
"ہاں بھابی"
وہ ایک دم کچھ نہ کہہ سکی۔ دل جیسے اُڈتا جا رہا تھا۔
"کیوں بھابی" جھاڑو والا ہاتھ روک کر صاحباں نے پوچھا "کیا بات ہے"

"سنا ہے کچھ"

"کیا"

"ملک فضل کی بھین کے لئے تاج سکھیرے کا رشتہ آیا ہے"

"ہائے نہیں بھابی

"سچ کہہ رہی ہوں ——"

"تو کیا ہوا ——"

"لو کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہماری کیا اوقات ہے سکھیروں کے سامنے ——"

"ہے کیوں نہیں۔ ہم کوئی ملکوں کے قاتلوں میں سے تو نہیں ہیں نا"

"کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔ مجھے تو اپنے چن ورگے پتر کا غم لگ گیا ہے۔ اسی لئے وہ کئی دنوں سے پریشان تھا شاید"

"اے نہیں بھابی —— کڑیاں منڈے اک دوسرے سے روٹھ راٹھ بھی تو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے راجو اور نجو بھی آج کل روٹھے ہوئے ہیں"

"پر کیوں؟"

"لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ روٹھے ہیں تو مان بھی جائیں گے۔

"نیئں صاجاں۔ میرے تو دل میں ہول اُٹھ رہے ہیں۔ رشتہ سکھیرے لے جائیں گے

"اے رب نہ کرے —— تجھے نہیں پتہ بھابی —— پر میں جانتی ہوں۔ راجو اور نجو ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں —— ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کون سا نجو کا ماں پیو زندہ بیٹھا ہے۔ جو اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرے گا —— چھوڑ تو فکر نہ کر ——"

"ہوں" بات راجو کی ماں کے دل لگی۔

صاجاں پھر جھاڑو دینے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ بولی "جاروٹی تو دے آپتر کی صبح سے بھوکا بیٹھا ہوگا"

"کھانا پینا تو کچھ ہے نہیں وہ — اللہ جانے کون سا روگ لگا بیٹھا ہے جی کو ——"

"کہانا بھابی —— فکر نہ کر —— ہو ہی جاتی ہیں ایسی باتیں — جوانی میں، لڑائی تو پیار ہی کا حصہ ہوتی ہے ——"

راجو کی ماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اور صاجاں کے کہنے پر راجو کا بھتہ لے کر پھر کھیتوں کی جانب چل دی۔

راجو کھوہ پر تھا۔ رہٹ چل رہا تھا۔ اور وہ بیلوں کے پیچھے گدی پر بیٹھا ہوا تھا — وہ اردگرد سے بے خبر سا تھا — سوچ اس کی آنکھوں میں جم گئی تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ اور ویران تھا۔

ابھی ابھی چوہدری اکبر علی کے بیٹے نصیرے نے سکھیروں کے رشتہ کی خبر اسے سنائی تھی۔

یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ پھر بھی اسے جیسے سکتہ ہوگیا تھا — وہ اسی حالت میں گدی پر بیٹھا تھا۔ اور بیل گھوم رہے تھے۔ ٹنڈیں پانی بھر بھر کر کھوہ سے ابھر رہی تھیں اور خالی ہو ہو کر ڈوب رہی تھیں۔ چکر بڑی ضابطگی سے چل رہا تھا۔

ماں نے کھانا اور لسی کا گڈوا ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پر رکھ دیا۔ راجو کو ماں کے آنے کی جیسے خبر ہی نہ ہوئی۔

"راجو — راجو پتر"

ماں نے کئی بار اسے پکارا۔ تو وہ جیسے کسی دوسری دنیا سے لوٹ آیا۔

"کیوں ماں" وہ گدی سے کود کر اترا اور ماں کے پاس آگیا۔
"کھانا لائی ہوں — کھالے کچھ۔ رات کو بھی بھوکا ہی پڑ رہا تھا —"
"کھالوں گا — رکھدے"
"یہ رکھا ہے"
"بس رہنے دے — میں کھالوں گا — کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔ تو نے رہٹ روک دیا"
"اتنی دفعہ تجھے پکارا — سن ہی نہیں رہا تھا —"
راجو پھر راہٹ کی طرف چلا۔ تو ماں نے منت سے کہا "کیوں جان کا بیری ہو رہا ہے۔ کیا مل جائے گا تجھے۔ کھانا تو کھالے"
راجو نے غور سے ماں کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولا "کیوں فکر کرتی ہے مر نہیں جاؤں گا —"
"مریں تیرے دشمن"
وہ ہنس دیا۔ بے اختیارانہ ہنس دیا اور پھر ہنستے ہنستے بولا "غریبوں کے دشمن نہیں مرتے ماں —"
ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے — لیکن آنسو آنکھوں ہی میں پی کر بولی "تو فکر نہ کر بچیا۔ میں تیرے حق کے لئے ہر کوشش کروں گی۔ میں پھر رابو کے پاس جاؤں گی —"
"نہیں ماں" راجو نے سختی سے کہا "اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تجھے شاید پتہ نہیں نجو کے لئے تاج سکھیرے کا رشتہ آیا ہے —"
"پتہ ہے"
راجو حیران ہو کر بولا "پتہ ہے۔ پھر بھی کہتی ہے۔ رابو کے پاس جاؤنگی"

"ہاں"

"مت جانا"

"جاؤں گی"

"کورا جواب مل جائے گا ماں — مت جانا — بھرم ہی رہنے دے.
بھرم ہی — رہنے دے —"

راجو راہٹ کی گدی پر جا بیٹھا — بیل پھر چکر میں گھومنے لگے۔ پانی کی ٹنڈیں بھرنے اور خالی ہونے لگیں.

جیراں اور بکو ماسی رابو کے پاس زمین پر بیٹھے تھے۔ رابو چارپائی پر بیٹھی بیچاری سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کرے۔

"بکو"

"جی ماسی"

"جا ذرا رتو کی اماں ہی کو بلا لا"

"کیا کام ہے"

"یہی ——"

"پر ماسی" جیراں نے دخل اندازی کی۔

"ہاں"

"نجو نے جو کہدیا ہے — کہ رشتہ طے کر دے"

"ہائے ہائے — وہ بچی ہے کیا سمجھ رکھتی ہے۔"

"ویسے سارے پنڈ میں باتیں بڑی سن رہی ہوں۔ کوئی کہتا ہے یہ رشتہ ہو جانا چاہیئے۔ کوئی کہتا ہے دشمن ہیں کبھی نہ کبھی ٹونگ ماریں گے۔ یہ رشتہ

نہیں ہونا چاہئے ——"

"دونوں باتیں ہی ٹھیک ہیں" بکو کو ماسی کی بجائے جیراں نے جواب دیا ——

"لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی نجو کو ہو کیا گیا ہے۔ دِیر سے اتنا پیار اور اس کا کیا ہوا رشتہ دھتکار رہی ہے"

"ہاں تو ٹھیک کہتی ہے ماسی۔ کُڑی کو غم کھا گیا ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چل رہا۔ کہ کیا بات کرنی ہے کیا نہیں"

"اسی لئے تو کہتی ہوں رتو کی ماں کو بُلا لا۔ اس سے کچھ صلاح کر لُوں"

"اس سے تو بہتر ہے پھپھی سکینہ اور اس کے میاں کو بلا لے۔"

"وہ بیچارے تو مر چکے ہیں۔ دھی جھلی ہو گئی ہے۔ سارا دن دونوں میاں بیوی روتے رہتے ہیں ——" ماسی رابو بولی۔

"ہائے ان کے ساتھ ہوئی تھوڑی ہے —— پھر دھی کملی ہو گئی ——" جیراں نے کہا۔

"ہائے ہائے" ماسی رابو نے دلدوز آہ کھینچی۔

جیراں اور بکو بھی افسوس کرنے لگے۔

"جا تو رتو کی اماں کو بلا لا ——" ماسی رابو نے چند لمحوں بعد کہا" اس سے ہی کچھ صلاح لے لوں ——"

"جاتا ہوں۔ پر وہ کیا کر لے گی —— نجو نے خود ہی کہہ دیا ہے تجھے پھر"

"کہہ تو دیا ہے —— پر مجھے راجو کی ماں اور صاحباں کا بھی خیال آتا ہے۔ بڑا منت ترلہ کر رہی ہیں اس رشتے کے لئے"

"خواہش تو چوہدری نظام اور ان کی بی بی کی بھی ہے"

"اس طرح تو کئی خواہش مند ہیں ـــــ جا اس کو بُلا لا۔ سمجھدار عورت ہے۔
کچھ تو بتائے گی"
"اچھا ماسی"
بکو اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا ـــــ ماسی رابو جیراں سے بولی "جا
ذرا چلم تو بھر لا ـــــ بجھ گیا ہے حقہ"
"اچھا ماسی - لا بھر لاؤں چلم۔ آگ ہے چولھے میں" جیراں بھی اٹھی۔
بکو دالان سے باہر نکلا اس کے پیچھے پیچھے جیراں حقے کی چلم بھرنے نکلی۔
فضل والے دالان کے دروازے میں نجو کھڑی تھی۔
"کہاں جا رہے ہو بکو" اس نے تیز آواز میں پوچھا۔
ذرا رتو کی اماں کو بلانے جا رہا ہوں"
"کیوں"
"ماسی رابو نے بلایا ہے"
"کس لئے"
نجو کی آواز کی تیزی سے بکو کا دل دہل گیا۔ جیراں حیران نظروں سے نجو
کی طرف دیکھا۔
"بتاتے کیوں نہیں" وہ زوردار لہجے میں بولی۔
"ماسی رابو نے اس سے صلاح لینی ہے"
"کس بات کی"
"جی اسی سے پوچھ لے نجو بی بی ـــــ"
"واپس آ" نجو گرجی۔ وہ دروازے سے صحن میں آگئی۔
بکو اپنی جگہ پر جیسے بت بن گیا۔ جیراں بھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نجو

اونچی آواز میں بولی " میں مالک و مختار ہوں۔ ہر بات میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ خبردار جو کسی نے میری مرضی کے خلاف کوئی بھی کام کیا ــــ "

بکوا اور جیراں حیران و پریشان رہ گئے۔ بجو کو انہوں نے گود کھلایا تھا۔ اتنی عمر ہوگئی تھی۔ اس حویلی میں کبھی انہوں نے سخت بات نہ سنی تھی

" کوئی انہیں نوکر چاکر سمجھتا ہی کب تھا۔ حویلی میں تو وہ کنبے کے فردوں کی طرح رہتے تھے۔ آج بجو نے انہیں اپنے اور ان کے درجے کا جیسے احساس دلایا۔ دونوں گنگ سے رہ گئے۔

آوازیں سن کر ماسی رابو بھی لاٹھی ٹیکتی باہر نکل آئی۔

" کیا بات ہے دھی " اس نے دہلیز پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔ کھڑا رہا ہی نہ جا سکا،

" ماسی " بجو شیرنی کی طرح بولی۔

" ہاں پترا "

" کیوں۔ تو کی ماں کو بلا رہی تھی "

ماسی رابو چپ ہوگئی۔

" میں نے تجھے اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا "

" کیا ہے "

پھر کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ لوگوں سے صلاح مشورہ کرنے کی "

دھی ــــ "

" بس ماسی۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے "

" بجو " ــــ سوچ سمجھ کر بات کر "

" بہت سوچ لیا ــــ "

"تو ناسمجھ ہے"

"تیری غلطی ہے جو ایسا سمجھتی ہے"

"دھئی ——"

"بس ماسی۔ میں نے کہدیا ہے۔ وقت ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ تو سکھیروں کو ہاں کردے ——"

بکو اور جیراں نے چونک کر نجو کو دیکھا۔ اس کی دماغی صحت پر جیسے شک تھا انہیں۔

ماسی رالبو نے بھی اپنی چندھیائی نظریں نجو کے چہرے پر گاڑ دیں۔ پھر وہ آہستگی سے بولی "تیرے ویر نے تیرا رشتہ راجو کو دینا تھا ——"

"ماسی" وہ چیخی اور پھر دوڑ کر ماسی رالبو کے سامنے دوزانو ہو کر اسے گھٹنوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی "بار بار یہی کہتی ہے تو —— میرے ویر نے یہ رشتہ راجو کو دینا تھا۔ کہاں ہے میرا ویر —— لا —— لا —— لادے کہیں سے مجھے میرا ویر۔ میں کرلوں گی راجو سے شادی۔ دے مجھے میرا ویر۔ میں مان لوں گی تیری بات —— دے۔ دے لادے میرا ویر لادے۔"

نجو دیوانوں کی طرح کہے جا رہی تھی۔ ماسی رالبو نے اسے بازوؤں میں بھر کر کلیجے سے لگالیا۔

وہ زار و قطار رونے لگی —— اور نجو بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

بکو اور جیراں دونوں ششدر سے کھڑے تھے۔ نجو کو بے دم سا ہوتے دیکھا تو جیراں لپک کر آئی —— ماسی کے بازوؤں میں اکھڑے اکھڑے سانس لیتی نجو کو اس نے کھینچ لیا —— اور پھر اٹھاتے گھسیٹتے اسے چارپائی پر

لاڈالا
بجو کتنی ہی دیر بے ہوش پڑی رہی ۔
اور
ماسی رابو سسک سسک کر روتی رہی ۔

رتو آئی تو بجو دالان میں فضل کی چیزیں کھولے بیٹھی تھی۔ دری پر اس
فضل کے کپڑے کاغذات پستول۔ پرانے خاندانی خنجر اور دونالی بندوق ر
ہوئی تھی۔

رتو دروازے میں کھڑی اسے تکتی رہی۔ جب بجو نے اس کی طرف نگا
تک نہ اٹھائی۔ تو وہ اندر آگئی۔

"بجو" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہوں"

"کیا کر رہی ہو"

"ویر کی نشانیاں سمیٹ رہی ہوں"

رتو نے ساری چیزوں پر اک نگاہ ڈالی۔ اسے ان چیزوں سے کیا د
ہو سکتی تھی۔ وہ تو بجو کو آخری بار سمجھانے آئی تھی۔ تاج سکھیرے کو سارا پن
جانتا تھا۔ راجو کے پیار کو سمجھتی تھی۔ وہ اس وقت بجو سے لڑ کر
راجو کے حق میں فیصلہ کروانے آئی تھی۔

"رتو — یہ میرے ویر کا دھرہے"

"یہ اس کی پگ ہے"

"یہ اس کے کرتے ہیں"

"یہ کنی والے تہمد اسے بہت پسند تھے"

"یہ اس کی واسکٹ ہے — شہر پہن کر جایا کرتا تھا۔

"ہاں بجو —" رتو نے اس کی ساری باتوں میں کہا "یہ سب چیزیں کسی غریب کو دے دے۔ بھا فضل کی روح کو سکون ملے گا۔ یہ چیزیں سنبھال کر کیا کرے گی"

"دیکھا کروں گی۔ ویر نہ سہی ویر کی نشانیاں سہی" وہ جیسے رتو کی باتیں سن ہی نہ رہی تھی۔

"یہ میرے ویر کا پستول ہے" وہ خود ہی ہنس پڑی "ہر وقت ڈب میں رکھتا تھا۔ آخری دنوں میں — پھر بھی اپنا بچاؤ نہ کر سکا ایک گولی ہی چلا دیتا — قاتل کے سینے میں اتار دیتا — ہو گا بزدل تھا شاید — نہیں اسے موقعہ ہی نہ ملا — اور خنجر سینے میں اتر گیا —"

"بجو" رتو نے اسے کندھے سے ہلایا۔

بجو نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ پستول رکھ کر خنجر اٹھا لیا "یہ خنجر بھی تو تھا اس کے پاس ایک پل میں سینے میں اتر جاتا ہے — پھر پتہ ہے کیا ہوتا ہے — خون — خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے — سہرے کی لڑیاں اس میں بھیگ جاتی ہیں۔ کپڑے ڈوب جاتے ہیں۔ چہرہ ڈوب جاتا ہے۔

"بجو — کیا ہو رہا ہے تجھے۔ رکھ دے خنجر —" رتو نے وحشت

بھری نظروں سے نجو کے ہاتھ میں چمکتے خنجر کو دیکھا۔
نجو ہنس پڑی۔
رتو کو اس کی ہنسی عجیب لگی۔
"نجو تو ہوش میں تو ہے نا" رتو نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔
وہ پھر ہنس پڑی ——
خنجر کیس میں رکھ کر اس نے کاغذات اٹھا لئے "یہ میرے ویر کے نام کی رجسٹریاں ہیں۔ زمینوں کے حویلی کے باغوں کے کاغذات ہیں ——"
وہ کاغذوں کے پلندے اپنے سامنے رکھ کر بولی "کچھ بھی تو نصیب نہ ہوا"
"نجو" رتو نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔
"کیا ہے" وہ دھند لائی آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔ رتو نے دیکھا آج پھر اس کی آنکھوں سے پہچان کی چمک غائب تھی پراسرار سی دھند پھیلی تھی آنکھوں میں۔ وہ ڈر گئی۔
"نجو۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اپنا ہوش ہی نہیں رہا تجھے ——" رتو روہانسی ہو کر بولی۔
"ہوہ ——" وہ مسکرائی۔
"سچ کہتی ہوں۔ اپنے آپ کو بھول گئی ہے تو"
"بھولی کہاں ہوں۔ اب تو ڈھونڈا ہے اپنے آپ کو"
"اوں ہوں۔ یہ بات صحیح ہوتی تو ——"
"تو کیا ہوتا ——"
"تو راجو سے یوں آنکھیں نہ پھیر لیتی"

"رتو" نجو کا پورا وجود کانپ، رنگ اُڑ گیا۔ آنکھوں میں ویرانی پھیل گئی۔ اس نے اپنے کانپنے میں دانتوں تلے کاٹ لئے۔

رتو اس سے خفا ہو گئی ـــــ "تُو تو کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔ میں تیری بچپن کی سہیلی ہوں۔ میرے ساتھ بھی تو اوپری اوپری باتیں کرتی ہے"

نجو نے بڑے دُکھ سے رتو کو دیکھا "تو شاید ٹھیک کہتی ہے ـــ رتو۔ پر میں کیا کروں ـــ کیا کروں ـــ"

"تو نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اک غریب کا دل توڑ دیا ہے۔ کیوں نجو کیوں؟ میں آج تجھ سے پوچھ کر رہوں گی۔ بتا مجھے راجو کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اور اس لیٹرے لفنگے کو کیوں قبول کر رہی ہے ـــ جس کے متعلق ہر پنڈ جانتا ہے جو پنڈ کی بہو بیٹیاں پر بُری نگاہیں ڈالتا ہے۔ جو شہر میں عیاشی کے اڈے چلاتا ہے۔ بتا۔ بتا۔ کیا نظر آیا تھا تجھے اس میں ـــ"

نجو اور رتو کی جذباتی باتوں پر ہنس دی۔

اور

پھر

ہنستی چلی گئی۔

رتو کو اس پر بے طرح غصہ آیا بھڑک کر بولی "راجو کے پیار بھرے دل کو توڑ کر تو کبھی چین نہ پائے گی نجو ـــ"

نجو پھر بھی ہنستی چلی گئی ـــ وہ رتو کی باتیں خدا جانے سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ اپنے سامنے بکھری چیزوں کو ہی تکے جا رہی تھی۔

ایک دفعہ اس نے پستول اٹھا کر دیوار کی طرف نشانہ لینے کا حیلہ کیا۔ پھر خنجر اٹھا لیا اور اس کی تیز دھار کو دیکھنے لگی۔ پھر فضل کے کپڑے تہہ کر کے بکس

یں رکھنے لگی۔

"تو سن نہیں رہی میں کیا کہہ رہی ہوں" رتو نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

بجھنے پھر اجنبی سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی "رتو کوئی اور بات کر ——"

"کیا بات کروں" وہ چلائی "کوئی بات کرنے کو تو نے چھوڑا ہی کہاں ہے"

"تو پھر جا اپنے گھر۔ تیری سکھیاں تیرے انتظار میں ہوں گی۔ میرے لئے کیوں اپنا وقت ضائع کرتی ہے ——"

"وقت تو تُو ضائع کر رہی ہے پگلی ——" رتو ایک دم نرم پڑ گئی۔

"کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"سکھیرے کے لئے تو نے ہاں کر دی ہے"

"ہاں —— مائی رالو سے میں نے کہہ دیا ہے"

"یہ تیرا آخری فیصلہ ہے"

"آخری بھی اور قطعی بھی"

"پر کیوں ——"

"رتو میرے ویر ——"

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی نظریں دیوار پر جم گئیں۔ کئی لمحے وہ بے حس و حرکت بیٹھی خون آلود سہرے اور کپڑوں کو تکتی رہی۔

رتو کو ڈر تو لگا۔ لیکن جی کڑا کر کے بولی "کیا دیکھ رہی ہے"

"اپنے ویر کا چہرہ ——"

"بجو — باؤلی — مر جانے والے پھر نظر نہیں آتے ——"

"میں دیکھ رہی ہوں۔ ویر کا خون میں ڈوبا ہوا چہرہ — خون میں ڈوبا ہوا سہرا۔ خون میں لتھڑی ہوئی بنارسی پگ — خون کے دھبوں والا کرتا اور تہمند — چاندنی جوتا — خون ہی خون ہے — خون — خون —"

"چھرا میرے ویر کے دل میں لگا ہوگا نا۔ اسی لئے تو خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا — عین دل میں —"

بخو دیوار پر نظریں جمائے یوں تک رہی تھی۔ جیسے واقعی فضل سامنے کھڑا ہو۔ رتو نے خائف نظروں سے ادھر دیکھا۔ وہاں سوائے کپڑوں اور سہرے کے کیا تھا۔ پھر بھی وہ ڈر گئی۔

ہولے ہولے اٹھی۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

گلی کے دوسرے موڑ پر اسے راجو مل گیا — لٹا پٹا سا راجو دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

"بھا راجو" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر تسلی کر لی۔ کہ گلی کے اس موڑ پر اور کوئی نہیں۔

"ہاں" راجو نے گردن گھما کر اسے دیکھا

"بھا راجو"

"ہاں بھین"

"تو بخو کے پاس جا — ابھی جا —"

"کیوں"

"اس نے سکھیرے کے لئے ہاں کہدی ہے" رتو رو دینے کو تھی۔ راجو

تلخی سے مسکرایا ـــــ" پاگلے اس نے ہاں بھی کہدی ہے ـــ اور تُو مجھے اس کے پاس جانے کا کہہ رہی ہے"

"ہائے بھاراجو - ایک بار جا تو سہی ـــ مجھے لگتا ہے اسے ہوش مت کچھ نہیں ہے ـــ"

"سب ہے ـــ تاجے سے اس نے پیار کی پینگیں بڑھائی ہیں ـــ" وہ چڑ گیا۔

"راجو ـــ" وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں تو ـــ میں جانتا ہوں ـــ میں نے دونوں کو اکھٹے قبر پر بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ درگاہ کے پچھواڑے بھی ملتے تھے ـــ"

"نہیں نہیں ـــ" رتو نے بے یقینی سے کہا

وہ بڑے کربناک انداز میں ہنسا "رتو پھر بھی اصرار کرتے ہوئے بولی۔ "یہ سب جھوٹ ہے بھاراجو ـــ مجھے یقین نہیں آتا ـــ تجھ کو مجھ سے جتنا پیار ہے میں جانتی ہوں ـــ وہ میری سدا کی سہیلی ہے بھائی ـــ اس نے کبھی کوئی بات مجھ سے نہ چھپائی تھی ـــ تو ایک بار تو اس سے مل لے۔ شاید ـــ شاید ـــ"

راجو کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سی سنجیدگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ اس کا دل اپنے پیار کا مدفن تھا ـــ وہ کیسے تجھ سے ملتا ـــ اسے کیا کہتا جبکہ وہ تاجے کے ساتھ اسے دو تین بار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

"وہ باؤلی سی لگتی ہے۔ اس کا مغز رو رو کر پانی ہو گیا ہوا ہے بھاراجو۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ تو مجھے بھی یوں دیکھتی ہے۔ جیسے

میں اس کی سکھی نہیں کوئی پرائی لڑکی ہوں۔ پہچان ہی نہیں رہی اس کی آنکھوں میں۔ تو میری گل من لے بھاراجو — ایک بار — اسے مل — اسے سمجھا — اسے بتا — شاید وہ تیری گل من لے —"

رتو خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ دل میں درد امنڈ رہا تھا۔ بھاراجو سے اسے دلی ہمدردی تھی۔ اس کا اداس ویران اور پریشان رہنا اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

راجو نے سر جھکا لیا۔

رتو اسے بجو سے مل لینے پر اصرار کرتی رہی۔

تاج بڑے زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں لگا تھا۔ تجرا اس کے دل و دماغ پر چھائی تھی۔ اس کے لئے وہ قیمتی سے قیمتی چیزیں خرید رہا تھا۔ ویسے بھی ٹکر کا جوڑ تھا۔ پورے پنڈ پر دھاک بٹھانا مقصود تھی ـــ ملکوں اور سکھیروں کی دوستی کی خوشی کا اظہار بھی کرنا تھا۔ اس لئے تیاریوں کا خاص اہتمام تھا۔

ویسے اس کا خیال تھا، کہ شادی کے بعد نجو کو گاؤں سے شہر لے آئے گا۔ اسے شہری بنا دے گا۔ گو نجو سے اس نے اس سلسلہ میں کھل کر بات نہ کی تھی۔ ایک دن یونہی پوچھا تھا "شادی کے بعد گاؤں رہنا پسند کرے گی یا شہر" تو

وہ ہنس کر بولی تھی "یہ شادی کے بعد دیکھیں گے۔"

"شہر میں میرا سجا سجایا خوبصورت گھر ہے۔ ہر سہولت اور ہر آسائش میسر ہے وہاں"

"اب بھی بات کر تاج۔ بعد کی باتیں بعد میں ہوں گی"

وہ چپ ہوگیا تھا۔ واقعی شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔ چاؤ چونچلے تو شادی سے پہلے ہی کرنا تھے۔ بعد میں تو جو وہ چاہے گا وہی ہوگا۔

گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی چیز آرہی تھی۔ خوبصورت لباس اور زیورات خریدے جارہے تھے۔

گل پروشے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں تو اس کا گھر میں ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا — تاج کو اپنے نئے عشق میں اس کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ تو منہ اندھیرے گاڑی لے کر نکل جاتا تھا۔

عِلمے کو ساری باتوں کو علم تھا — تاج خوشی میں بہک جاتا۔ تو نجو کے متعلق اسے بہت کچھ بتا دیتا۔

پہلے دن جب علمے کو پتہ چلا تھا۔ تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ تاج کا قدم غلط سمت اٹھا رہا تھا — لیکن نجو کی طرف بڑھنا بالکل ہی غلط تھا۔ اسی صورت میں جبکہ اس کے عزیز ترین بھائی کی موت کا وہ ذمہ دار تھا۔

اس نے چاہا تھا چوہدری کو روک دے — کہدے — اظہار کردے لیکن وہ جانتا تھا۔ سکھیرا جس بات کا عزم کر لیتا ہے — اسے چھوڑتا نہیں —

وہ چپ ہوگیا تھا —

پھر اگلے دن تاج نے اسے شادی کا مژدہ سنایا۔

"میں شادی کر رہا ہوں عِلمے —"

"جی — شادی؟"

"ہاں ملک فضل کی بھین کے ساتھ"

"چنگی بات ہے چوہدری جی"

"دونوں خاندانوں کی دشمنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ رشتہ ہو گیا ہے ـــ لوگ بہت خوش ہیں ـــ"

علما کیا کہہ سکتا تھا، دبی زبان سے یہی کہا "شادی عمروں کے معاملے ہوتے ہیں چوہدری جی ـــ"

تاج اپنی دھن میں مست تھا علمے کی بات نہ سمجھا ـــ اس کا اشارہ ملک فضل کے قتل کی طرف تھا۔ کبھی اس کی جبین پر یہ راز عیاں ہو گیا تو کیا ہو گا۔

تاج اس کی بات سمجھ بھی لیتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ تو صرف اور صرف حال میں جینے کا عادی تھا ـــ حال کے ہر لمحے پر حاوی ہونا جانتا تھا۔ حال سے نپٹنا اسے آتا تھا۔ ماضی کیا تھا۔ یا مستقبل کیا ہوتا ہے اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی کب سمجھی تھی۔

شادی کی بھنک گل پروشے کے کان میں بھی پڑ گئی تھی۔ پھر کپڑوں اور زیور کی خریداری سے بھی وہ سمجھ گئی تھی۔ اس دن اس نے علمے سے پوچھا

"سردار روزانہ کدر جاتا ہے"

"پنڈ"

"اتنا سویرے"

"جی بی بی"

"کیا کرتا ہے اُدر"

"میں کیا جانوں بی بی"

"تم سب جانتا ہے"

علما سر جھکا کر رہ گیا۔

"یہ کپڑا یہ زیور سردار کس کے لئے لا رہا ہے ـــ"

علمے کو بتاتے ہی ——— "وہ شادی کر رہا ہے"

"شادی"

"ہاں"

"ہمارا اندازہ بھی یہی تھا — گاؤں میں کوئی لڑکی پکڑا ہے اس نے"

"ہاں — ملک فضل کی بھین سے — ہو رہی ہے شادی"

"ملک فضل کا بھین — ؟"

"ہاں — ہاں"

گل پروشے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا — "ملک فضل کا بھین سے ؟"

"ہاں"

"یہ اس کا بھائی کا قاتل ہے — اور بھین سے شادی کرتا ہے"

"چپ بی بی —" علما ڈر گیا "ایسی بات منہ سے نہ نکالنا۔ سردار کو پتہ چل گیا۔ تو منٹوں کا معاملہ ہوگا تمہاری زندگی کا —"

گل پروشے چپ ہوگئی۔ لیکن اس کی آنکھوں کا فرمانی تناؤ اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کی سختی اس کے سینے میں مچلنے والے جذبات کی پوری طرح آئینہ دار تھی۔

"ام اس سے سمجھے گا" وہ عزائی۔

"چپ رہنے ہی میں مصلحت ہے پروشے بی بی۔ آپ نے کوئی واویلا کیا۔ تو الٹا آپ کے حق میں ہی برا ہوگا۔ تاج محمد سکھیرے سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا ہے"

"ام جانتا ہے —"

"پھر قسمت کا لکھا سمجھ کر چپ ہی رہئے"

اس نے سر ہلایا ـــــ "اس نے امارا ساتھ شادی کیا تھا علمے ۔ وہ امارا خاوند ہے ۔ ام اس سے سمجھے گا ـــــ"

علمے نے سر اٹھا کر گل پروشے کو دیکھا ۔ اسے اس بیچاری پر بڑا ترس آیا ۔ گھر اور شوہر کی تمنا اسے کتنی شدت سے تھی ۔ وہ جانتا تھا ۔ لیکن تاج تو اب اسے بالکل بھلا بیٹھا تھا ۔ وہ جیتی ہے یا مر گئی اسے پرواہ تھی نہ علم ۔ وہ تو علمے ہی کو اس سے انسانی ہمدردی تھی ۔ جو وہ یہاں ٹکی بیٹھی تھی ۔ ورنہ سردار کا ہی معاملہ تو اب تک اس کا سودا کئی ہاتھوں ہو چکا ہوتا ۔ یہ بھی ممکن تھا ۔ کہ بکتے بکتے وہ روز بکنے کے لئے کسی کوٹھے تک پہنچ گئی ہوتی ۔

علما اسے اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق حالات سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کرتا رہتا تھا ۔

آج بھی وہ اسے ملائمت سے سمجھانے لگا نصیحتیں کیں ۔ اونچ نیچ بتائی قتل کے قصے کو ذہن سے نکال ڈالنے کو کہا ۔

لیکن

گل پروشے کسی اور ہی سوچ میں تھی ۔ سردار کے اس کے ساتھ تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے ۔ وہ اس سے بات تک نہ کرتا تھا ۔ اس کے سامنے شراب پیتا تھا ۔ کرایے کی عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا تھا ۔

وہ مصلحت کے تحت سب کچھ برداشت کر رہی تھی ۔ علمے کی نصیحت پر عمل کر رہی تھی ـــــ اس دھمکی سے ڈر گئی تھی ۔ کہ سردار اسے سوات واپس بھیج دے گا ۔

وہ گھر میں رہتی تو تھی ۔ سردار تاج کی بیوی تو تھی ۔ اس کا اپنی نظروں میں

کچھ مقام تو تھا ـــــ ایک آس تو تھی اُمید تو تھی۔ کبھی تو تاج اسے اس کا حق دے گا ـــــ !

لیکن

وہ تو شادی کر رہا ہے ۔

گھر بسا رہا تھا.

گل پروشے کو اجاڑ کر اس کا آشیانہ چھین کر وہ کسی دوسری لڑکی کو بسا رہا تھا۔

گل پروشے یہ سب کچھ کیسے برداشت کر لیتی۔ کیسے سہہ لیتی

اسی رات اس نے تاج کا گریبان پکڑ لیا۔ اپنے حق کے لئے زوردار احتجاج کیا ـــــ روئی چیخی ـــــ گالیاں بکیں ـــــ

لیکن

تاج پر کیا اثر ہوتا ـــــ گل پروشے جب بالکل ہی بے قابو ہو گئی۔ تو تاج نے اسے لاتوں گھونسوں اور مکوں سے ادھ موا کر دیا۔ اس کے سپید جسم پر نیل پڑ گئے۔ اس کے چہرے پر خراشیں آ گئیں۔ اس کے دانتوں سے لہو بہنے لگا۔

گل پروشے تو اُدھ موئی ہو گئی۔

ہاں

اس کے اندر کی عورت اس ظلم و تشدد سے بپھر گئی۔

جیلاں نے پیتل کے بڑے لیمپ کی چمنی صاف کی۔ بتی کو آگ لگائی اور بخو کے دالان میں لیمپ لاکر چھتی پر رکھ دیا۔ دوسرے دالانوں اور کوٹھڑیوں میں جارو اور رقیہ بتیاں لالٹینیں اور دئے جلا جلا کر رکھنے لگیں۔ دو تین دنوں سے سرِ شام ہی پوری حویلی میں روشنی کر دی جاتی تھی —— بخو نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

"اندھیرے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ ساری حویلی میں بتیاں جلایا کرو اتنے لیمپ اور لالٹینیں کس لئے رکھی ہیں ——"

حکم کی تعمیل اسی دن سے شروع ہو گئی تھی۔

لیمپ کی روشنی سے کمرہ بھر گیا۔

"بتی اونچی کروں" جیلاں نے پوچھا۔

بس کافی ہے۔ چھوڑ دو ——" بخو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں چہرہ کچھ زیادہ ہی پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ جیلاں چند لمحے اسے تکتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے بخو

کشتیاں اپنے ہاتھوں ڈبو کر ان کے ڈوبنے سے خود بھی ڈوبی جا رہی ہے۔
آج سکھیروں کے گھر سے لوگ آئے تھے ـــــ اور کنگنوں کی طلائی جوڑی نجو کو پہنا گئے تھے۔ ماسی رابو نے بے دلی سے ان پر اپنا عندیہ واضح کر دیا تھا۔ وہ لوگ خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔

نجو پلنگ پر بیٹھی انہیں کنگنوں کو تک رہی تھی۔

جیلاں دالان سے نکل گئی ـــــ ماسی رابو دوسرے دالان میں تھی وہ اس کے پاس جا بیٹھی ـــــ

ساری حویلی میں روشنی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ حویلی گھمبیر اندھیروں کی لپیٹ میں ہے۔ اک اداسی ہر سو مچل رہی تھی۔ ویرانی کا احساس جاگتا تھا اتنی بڑی حویلی سونی پڑی تھی۔ یہ حویلی فضل کے دم سے آباد تھی۔ ہر وقت کھاگمی اور رونق کا احساس ہوتا تھا۔

صرف ایک فضل ہی بچھڑا تھا۔

لیکن

یوں لگتا تھا کے گھر سے کافی لوگ آئے تھے۔ عورتیں مرد بچے سبھی تھے۔ ان کے آنے سے چہل پہل ہوئی تھی۔ لیکن دلوں میں اترتے سناٹے اپنی جگہ موجود تھے۔ ان کے جانے کے بعد یہ سناٹے ہر ایک نے محسوس کئے تھے۔

بکو نے جیراں سے کہا تھا "آج خوشی محسوس نہیں ہو رہی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی مرگ ہو گئی ہے۔"

"ہاں مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ سکھیروں سے ناطہ جوڑنا دل کو نہیں بھاتا"

"ہم کیا اور ہماری اوقات کیا ہے۔ پر پتہ نہیں نجو کا فیصلہ غلط ہی ہے"

"تو چپ رہ ـــــ وہ جانے اور اس کے کام ـــــ"

"لوگ بھی باتیں بناتے ہیں نا ـــــ چوہدری رحمت علی کے قاتل اور۔"

"تو زبان بند ہی رکھ ـــــ لوگ خوش بھی تو ہیں۔ پرانی دشمنی اس طرح ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی"

"یہ بات تو ہے۔ شاید فضل کے قاتلوں کا بھی کچھ پتہ چل سکے۔ یہ لوگ بڑی پہنچ والے ہیں ـــــ ضرور دوڑ دھوپ کریں گے"

"شاید تاج ہی ڈھونڈ نکالے۔ اس کی بڑے بڑے افسروں سے دوستی ہے ـــــ"

"اور بڑے بڑے بدمعاشوں سے بھی تو ہے"

"ایسی باتیں مت کر۔ پہلے ہی دل میں وسوسہ سا ہے۔ کوئی خوشی نہیں جی بس مندہ ہی مندہ ہے۔ اس پر ایسی باتیں سوچ کر رول آتا ہے"

"ایسا ہی ہے ـــــ پتہ نہیں کیا بات ہے ـــــ"

جیلاں جارو اور رقیہ بھی دبے دبے لفظوں میں خوشی کے فقدان کی باتیں کر رہی تھیں۔

"پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے"

"بخو کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"بیچارہ راجو ـــــ غم سے ادھ موا ہو گیا ہے"

"سمجھ نہیں آئی اس کو چھوڑ کیوں دیا بخو نے"

"بھا فضل نے تو بخو کی خوشی کی خاطر ہی رشتہ کرنا تھا اس سے"

"ہاں مجھے پتہ ہے"

"کتنا پیار تھا دونوں میں ـــــ بخو ساری باتیں مجھے بتایا کرتی تھی"

"اب تو اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی ——"

"یہی تو حیرانی کی بات ہے"

"سکھیرا من بھا گیا"

"اوں ہوں۔ بجو خوش تو اب بھی نہیں۔ دیکھتی نہیں اسے ——"

"مجھے تو لگتا ہے بھا فضل کے ساتھ ہی وہ بھی مر گئی — یہ تو کوئی اور ہی بجو لگتی ہے"

"خوف آتا ہے مجھے"

"یوں لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے"

"اس حویلی میں تو ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ ہوتا آیا ہے — اب تو کوئی رہا ہی نہیں — اب کیا ہوگا ——"

"بس دل میں کھُد بُد ہوتی رہتی ہے"

"رب خیر کرے —" وہ سب سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں۔

بجو پلنگ پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی؛ یہ وہی جانتی تھی۔

رات اتر رہی تھی۔ بجو پلنگ سے اٹھی — لیمپ کی روشنی مدھم کرنے کے لئے چھتی کی طرف گئی ——

"بجو ——" جیلاں نے دروازے میں کھڑے کہا۔

"ہاں" بجو نے بتی نیچی نہ کی۔

"بھارا جو آیا ہے"

"راجو ——"

"ہاں"

"کیوں آیا ہے"

بخو کے لہجے کے تناؤ سے جیلاں ڈر گئی۔ وہ واپس مڑی۔ تو راجو دروازے میں آگیا۔

اس نے بخو کو دیکھا

اور

بخو نے اسے

چند لمحے

جیسے فضا کو سکتہ ہو گیا۔ روشنی ڈوب گئی اور اندھے اندھیرے چار سو پھیل گئے ——

راجو نے دروازے کے پٹ سے ٹیک لگا کر اپنے کانپتے وجود کو سہارا دے لیا۔ بخو چھتی پر بازو رکھے کھڑی رہی۔

پھر

جانے کیسے فضا کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ لمحے مضطرب ہوئے، ماحول لرز لرز گیا۔

بخو کے لبوں سے مردہ سی آواز نکلی "کیوں آئے ہو"

راجو اپنی خوبصورت فسوں ساز آنکھوں میں کرب کی دنیا سمیٹے اسے تکتا رہا ——

"کیوں آئے ہو راجو ——" بخو کی گرفت چھتی پر مضبوط ہو گئی۔ وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔

راجو اب بھی اسے دکھ بھری نظروں سے تک رہا تھا۔ لٹا پٹا راجو یہاں آ تو گیا تھا۔ لیکن اب کوئی بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔

"کیوں آئے ہو" اب بخو کے لہجے میں تناؤ تھا۔ یوں جیسے اسے دالان سے نکل جانے کا حکم دے رہی ہو

"بجو ـــــ" راجو کے لبوں سے نکلا

"کیا ہے"

"مجھے بے موت کیوں مار ڈالا ہے تو نے۔ تو کیا کر رہی ہے بجو ـــ مجھے چھوڑ دینا تھا۔ تو پیار کیوں کیا تھا۔ کیوں برباد کر رہی ہے مجھے ـــــ" وہ ایک دم پھٹ پڑا ـــــ

بجو نے چھتی کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا ـــ اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا ـــ ہونٹ تک بے رنگ ہو گئے تھے۔

راجو قدم بڑھا کر اندر آ گیا۔ بجو کے قریب آتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا "مجھے میرا جرم تو بتا دے ـــ کیا جرم کیا ہے میں نے جس کی اتنی کڑی سزا دے رہی ہے مجھے ـــــ"

بجو نے سپاٹ نظروں سے اس کے سراپا کو دیکھا۔ پھر رخ موڑتے ہوئے بولی "راجو بہتر یہی ہے۔ کہ تو واپس چلا جا ـــــ"

"میں اپنا جرم پوچھ کر رہوں گا ـــــ"

"جرم ـــــ ؟"

"ہاں"

وہ مڑی۔ راجو کے عین سامنے کھڑی ہو گئی ـــ بڑے غور سے اسے دیکھا اور روکھے سوکھے لہجے میں بولی "میں سمجھتی تھی۔ تو مجھے پیار کرتا ہے۔ روحوں کا ملاپ ـــــ"

راجو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے اسے جھنجھوڑا اور بے تاب لہجے میں بولا "میرے پیار پر شک کیوں کر رہی ہے ـــ مجھے آزما کر تو دیکھ ـــــ"

وہ تلخی سے بولی " وجود کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والے لوگ کس آزمائش میں پورے اترتے ہیں ؟"

" نجو " راجو نے اسے جھڑکا دیا۔

نجو نے اس کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا

پھر

اپنے کندھوں پر رکھے راجو کے ہاتھ سختی سے جھٹکتے ہوئے پرے ہٹ گئی ——

" خدا کے واسطے نجو —— مجھے کچھ تو بتا دے —— کہ ——" وہ گلوگیر آواز میں بولتے بولتے رک گیا۔

نجو نے جلدی سے کہا " تجھے میں نے کتنی بار کہا ہے۔ میری راہ سے ہٹ جا —— راجو —— تو اگر اپنے سچے پیار کا دعوے دار ہے نا تو یہاں سے چلا جا ——"

" نجو "

" چلا جا راجو —— چلا جا ——"

راجو ہراساں سا اسے تکنے لگا۔ اس کے قدم تو جیسے زمین میں گڑ گئے تھے نجو کی باتیں ذہن کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔ اسے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دقت کوئی دشواری نہ رہی تھی۔ کہ نجو نے جو قدم اٹھایا ہے کسی مجبوری کسی مصلحت کے تحت اٹھایا ہے۔ اس کا پیار اپنی جگہ اک اٹل اور سچی حقیقت ہے ——

اس سوچ نے اسے تسکین دی۔ پیار ملن سے شاید امر نہیں ہوتا۔ بچھڑ کر امر ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے سینے میں ٹھاٹھیں مارتے پیار کے سمندر کو

محسوس کیا — اس کا پیار امر ہو جائے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

اور

جب نجو پھر تند لہجے میں بولی "چلے جاؤ — راجو — چلے جاؤ —"

تو

راجو نے عقیدت سے اپنے پیار کے سامنے سر جھکا دیا۔

وہ آہستگی سے مڑا —

اور

کچھ کہے بغیر دالان سے نکل گیا۔

اس کے دالان سے باہر نکلتے ہی نجو نے کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

اور

صحن میں کھڑی جارو جیلاں اور رقیہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

جب سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ تاج کی شہر والی کوٹھی میں روزانہ رات کو محفل راگ و رنگ منعقد ہو رہی تھی۔ پینے پلانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ اس کے بد قماش دوست اسے خوشی کی آڑ میں دونوں ہاتھوں لوٹ رہے تھے۔

تاج جب ضرورت سے زیادہ ہی چڑھا جاتا۔ تو وہ اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔

"واہ چوہدری بات ہوئی نا ——"

"بڑا خوش قسمت ہے تو"

"لڑکی کا سارا دھن دولت بھی اب تیرا ہی ہوگا"

"جیئے تو"

"عیش کرے"

"اور کروائے"

یوں اسے ہوا دے کر یہ مطلبی دوست اس سے بہت کچھ حاصل کر لیتے۔

روپے پیسے کی تو تاج کو یوں بھی پروا نہ تھی۔ ہزاروں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر کے اِدھر ہو جاتے ـــــ اسے پتہ ہی نہ چلتا ـــــ لوٹ کھسوٹ ہو رہی تھی۔ اور وہ شراب کے نشے میں دھت بے دریغ لٹائے جا رہا تھا۔ ان دوستوں پر ویسے وہ دانستہ بھی پیسہ نچھاور کر رہا تھا۔ یہ اس کے مکروہ رازوں کے امین جو تھے۔ حصہ دار تھے۔ ساتھی تھے۔

اس دن بھی ڈانسنگ روم میں یہ چنڈال چوکڑی جمع تھی ـــــ شراب پانی کی طرح حلقوں میں انڈیلی جا رہی تھی۔ دو نازک اندام چھوکریاں ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ناز و انداز سے گھائل کر کے پلا رہی تھیں ـــــ فحش حرکات ہو رہی تھیں ـــــ جذبات کے دھارے بہہ رہے تھے۔ اور تسکین و سیرابی کے سامان مہیا تھے۔

"یار تاج" ایک ساتھی بولا۔

"ہوں"

"شادی کے بعد کیا ہوگا"

"کیوں" دوسرے ساتھی نے پیمانہ چھلکاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے ہاتھ کب آئے گا پھر ـــــ" پہلا بولا۔

"ہاں ـــــ یہ بات سوچنے کی ہے" شراب و کباب کی ایسی محفلیں پھر کیسے ہوں گی" تیسرے نے لقمہ دیا۔

"او کون ہے جو ہمیں روک سکے ـــــ" تاج دھاڑا ـــــ وہ نشے میں دھت تھا۔

"تیری گھر والی"

"اس کی مجال ہے"

"چوہدریوں کی بیٹی ہے وہ ——"

"ڈرتا کون ہے —— پھر اس کا ہے ہی کون" تاج نے غٹا غٹ گلاس چڑھاتے ہوئے کہا

"اک اکیلی ہے —— کیا بگاڑ لے گی میرا —— شراب تو میری زندگی ہے یارو ——"

وہ اول فول بکتا رہا۔

یاروں نے اسے خوب پلائی —— خود بھی بہکے اسے بھی بہکایا۔ باتوں ہی باتوں میں گل پروشے کا ذکر آ گیا۔

"او تاج۔ اب تو تیری دو دو گھر والیاں ہو گئیں" ایک دوست بولا۔

"دو دو" تاج نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں —— ایک یہ پٹھانی اور دوسری ملکانی ——" دوسرے نے کہا۔

اور

تاج جو نشے میں دھت تھا موج میں آ کر بولا "ملکانی میری۔ پٹھانی تمہاری تم لے جاؤ ——"

"سچ" دوسرے نے جھومتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— جان چھڑاؤ میری اس سے —— ہو گئی تمہاری"

"ہو گئی"

"ہو گئی"

سب نے بے ہنگم سے قہقہے لگائے۔

ادھر تاج نئی شادی کی خوشی میں گل پروشے کو دوستوں میں بخشیش کے طور پر بانٹ رہا تھا۔

اور

ادھر

گل پروشے اپنے کمرے میں تنہا لیٹی اس شادی کو رکوانے تڑوانے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ تنہائیوں کا زہر اس کی نس نس میں گھل رہا تھا۔ پاکر کھونے کے جان لیوہ احساس پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ تاج اس کا خاوند تھا۔ وہ کسی اور کا خاوند بن جائے یہ اسے گوارہ نہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ منصوبے بنا رہی تھی اور ان پر عمل پیرا ہونے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔

بالآخر اس نے کچھ سوچ ہی لیا۔ اک فیصلہ کر ہی لیا۔

دوسری صبح وہ نجو سے ملنے پپلاں والی جا پہنچی۔ پپلاں والی اور ملک فضل کا نام اسے معلوم تھا۔ ہڑبلے ایک دفعہ تاج کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کس طرح یہاں تک پہنچ پائی۔ یہ اپنے اندر اک داستان تھی۔

اس نے اپنے آپ کو اک لمبی چوڑی پھولدار چادر میں چھپا رکھا تھا۔ پھر بھی شہری وضع قطع کا لباس پنڈ والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ سرخ و سپید چوڑا چہرہ ماتھے پر کٹے بال گالوں پر سبز خال سبزی مائل نیلی آنکھیں سرخ ہونٹ جس نے بھی اسے دیکھا حسن جہانسوز کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

وہ ملک فضل کے گھر کا پتہ پوچھتے پوچھتے حویلی تک آ گئی۔ کئی بچے لڑکیاں عورتیں اور اکا دکا مرد بھی اس کے پیچھے پیچھے گلی میں آ گئے۔

حویلی کے بڑے دروازے پر جیلاں کھڑی تھی۔ وہ دالانوں میں جھاڑو لگانے کے بعد کوڑا گلی میں پھینکنے آئی تھی۔

"یہ ملک فضل کا گھر ہے نا ——" گل پروشے نے لوگوں کی راہنمائی

پر حویلی تک پہنچ کر جیلاں سے پوچھا

"ہاں — تم کون ہو"

"ام ابھی بتائے گا"

جیلاں حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔ اس کی بولی عجیب سی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

"ملک کا بھین اندر ہے" اس نے جیلاں سے پوچھا

"ہاں"

"ام اس سے ملنے آیا ہے"

"آجاؤ"

گل پروشے حویلی کے دروازے میں داخل ہوئی۔ بچے لڑکیاں اور عورتیں بھی پیچھے آئیں۔

"تم لوگ جاؤ —" گل پروشے نے پلٹ کر سب سے کہا۔ بچے تو خیر ڈھیٹ تھے صحن میں آگئے۔ ہاں لڑکیاں اور عورتیں دروازے پر رک کر ہی چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔

گل پروشے طویل و عریض صحن میں آکر کھڑی ہوگئی۔ جارو اور جیراں لپک کر آئیں "کدر ہے ملک کا بھین" گل پروشے نے پوچھا۔

"اندر" جارو نے ڈرتے ڈرتے سامنے فضل کے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

گل پروشے متانت سے چلتی بخو کے دالان میں داخل ہوگئی جارو جیلاں اور ان کی ماں بھی پیچھے پیچھے آئیں۔

بخو فضل کی چیزیں بکھیرے بیٹھی تھی۔ آبدار خنجر کیس سے نکال کر دیکھ رہی تھی۔ پستول بھی قریب پڑا تھا۔ کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

نجو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اک اجنبی چہرے کو دیکھ کر کچھ حیران ہوئی۔ لیکن جب گل پروشے نے آگے بڑھ کر کہا "ام گل پروشے ہے"

تو

اسے سمجھتے دیر نہ لگی۔ کہ یہ تاج کی خریدی ہوئی بیوی ہے۔

وہ چیزیں وہیں چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی ـــــ شہری وضع قطع کا لباس پہنے یہ پٹھان لڑکی حسن کا مرقع تھی ـــــ وہ اسے تکتی رہ گئی۔

"تم فضل کا بھین ہے" گل پروشے نے پوچھا۔

"ہاں نجو کے لبوں سے مبہم سی آواز نکلی ـــــ

"تم ام کو نیئں پہچانتا ـــــ"

"پہچان لیا ہے"

"نیئں"

"تم ـــ تم تاج کی بیوی ہونا"

"ہاں"

گل پروشے نے حیرانگی سے اسے دیکھا پھر بولی "امارا بارے میں تم جانتا ہے"

"ہاں"

نجو مسکرائی ـــ پھر پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "بیٹھو"

گل پروشے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ نجو کو تاج سے متنفر کرنے آئی تھی۔ اس کے کرتوت اسے بتا کر یہ شادی رکوانے آئی تھی۔

"جیلاں" نجو نے اسے پکارا۔

"ہاں"

"دودھ اور مٹھائی لاؤ"

"اچھا"

وہ جانے لگی تو گل پروشے احتجاجی لہجے میں بولی "ام کچ نئیں کھائے گا"

"کوئی بات نہیں" بخو نے کہا۔

"بس ام تم سے تھوڑی بات کرے گا۔ کھانے پینے کا ضرورت نہیں ہے"

"کیا بات کروگی ؟"

"ان لوگوں کو بولو جائے ـــ" اس نے دروازے میں کھڑی جارو جیراں اور بچوں کی طرف دیکھا۔

"جاؤ تم سب" بخو نے سب کو جانے کا کہہ کر دروازہ بھیڑ دیا۔ پھر گل پروشے کے قریب پلنگ پر آ بیٹھی۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"تم جانتا ہے ام سردار کی بیوی ہے"

"ہاں سنا تھا اس نے کسی پٹھان عورت سے شادی کر رکھی ہے ـــ تمہیں دیکھتے ہی پتہ چل گیا"

"تم اس سے شادی کرتا ہے"

"ہاں"

"یہ جان کر بھی کہ اس کا پہلے بیوی ہے"

"ہاں"

"بد بختے ایسا کام کیوں کرتا ہے"

بخو نے جھکا ہوا سر آہستہ آہستہ اٹھایا اور آر پار ہو جانے والی نظروں سے گل پروشے کو دیکھتے ہوئے بولی "شادی کرنا گناہ تو نہیں ـــ"

"ایسا آدمی کے ساتھ شادی مت کرو ——"

"اس لئے کہ وہ تمہارا خاوند ہے"

"ہاں —— لیکن اس نے امارا ساتھ دغا کیا۔ اب ام کو پوچھتا بھی نئیں۔ وہ اچا آدمی نہیں ہے بی بی۔ تم کو بھی برباد کرے گا —— شادی کرے گا —— پھر چھوڑے گا"

نجو ہنس پڑی ——

گل پروشے کو غصہ آگیا۔ اور غصے ہی میں وہ بلا رکے بولے گئی۔ تاج کی شراب نوشی عیاشی فحاشی سبھی کچھ گل نے نجو کو بتا دیا۔

لیکن

نجو پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس کی باتوں کو تحمل سے سنتی رہی۔ جب وہ چپ ہوئی —— تو بڑے دھیرج سے بولی "تم نے کوئی نئی بات نہیں کی گل پروشے —— میں یہ سب جانتی ہوں ——"

"پھر بھی شادی کرے گا" وہ حیرانگی سے بولی۔

"ہاں" آہنی انداز میں نجو نے فیصلہ کن ہاں کہی ——

"کیوں" گل پروشے نے پوچھا

نجو پلنگ سے اٹھی —— بے تابی سے ٹہلتے ہوئے بولی "میری مرضی ——"

گل پروشے بھڑکی ہوئی تھی تلخی سے بولی "تم تاج کو نئیں جانتا"

"جانتی ہوں ——"

"نئیں نئیں —— نئیں —— وہ خراب آدمی ہے —— بُرا ہے اچا نہیں ہے۔ تم نئیں جانتا ——" گل پروشے ہذیانی انداز میں چیخی۔

"میں اتنا کچھ جانتی ہوں جتنا شاید —— تم بھی نہیں جانتیں" نجو نے جواب

میں بڑے سکون سے کہا۔

گل پروشنے کی آنکھیں دھندلا گئیں ـــــ بڑے دکھ سے بولی" باز آجا لڑکی۔ ام اس کا بیوی ہے ـــــ ام اس کا شادی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ام بوت دُکھی ہے"۔ پھر وہ گلوگیر آواز میں اپنی روئیداد نجو کو سنانے لگی۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کی ساری کہانی اُس نے نجو کو سنا دی۔

نجو

چپ بیٹھی سب کچھ سنتی رہی ـــــ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

گل نے اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھا تو غصہ ابال کی صورت میں اُٹھنے لگا۔ "یہ تمارا بدبختی ہے۔ ام سردار کو نہیں چھوڑے گا ـــــ ام اپنا اور اس کا جان ایک کرے گا۔ ـــــ"

نجو نے کوئی جواب نہ دیا۔

گل غصے سے کھولنے لگی قہر آلود نظروں سے نجو کو دیکھا اور بے اختیارانہ بولی " وہ تمارا بھائی کا قاتل ہے لڑکی ـــــ تمارا بھائی کو اس نے قتل کرایا تھا ـــــ"

گل پروشنے نے یہ آخری حربہ استعمال کیا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ بم گرے گا۔ تو نجو کے فیصلے کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

لیکن

ایسا نہیں ہوا۔

نجو نے چونک کر اسے دیکھا ضرور۔ لیکن پھر بڑے تحمل اور سکون سے بولی

"میں جانتی ہوں"

"یا خداوندا ——" گل پروشے اچھل کر پلنگ سے اُتری اور نجو کے سامنے آتے ہوئے تیزی سے بولی "تم جانتا ہے"

نجو نے بے رنگ چہرہ اوپر اٹھا کر اسے دیکھا اور سر کے خفیف سے اشارے کے ساتھ بولی "ہاں ——"

گل پروشے ششدر سی اسے تکنے لگی۔

پھر

لپک کر آئی اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی "بھائی کے قاتل سے شادی کرے گا"

"ہاں" نجو کا مختصر سا جواب تھا۔ وہ اپنا آپ اس سے چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔ گل پروشے کی حالت دید کے قابل تھی۔ حیرت سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دماغ چکرا رہا تھا اور کھلی آنکھوں سے نجو کو تکے جا رہی تھی۔

نجو آہستہ آہستہ چلتی دیوار تک آئی۔ فضل کے خون آلود کپڑوں کو چھوا، پھر سہرے کی لڑیوں کو بوسہ دیا —— وہ بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔

گل پروشے اسے تکے جا رہی تھی۔

"یہ میرا بہت پیارا بھائی تھا —— ایک ہی ایک ویر تھا —— یہ اس کے کپڑے ہیں یہ سہرا ہے —— وہ شادی والے دن قتل ہو گیا تھا —— مارا گیا تھا —— ختم ہو گیا تھا ——

نجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سانسیں غیر ہموار تھیں۔ گل پروشے بت بنی کھڑی رہی۔

"ہوں" اس کے لبوں سے صرف یہی نکلا —— اور وہ پھیلی پھیلی

حیرت زدہ نگاہوں سے نجو کو تکنے لگی ۔
اس پر کئی راز کھُل گئے ۔ کئی باتیں اس کے ذہن میں لپک جھپک آئیں ۔
نجو نے آنکھیں کھولدیں ۔ گل پر وشے کو دیکھا ۔
دونوں کی نگاہیں ملیں ۔ دونوں ہی بڑے پراسرار طریق سے نگاہوں کی
زبان سمجھتے سمجھاتے مسکرادیں ۔

تاج گاڑی سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ وہ شاپنگ کر کے لوٹا تھا۔ علما برآمدے میں کھڑا تھا — وہ پریشان نظر آرہا تھا۔

"علمے"

"جی"

"گاڑی سے ڈبے اور لفافے نکال لا"

"اچھا چوہدری جی"

"کیا بات ہے علمے۔ بڑا پریشان ہے" تاج نے اک نگاہ علمے پر ڈالی۔

"جی چوہدری جی۔ ٹھہریں — میں پہلے گاڑی سے چیزیں نکال لاؤں"

تاج نے سر کو ہلکی سی دائیں بائیں جنبش دی۔ اور جالی دار دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں گیا — صبح سے بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ کئی چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا تھیں۔ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ کمرے میں آتے ہی پلنگ پر آڑا لیٹ گیا۔

علما لفافے اور ڈبے اٹھائے اندر آگیا۔ دائیں ہاتھ رکھی ٹیبل پر چیزیں رکھ دیں۔

"چوہدری جی"

"ہوں"

"وہ جی ——"

"کیا ہے؟"

"گل پروشنے بی بی ——"

"کیا ہوا اسے"

"ہوا تو کچھ نہیں ——"

"پھر ——"

"پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے"

"کیا ——— ؟" تاج اُٹھ بیٹھا — "کہاں چلی گئی؟"

"پتہ نہیں جی۔ صبح سے غائب ہے ——"

"واقعی؟"

"ہاں جی۔ میں نے سب جگہ دیکھا۔ پہلے تو یہی سمجھا گھر پہ ہی ہوں گی۔ پر کہیں نہ ملیں۔ اِدھر اُدھر پوچھا ساتھ والے بنگلوں سے بھی پتہ کیا ——"

"کہاں جا سکتی ہے"

"کیا پتہ؟"

"وہ پہلے تو کبھی نہیں گئی ہیں"

"کبھی نہیں جی — آپ ہی شروع شروع میں کہیں لے جاتے تھے۔ تو جاتی تھیں ——"

"ہوں ——"

تاج کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"مالی بابا سے بھی پوچھا۔ خانساماں سے بھی — کسی کو پتہ ہی نہیں ——"

"ہوں"

"خدا جانے کہاں چلی گئی ہیں ——"

تاج اُٹھ کر الماری کے قریب آیا۔ جیب سے چابیاں نکالیں۔ الماری کھول کر اک سرسری سی نگاہ ڈبوں میں اور دیگر چیزوں پر ڈالی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی نظر آئیں۔ تسلی کر کے وہ مڑا —— اور علمے کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں بولا "لگتا ہے بھاگ گئی ہے"

علمے نے سر نفی میں ہلایا "بھاگ کر بیچاری نے جانا کہاں تھا ——"

"ہونہہ ——" تاج بولا "اچھا ہی ہوا — خود ہی دفع ہو گئی — جان چھوٹی —— میں نے اسے خریدا کیا تھا مصیبت خرید لی تھی ——"

علمے نے سر اٹھا کر تاج کو دیکھا۔ یہ شخص اپنی بیوی سے اس قدر بیگانہ تھا۔ جو کچھ بھی تھا گل پروشے اس کی منکوحہ تھی۔ لیکن رشتوں کی نزاکت اور احترام کا تاج جیسے آدمی کو احساس ہی کہاں تھا۔ علمے کو تو اس لڑکی کے قریب رہنے سے اس کے ساتھ انسانی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس کے یوں چلے جانے سے وہ فکرمند تھا۔ انجان اور جوان لڑکی کسی غلط آدمی کے ہتھے چڑھ گئی —— تو کیا ہو گا۔ وہ یہی سوچ سوچ کر فکرمند تھا۔

لیکن

تاج نے اس بات کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی۔ اسے تو نئی شادی کا چاؤ

تھا ـــ بخو کے عشق کا بھوت دل و دماغ کو لپیٹ میں لئے تھا ـــ اسے گل پروشے کے گم ہونے کی فکر تھی نہ پرواہ ـــ

"کوئی چیز تو ساتھ نہیں لے گئی" تاج نے اپنے کمرے کی چیزوں کا سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے دیکھا نہیں ابھی۔ میں تو صبح سے اسی کے لئے پریشان ہوں"

"پاگل ہے تو"

"چوہدری صاحب ـــ وہ آپ کی بیوی ہے"

"بکواس بند کرو ـــ"

علما سہم گیا۔

تاج ہنس کر بولا "واہ علمے۔ تُو تو یوں پریشان ہے۔ جیسے وہ تیری سگی تھی کوئی ارے پگلے میں تو اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا خود ہی غائب ہوگئی ـــ اب تیری نئی مالکن آنے والی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے اسے تو ٹھکانے لگانا ہی تھا ـــ سمجھے ـــ"

علمے نے یونہی سر ہلا دیا۔ اس کے دل میں چوہدری کے لئے نفرت کی لہر سی اٹھی۔ پہلی بار اسے مالک کے خلاف اتنی شدت سے کراہت محسوس ہوئی۔ لیکن کچھ کہنے کی مجال کہاں تھی۔ چپ ہوگیا۔

تاج پلنگ پر پھر آڈا لیٹتے ہوئے بولا "جا ذرا چائے بنوا لا اچھی سی ساتھ کچھ کھانے کے لئے بھی لے آیا۔ دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھایا آج ـــ"

"اچھا جی" علما چلا گیا۔

تاج سگریٹ کے کش پہ کش لیتے ہوئے گنگنانے لگا۔ اس کے راستے کی بڑی رکاوٹ خود بخود دُور ہوگئی تھی۔ اس بات سے وہ بے طرح

خوش تھا۔
لیکن
یہ خوشی لمحاتی تھی۔
اس نے کوریڈور میں گل پروشے کو گزرتے دیکھا۔
"گل پروشے" اس نے پلنگ سے اُٹھ کر دروازے میں آتے ہوئے غصے سے چلا کر کہا۔
گل پروشے اپنے کمرے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہیں سے پلٹ کر تاج کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں جو شعلوں کی لپک تھی وہ تاج نہ دیکھ سکا۔
"کہاں سے آرہی ہو"
"کیوں"
"تیری یہ مجال کہ بغیر بتائے گھر سے نکل گئی — کہاں گئی تھی"
"پیلاں والی۔ ملک فضل کا بھین سے ملنے ——"
"کیا ؟؟؟" تاج کا دماغ چکرا گیا۔ بوکھلا کر چیخا — گل پروشے نے اس لمبی چوڑی چیخ نما کیا کا جواب دینے کی، بجائے نفرت اور حقارت سے تاج کو دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی ——
تاج تیزی سے لپکا اور کمرے میں آتے ہی بڑی سی گندی گال دیتے ہوئے بولا "پیلاں والی کیا کرنے گئی تھی"
"امارا مرضی ام گیا تھا" گل نے زہریلے انداز میں جواب دیا۔
"کتیا ——" تاج غراتے ہوئے اس پر جھپٹا — اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا "کیوں گئی تھی وہاں —— بتا کیوں گئی تھی"

گل پروشے کی گردن جھٹکے سے ٹوٹنے کو تھی۔ وہ درد سے بلبلائی۔ بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخی ـــــ "خنزیرا ـ بال چوڑا مارا"
لیکن تاج نے جھٹکے پہ جھٹکا دیا۔ غصے سے وہ لال پیلا ہو رہا تھا
گل پروشے پیلاں والی ہو آئی تھی۔ اس نے ضرور تاج کا کچا چھٹا بخو کے سامنے کھولا ہوگا۔ اگر وہ بدظن ہو گئی ہوئی تو ـــــ ؟
اس تو کے جواب میں تاج کے اندر درندگی بھر گئی ـــــ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ وہ گندی اور خرمناک گالیاں بکتے ہوئے بالوں سے گھسٹنے لگا۔
زہریلی ناگن زخم خوردہ تھی۔ اس نے بھی زہر اگلنا تھا۔ تاج کی کلائی میں دانت گاڑ دئے۔ اور اپنی پوری قوت سے اس کی کلائی کو کاٹ لیا۔
اب تاج درد سے بلبلایا ـــــ وہ بال چھوڑ کر اپنی کلائی چھڑانے لگا۔
لیکن گل پروشے بھی غصے اور انتقام کی آگ سے جل رہی تھی۔ اس پر پل پڑی۔
دونوں ایک دوسرے کو اونچی آوازوں میں گالیاں بکتے جھکتے گتھم گتھا ہو گئے۔ گل پروشے نے تاج کا گریبان پھاڑ ڈالا ـــــ اور تاج نے گل پروشے کے کپڑوں کے چیتھڑے کر دئے۔ گل پروشے کی لاتیں تاج کے پیٹ میں لگیں اور تاج کے مکے اور گھونسے گل پروشے کے بدن کو داغ داغ کر گئے۔
مقابلہ ہوا
لیکن
گل پروشے عورت تھی۔ اس تنومند اور غصیلے سکھیرے کا مقابلہ نہ کر سکی۔
چند منٹوں بعد ہی بے حال ہو گئی ـــــ وہ زمین پر لوٹنے لگی۔
پھر

تو تاج نے لاتوں سے اس کا بھرکس نکال دیا۔ وہ ہر لات پر لڑھکتی گئی تاج نے کبھی اسے اٹھا کر پٹخا — کبھی لاتوں سے لڑھکایا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔

شور و غل سن کر علما اور دوسرے نوکر لپکے۔ لیکن کسی کو سردار تاج محمد کھرے کے کام میں دخل دینے کی جرأت کہاں تھی۔ علما ہمت کر کے دو ایک دفعہ چھڑانے کو آگے بڑھا۔ تو تاج نے سختی سے ٹوکا اور اس طرح دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل فرش پر گرا —

تاج گل پر غصے کو گھسیٹتے ہوئے کمروں سے باہر لایا۔ برآمدے سے دھکا دیا اور پھر بجری والی سڑک پر لڑھکاتا گھسیٹتا گیٹ سے باہر دھکا دے کر بولا "ذلیل کمینی خبردار جو اب اس گھر میں آئی — دور ہو جا — جہنم میں جا — اب تیری شکل نظر آئی تو شوٹ کر دوں گا —"

گیٹ بند کر کے وہ پھنکارتا ہوا واپس لوٹ آیا جو شے سامنے آئی ٹھڈے سے اڑا دی۔

سارے نوکر دم بخود کھڑے رہ گئے۔

پو پھٹ رہی تھی۔

بخو فضل کی قبر پر پھول چڑھاتے ہوئے اپنے ابدی نیند سوئے ویرے باتیں کر رہی تھی۔

"ویرا — میرا ویرا"

اس کے لبوں سے بار بار نکل رہا تھا۔ وہ بڑی مضطرب اور بے چین نظر آ رہی تھی —

شادی میں تین دن باقی تھے اور وہ یہی خبر اپنے ویر کو سنا رہی تھی۔ بالکل جھلی لگ رہی تھی — اسے احساس ہی نہ تھا۔ کہ وہ مٹی کے بے جان ڈھیر کے سامنے جو کچھ کہہ رہی ہے وہ فضل نہیں سن رہا — اسے تو یہی لگ رہا تھا۔ کہ فضل اس کے سامنے بیٹھا ہے اور وہ ہنستے روتے سارے روئیداد اسے سنا رہی ہے۔

وہ کبھی چپ ہو جاتی

کبھی

بولنے لگتی۔

"نجو" کسی کی آواز آئی۔ اس نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ اوپر دیکھا تاج قبر کے قریب کھڑا تھا۔

"نجو" تاج دوزانو ہوتے ہوئے بولا — وہ سراسیمہ سا تھا۔

نجو کچھ نہ بولی۔ بولنے کو جی ہی نہ چاہا۔ وہ تو احساس کی جانے کن منزلوں پر تھی۔ حال کی زندہ گھڑیوں میں لوٹ آنے کے لئے وقت لگنا تھا۔

تاج گھبرا گیا

گھبراہٹ تو اسے کل ہی سے تھی۔ گل پروشے نجو سے مل گئی تھی۔ اس نے یقیناً ساری رازداری کی باتیں نجو سے کہہ دی ہوں گی —

"نجو" اس نے والہانہ بے تابی سے پھر پکارا

نجو اپنے آپ میں آ گئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ اور چادر اچھی طرح سر پر جما رہی تھی۔

"ناراض ہو نجو" تاج نے گھبرا کر پوچھا۔

نجو سمجھ گئی — کہ تاج گل پروشے کے یہاں آنے سے آگاہ ہو چکا ہے اور یہی آگاہی اس کی پریشانی کا باعث ہے۔

وہ آپے میں آ چکی تھی۔ اس لئے سنبھل گئی تھی۔ اس نے تاج پر اک نگاہ ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

"خفا ہونا" تاج اس کے کچھ قریب ہو گیا۔

"ہونہہ" نجو کے ہونٹوں سے صرف یہی نکلا اس نے دانستہ منہ پھیلا لیا تاج کی تو جیسے جان پر بن آئی۔

"نجو — اے نجو —" وہ بے تابی سے بولا۔

"کیا ہے" آواز میں کٹار کی طرح کاٹتی ہوئی دکھائی دی۔
"ناراض ہو گئی ہو"
"ہاں"
"خدا کے لئے خفا نہ ہو نجو —— میں جانتا ہوں کل وہ ذلیل پٹھانی تمہارے پاس آئی تھی"
"ہاں آئی تھی"
"وہ بکواس کر کے گئی ہو گی"
"آئی تھی تو کچھ کہا ہی ہو گا نا"
"تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا —— وہ بہت ذلیل ہے بہت کمینی"
"وہ تمہاری منکوحہ ہے سکھیرے"
"ہاں —— مجھے —— انکار تو نہیں نجو —— لیکن ——"
"مجھ سے کیوں چھپایا تھا"
"میں نے —— میں نے"
"ہاں ہاں ——"
"میں سمجھتا تھا تم جانتی ہو گی —— سب کو پتہ ہے ——"
"مجھے پتہ نہ تھا ——"
"نجو خدا کے لئے —— میری بات تو سنو ——"
نجو نے رُخ پھیر لیا۔ تاج کی پریشانی پر اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک آ گئی تھی۔
"میری بات تو سنو" تاج نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف اس کا رخ کرنا چاہا۔

نجو نے نخوت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تاج کی بے کلی اور پریشانی دید کے قابل تھی ——

"نجو —— میری بات تو سنو —— میں اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہوں"

تاج نے ہاتھ جوڑ دئے۔ لیکن نجو اس کی طرف دیکھ تھوڑا ہی رہی تھی۔

"نجو —— میری بات سن لو پہلے —— اپنے دل میں کوئی میل نہ لانا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی نجو —— میں سمجھتا تھا تم اس کے متعلق جانتی ہوگی۔ یہ لڑکی میں نے سوات سے خریدی تھی۔ وہاں غریب لوگ اپنی لڑکیاں بیچ دیتے ہیں۔ اس کے گھر والے بھی بہت غریب تھے۔ میں نے خرید لی ——"

"اور شادی رچالی"

"نہیں —— میں تو نہیں چاہتا تھا۔ یہ لڑکی ہی ضد کر بیٹھی —— مجبوراً نکاح کرنا پڑا"

"بڑے وڈے دل کے مالک ہو نا"

"طعنہ نہ دو نجو —— میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ میرے اس عورت سے کوئی تعلقات نہیں ہیں۔ وہ گھر میں بے کار شے کی طرح پڑی رہتی تھی۔"

"رہتی تھی ؟"

"ہاں میں نے اسے نکال دیا ہے گھر سے"

"کیوں ؟"

"وہ میرے خلاف تمہیں بھڑکانے آئی تھی —— وہ نہیں چاہتی ہماری شادی ہو"

"وہ آئی اور تمہیں فکر لگ گئی"

"فکر نہ لگتی —— وہ بکواس کرنے میں بڑی ماہر ہے جانے اس نے میرے

خلاف کیا کچھ کہا ہوگا ——"

نجو چپ ہو گئی۔ تاج چند لمحے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ تکتا رہا

"تم ناراض ہو مجھ سے —— نجو اپنے دل میں میری طرف سے کوئی میل
نہ لانا۔ اس کے بکواس پر کان نہ دھرنا ——"

نجو اب بھی بیٹھی رہی۔

"میں نہیں چاہتا ہم اپنی نئی زندگی کا سفر غلط فہمیوں کے بار تلے شروع
کریں جب تک تم مجھے معاف نہ کرو گی —— میں یہاں سے نہیں
اٹھوں گا"

"معافی کس بات کی مانگ رہے ہو —— اس نے —— اس نے تو
جو کچھ کہا تھا وہ ——"

"وہ کیا"

"وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں جانتی تھی سب کچھ ——"

تاج نے اک گہری سانس لی۔ بے یقینی سے نجو کو دیکھا۔ اس کے چہرے
پر غم کا تاثر تھا نہ خوشی کا۔ وہ کچھ بھی تو نہ جان سکا۔

وہ بار بار نجو سے معافی مانگنے لگا۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔

"معاف کر دے نجو"

"بخش دے"

"دل سے سارا میل نکال دے"

"تو نے مجھے معاف نہ کیا۔ تو زندگی مشکل ہو جائے گی۔ میں تجھے خوش
دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھ ہاتھ جوڑ رہا ہوں —— پاؤں پڑنے کو تیار ہوں"

تاج نے ہاتھ بڑھا کر نجو کے پیروں کو چھوا۔

تو

وہ مسکرادی ـــ فاتحانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچل گئی۔
تاج کی جان میں جان آئی گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے بولا " شکر ہے تو مسکرائی۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ تیری خفگی سے میری جان پر بنی تھی۔"
" ایسی بات ہی کیوں کی تھی "
"چل غلطی ہوگئی تو نے معاف بھی کردیا "
" پھر اٹھو اور جاؤ راستہ پکڑو "
"کیوں "
" دن نکل آیا ہے۔ لوگ آنے جانے لگے ہیں"
"کیا ہوا "
" نہیں تاج ـــــ"
" تاج تیرا نوتاج کی ـــ لوگوں کی کیا پرواہ ـــ اب ہم دونوں غیر تھوڑے ہی ہیں"
" ابھی اپنے بھی نہیں ہوئے "
تاج نے چونک کر نجو کو دیکھا۔ وہ مسکرادی " غلط بات تو نہیں کہہ رہی۔ ہی تو تین دن باقی ہیں ـــــ"
" اوہ ہاں ـــــ" تاج کے من میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔
"جاؤ نا" چند لمحوں بعد نجو نے کہا
" جاتا ہوں تھوڑی دیر اور بیٹھنے دو ـــــ"
"کیا کروگے "
"تمہیں تکوں گا "

"اتنے بے صبر نہ بنو ل"

"تم کیا جانو نجو ——"

"بہت پیار ہو گیا ہے مجھ سے"

"پیار نہیں عشق ہو گیا ہے"

نجو ہنس پڑی ——

"جھوٹ نہیں کہہ رہا نجو"

"ٹھیک ہی کہتے ہو گے"

"یقین کرو۔ میں نے پہلی بار جب تمہیں دیکھا تو تم میرے من کو بھا گئیں

نجو مسکرا دی

"تم فضل کی باگ پکڑتے ہوئے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں نا" تاج نے کہا

نجو کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ آنکھیں درد و کرب کی اذیت سے دوچار

ہو گئیں۔ تاج اپنی رو میں کہے گی "اسی دن اسی وقت تم میرے من میں بس

گئی تھیں۔ اور میں نے تمہیں حاصل کرنے کا عہد کر لیا تھا۔"

نجو بے رنگ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لئے اسے تکنے لگی "تم بھی

چاہتی ہو نا ——"

"ہاں —— میں نے تمہیں فضل کی پھوڑی پر دیکھا تھا —— تو ——"

"تو ——"

"تو ——"

"پسند کر لیا تھا مجھے"

نجو نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ تاج خوشی سے بہکنے لگا۔

"ہمارا پیار سچا تھا۔ اسی لئے میل ہو گیا" تاج نے مخمور نگاہوں سے نجو

کو دیکھا ـــ اس کا بس چلتا تو نجو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیتا۔
"اب جاؤ بھی" نجو نے ادائے دلربائی سے کہا۔
"جی نہیں چاہ رہا" وہ بے تاب جذبات سینے میں دباتے ہوئے بولا۔
"کہانا اتنے بے صبر نہ بنو"
"تھوڑی دیر اور بیٹھوں تو کیا حرج ہے۔
"فائدہ بھی تو کوئی نہیں۔ تو جس بات کے لئے آیا تھا۔ وہ کرلی"
"ہاں نجو۔ یقین مانو ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔"
"من میں چور تھا"
تاج خفت سے ہنس دیا "نہیں یہ بات نہیں۔ بس ڈر لگتا تھا۔ تم خفا نہ ہوگئی ہو کہیں ـــ"
"خفا تو میں ہوگئی تھی۔ پر معاف کردیا تجھے ـــ"
"اوہ تو کتنی اچھی ہے نجو ـــ"
اس نے بے تابی سے نجو کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ لیکن نجو نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ پرے ہٹا لیا۔
اس ادائے مست پر تاج مرمٹا ـــ
نجو کے بار بار کہنے پر بھی وہ نہیں اٹھا ـــ نجو کی قربت سے وہ مسحور اور مخمور تھا۔
شاید نجو بھی چاہتی تھی کہ وہ مسحور و مخمور رہے اسی لئے سختی سے اسے اُٹھ جانے کا ایک بار بھی نہ کہا تھا۔
ہاں جب خاصہ اجالا پھیل گیا۔ شہر کو جانے والی سڑک پر بیل گاڑیاں جانے آنے لگیں۔ گھڑ سوار ٹک ٹک کرتے شہر کا رخ کرنے لگے اور بیرونی

مسجد میں نماز کے بعد درس لینے والے لوگ واپس آنے لگے۔ تو تاج اپنی جگہ سے اٹھا۔

"رب راکھا بنو۔ اب تین دن بعد ہی ملیں گے"

"وج گج (دھوم) کے ملیں گے سکھیرے" بنو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بالکل بالکل" تاج نے سرمستی کے عالم میں کہا۔

پھر وہ بنو کو دوبارہ رب راکھا کہہ کر قبر کے دوسری طرف سے اپنے راستے پر چل دیا۔

بنو کے چہرے سے ساری مسکراہٹیں غائب ہوگئیں۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا غبار پھیلنے لگا — وہ جاتے ہوئے تاج سکھیرے کو خالی خالی نظروں سے تکتی رہی۔

تاج نے موڑ پر مڑ کر دیکھا اسے اپنی طرف تکتا پاکر ہاتھ ہلایا۔

بنو اس اشارے سے بے خبر بیٹھی رہی۔

پھر

اس نے سر جھکایا۔ اپنے ویر کی قبر کو دیکھا۔

"ویرا۔ میرا ویرا"

اس کے لبوں سے فریاد سی نکلی اور وہ کچی قبر پر سر رکھ کر بے اختیاری سے رونے لگی۔

نکتے کا بچہ۔ سوئر کا بچہ۔ ام کو چھوڑو ـــــ ام کو چوڑو ـــــ ام تمہارے دوست کا بیوی ہے ـــــ

گل پروشے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ لیکن انسان کے روپ میں چھپا بھیڑیا اس پر پل پڑا تھا ـــــ احتجاج ـــــ فریاد اور گالی گلوچ سے وہ مرعوب نہ ہو رہا تھا ـــــ

گل پروشے کو تاج کا بدتماش اور آوارہ دوست ساتھ لے آیا تھا۔ گل کو تاج نے دھکے دے کر گیٹ سے باہر کر دیا تھا۔ وہ اپنی اس بے عزتی پر بل کھاتی دانت پیستی اسے کوس رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر آرے چل رہے تھے۔ وہ بہت خوفناک نظر آ رہی تھی۔ گیٹ پھلانگ کر اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سخت تشویش میں تھی۔ اس کا ارادہ خطرناک تھا۔ وہ اندر جا کر پستول کی ساری گولیاں تاج کے سینے میں اتارنا چاہتی تھی۔

ایسے میں تاج کا دوست یاکی آ گیا۔ اس کا نام تو لیاقت تھا۔ لیکن سب یاکی کہتے تھے۔ جہاں بھر کا لوفر اور آوارہ آدمی تھا۔ تاج کا ہم پیالہ ہم نوالہ تھا

باب دادا کی جائیداد پر عیش کر رہا تھا۔ بیوی اس کی عیاشی فحاشی سے تنگ آکر میکے جا چکی تھی۔ اب اسے من مانی کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔

گل پروشے کو اس حال میں دیکھا تو صورت حال سمجھتے دیر نہ لگی۔ فوراً ہی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ بڑی ملائمت سے پوچھا "کہو کیا ہوا بھابی۔ لڑائی ہو گئی تاج سے"

"اس حرامی بچے کو ہم جان سے مارے گا" گل پروشے غرائی۔

"حوصلے سے کام لو بھابی۔"

"اب ہم میں حوصلہ نیئں ہے۔ ام اس کو جان سے مارے گا"

یاکی نے بھرپور نظروں سے گل پروشے کو دیکھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا تھا۔ اور اس کا دودھیا بدن جھانک رہا تھا۔ یاکی جیسے نفسلے آدمی کے لئے یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ تاج اور گل پروشے کے تعلقات سے آگاہی تھی۔ تاج کے لئے اب گل پروشے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسی لئے تو اس دن اس نے شراب کے نشے میں گل دوستوں کو بخش دی تھی۔

ان دوستوں میں ایک یاکی بھی تھا۔

یاکی کی نیت بد ہو گئی۔ لیکن گل اس وقت سراپا شعلہ بنی تھی۔ غصے سے زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح کوٹھی کے اندر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ کپڑے پھٹے تھے۔ چہرے کی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ دانت لہو بہنے سے سرخ ہو رہے تھے۔ چانٹوں کے نشان تھے جسم پر مکوں گھونسوں اور لاتوں کے داغ تھے۔

"بھابی" یاکی نے اسے بازو سے پکڑ کر گیٹ سے ہٹایا۔

"چوڑوام کو ——"

"بھابی صبر سے کام لو۔ غصے سے کام نہیں بنے گا۔ بات کیا ہوئی ہے مجھے بتاؤ میں تاج کو سمجھاؤں گا۔ اس وقت وہ بھی غصے میں ہوگا۔"

"اس نے ام کو مارا۔ ام کو گھر سے نکالا۔ ام اس کو نئیں چوڑے گا"

"بالکل نہ چھوڑیں۔ اس زیادتی کا بدلہ ضرور لیں ——"

"تم امارا مدد کرے گا"

"ضرور کروں گا۔ آپ مظلوم ہیں آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے ——"

"تو ام کو گیٹ کے اندر کرو"

"کیا کریں گی اندر جاکر"

"پستول سے شوٹ کرے گا اس کو"

"بھابی"

"ام کو مت روکو"

"روکتا نہیں۔ لیکن آپ کا طریقہ غلط ہے۔ پستول ہے آپ کے پاس"

"ام اندر سے لے گا۔ سردار کے پستول سے اسے مارے گا"

یاکی ہنس پڑا۔

گل پروشے نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بھابی —— کیا تاج پستول آپ کے ہاتھ میں پکڑا دے گا۔ پستول تو اس کے پاس ہوگا"

"ام اس سے چھینے گا"

"جذباتی باتیں مت کریں۔ چلیں میرے ساتھ"

"کدر ——"

"میرے گھر"

"نہیں"

"یہاں سرِعام پڑی رہیں گی ــــ؟"

"ام جو چاہے گا کرے گا"

"عقل سے کام لیں۔ سردار سے بدلہ لینا ہی ہے تو تھوڑی عقل استعمال کریں وہ بڑا زور آور آدمی ہے۔ وہ آپ کو قتل بھی کروا سکتا ہے۔ یہاں ٹھہرنا عقل مندی نہیں ــــ آپ کو پتہ ہے وہ قتل کروانے میں کتنا تیز ہے۔ وہ اپنے دشمن کو اک چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ــــ"

بات گل پروشے کی عقل میں کچھ کچھ آگئی ــــ اس کا جوش و جنون قدرے کم ہوگیا۔

یاکی نے بات بنتے دیکھی۔ تو چکنی چپڑی باتوں میں گل پروشے کو لگا لیا۔ تاج سے انتقام لینے میں اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ بڑے بہلاوے دئے۔ بھروسے اور اعتماد کی فضا بحال کی۔

"تو چلو" گل پروشے اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوگئی۔ اس کے سینے میں الاؤ جل رہے تھے۔ وہ بہت خونخوار ہو رہی تھی۔ تاج کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا سوچ رہی تھی۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

یاکی اسے گھر لے آیا۔ ایک کمرے میں گل کو بٹھاتے ہوئے بولا "میں اپنی بیوی کے کپڑے لا کر دیتا ہوں۔ آپ بدل کر آرام سے لیٹ جائیں۔"

گل پروشے انجام و عواقب سے بے خبر صرف اور صرف تاج کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ اس ظالم انسان کو اس بھیڑیئے صفت آدمی کو اس مرد کے

روپ میں درندے کو زندہ نہیں چھوڑے گی اس نے عہد کر لیا۔

یاکی کپڑوں کا جوڑا لے آیا ـــــ "آپ کپڑے بدل لیں۔ میں چائے بنوا کر لاتا ہوں ـــــ"

وہ کپڑے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ گل پروشے چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ پھر اس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے جسم کے کئی حصے پھٹ جانے والے کپڑوں میں سے جھانک رہے تھے۔ شرم اور غیرت سے وہ کانپ گئی۔

جلدی سے اٹھی۔ دروازہ بند کیا اور کپڑے تبدیل کر لئے۔ اس نے چادر سے اپنا پورا وجود ڈھانپ لیا۔ غسل خانے میں اس نے منہ ہاتھ بھی دھویا اور بال بھی ٹھیک کئے۔

وہ بظاہر پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کے من میں اب بھی آندھیاں چل رہی تھیں۔ جھکڑوں کا زور تھا۔ اس کی دنیا لٹ گئی تھی تہس نہس ہو گئی تھی۔ لیکن وہ خاموشی سے اس پر ماتم کرنے کے حق میں نہیں تھی ـــ وہ تاج سے بدلہ لے گی۔ اسے زندگی کی رنگینیوں میں کھونے سے پہلے ہی ختم کر دے گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہو" گل پروشے نے پوچھا۔

"چائے لایا ہوں بھابی" یہ یاکی تھا۔

گل نے دروازہ کھول دیا۔ یاکی کی ہمدردی اس پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا سبب تھی۔ وہ چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا "آپ چائے پی کر اطمینان سے لیٹ جائیں۔ کچھ سکون ملے گا ـــــ"

"ام کو سکون ابھی نہیں ملے گا" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے پھر بھی آرام تو کریں"

"ام آرام اس وقت کرے گا جب تاج کو آرام کی نیند سُلا دے گا"

"ضرور ضرور ـــــ" یاکی نے طرفداری کی۔ "آپ جیسی مظلوم عورت کے ساتھ مجھے دلی ہمدردی ہے۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا ـــ لیکن اس وقت بہتر یہی ہے کہ آپ آرام کریں ـــــ"

"تم اما را مدد کرے گا ؟"

"یقین کریں بھابی"

"ٹھیک ہے"

"چائے پئیں"

"تم جاؤ ام پیئے گا"

یاکی اٹھ کر چلا گیا۔ گل نے گرم گرم چائے کی دو تین پیالیاں اندر اُنڈیلیں پھر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

اور

جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن بھر کی تھکی تھی۔ شام مارنے ادھ موا کیا تھا۔ وہ سوئی۔ تو پھر دن چڑھے ہی اٹھی۔

وہ رات دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر سو گئی تھی۔ صبح جوں کی توں اٹھی۔ تو یاکی پر بھروسہ اور اعتماد دہ چند ہو گیا۔

سارا دن وہ یاکی کے ہاں ہی رہی۔ وہ اس کے پاس وقفوں کے بعد آ کر بیٹھتا رہا ـــ اس کے ساتھ انتقام کے منصوبے بناتا رہا۔ اس کو پستول دینے کا بھی وعدہ کیا۔

گل پروشنے انسانی روپ میں ابلیس پر پورا یقین کر بیٹھی۔

لیکن
دوسری شب
وہ اس کے کمرے میں آگیا۔ گل پہلے تو کچھ نہ سمجھی اس کے ذہن پر تو صرف تلج سے انتقام ہی کا بھوت سوار تھا۔
لیکن درندگی اور خباثت نے جب اسے اپنی لپیٹ میں لینا چاہا تو وہ چیخ اٹھی ——
اس نے احتجاج کیا
اس نے فریاد کی
اس نے منت سماجت کی
گالیاں بکیں
کوسا
مارا
لیکن ایک درندے کے سامنے اس کی کیا حقیقت تھی۔ وہ اس کی ساری باتوں کے جواب میں کھل کر قہقہے لگاتا رہا —— اسے بتاتا رہا کہ اس کے سردار نے اسے بخشیش کے طور پر اپنے دوستوں میں بانٹ دیا ہے۔
اس بخشیش کے حقدار دوسرے دوست محبوب حمید اور صابر بھی ہیں ——
گل پروشنے جور و ستم کے خلاف چیختی رہی۔
لیکن اس درندے نے اک پاک طینیت غیرت مند اور گھریلو زندگی کی متمنی عورت کو کچل ڈالا۔ بکھیر دیا توڑ پھوڑ دیا ——
صرف اسی نے نہیں دوسرے دن اس کے باقی دوستوں نے بھی بخشیش کا حصہ وصول کیا۔

گل پرو شے ٹوٹ گئی بکھر گئی چکنا چور ہو گئی۔ لُٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔

اور

جب

اک عورت کی دنیا لُٹ جائے خواب چکنا چور ہو جائیں وجود ٹوٹ پھوٹ جائے تو

وہ

عورت باقی نہیں رہتی

صرف

اور

صرف

جذبۂ انتقام بن جاتی ہے۔

جذبۂ انتقام

جو انتہائی شدید بے حد خطرناک اور بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے۔

رت بدل چکی تھی۔ گلابی جاڑا تھا۔ اس سردی کو پنڈ کے لوگ خطر میں کب لاتے تھے۔ کھیسوں اور چادروں کی بکلیں اتار پھینکی تھیں۔ بیٹھکوں میں رت جگے نہیں ہوتے تھے۔ میدانوں میں رات گئے تک بیٹھنے اور گپ شب لگانے کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ درختوں تلے چارپائیاں اور حقے آ گئے تھے۔ ڈھور ڈنگر بھی اب کڑھوں کی بجائے کھلے آسمان تلے بندھے جانے لگے تھے۔

گاؤں کی الڑ مٹیاریں کھیل کود کے لئے شام ڈھلتے ہی میدان میں جمع ہونا شروع ہو جاتی تھیں —— ان کی مائیں بھی کام کاج ختم کر کے کھیتوں کے کنارے آ بیٹھیں۔ گندم کی فصل تیار ہو رہی تھی —— فضا کچی گندم کی خوشبو سے بھری رہتی تھی۔

لڑکیاں بالیاں میدان میں جمع تھیں۔ گیارھویں کا چاند آسمان کے سینے پر دھرا تھا۔ اب ان مٹیاروں کے کھیلوں میں وہ گرمی وہ زندگی اور وہ پیار نہ رہا تھا۔ ان سب کی روح رواں نجو تھی۔ جو اب یہاں نہیں آتی تھی۔ اس کی ساتھی سکھیاں بھی بددل ہو گئی تھیں۔ شادو بیگی تو پھر کبھی کبھی کود لیتیں لیکن رتو تو

انا چھوڑ ہی دیا تھا۔
آتی بھی تو کھیل میں حصہ نہ لیتی۔
چپ چاپ کسی کھیت کی کچی منڈیر پر بیٹھ جاتی۔ لڑکیوں کے اصرار پر بھی لکن میٹی میں حصہ لیتی نہ کلی کلیری میں۔
آج بھی لڑکیاں میدان میں آئی ہوئی تھیں۔ چاندنی کا فسوں پھیلا تھا —— گدرائی ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں —— الٹر مست اور فکر فردا سے آزاد کنواریاں کھیل رہی تھیں —— غم فکر سے آزاد تھیں کچھ دن انہوں نے گاؤں میں ہونے والے المیے کا دکھ جھیلا تھا۔ لیکن اب وہ اسے فراموش کر چکی تھیں ——

ہاں ان کی ماؤں اور بڑی بہنوں بھابیوں کے لئے یہ موضوع آج بھی تازہ تھا —— آج تو بطور خاص وہ باتوں میں مصروف تھیں۔ فضل کے قتل اور نجو کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔
گل پروشے کے گاؤں آنے کی باتیں ہو رہی تھی۔
رتو عورتوں کے جھگڑے سے ذرا ہٹ کر اکیلی بیٹھی تھی۔ دل بے طرح اداس تھا۔ نجو سے وہ روٹھی ہوئی تھی۔ جانتی بھی تھی کہ وہ بس دو دن کی مہمان ہے پھر بھی وہ اس کے پاس نہیں گئی تھی۔
عورتیں چہ چے کر رہی تھیں
"ہیں نی۔ تو نے دیکھا تھا پٹھانی کو"
"لو اور سنو۔ دیکھا کیا اچھی طرح دیکھا تھا"
"بھئی ایڈی سوہنی عورت میں نے نہیں دیکھی"
"تاجے کی بیوی ہے پہلی"

"ہائے میں مرگئی۔ بخو سوکن پر جارہی ہے"
"ہاں۔ تمہیں پتہ نہیں"
"مجھے کیا پتہ"
"اس کڑی کو پتہ نہیں سوجھی کیا ہے"
"مرضی کی مالک ہے وڈا نکا تو کوئی رہا نہیں۔ خود ہی فیصلہ کرلیا اس نے ——"
"فضل زندہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا"
"اے کیا پتہ —— وہ خود بھی تو سکھیروں سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔
"دوستی اور بات ہے۔ دھی کا رشتہ دینا اور بات۔ آخر کو تو یہ لوگ اس کے پیو کے قاتل ہیں ——"
"تاج کے کرتوت بھی تو سب جانتے ہیں"
"اس کی تو نظریں ہی بھیڑی ہیں"
"لچا ہے لچا ——"
"اللہ خیر کرے بخو کی"
"مت ماری گئی ہے اس کی"
"ہائے ہائے —— گھر ہی تباہ ہوگیا ملکوں کا"
"رہا ہی کوئی نہیں ——"
"کیا شان تھی چوہدری رحمت علی کے ویلے اس خاندان کی —— حویلی کی"
"ہاں"
عورتیں پرانی باتیں یاد کرنے لگیں۔

"آج ملکاں کی دھی کی شادی رچی ہے۔ تو لگتا ہے جیسے کوئی مر گیا حویلی سونی ہے بالکل۔"

"حالانکہ دو دن کے بعد شادی ہے"

"کوئی رونق ہی نہیں ——"

"بھئی رونق تو ہوتی ہے لوگوں کے کھڑ سے۔ گانے بجانے سے۔ ڈھول ڈھمکا بجنے سے۔ لیکن بنجو نے سب کو منع کر دیا ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ جواں بھائی کی ابھی تو راہیں بھی میلی نہیں ہوئیں "شادی کی اتنی اتول (جلدی) کیا پڑی تھی۔ کوئی سال چھ مہینے اڈیک لیتی ——"

رتو کے یہ بات دل لگی۔ "واقعی اتنی جلدی کیا تھی شادی کی۔ ویر کی اتنی دیوانی تھی۔ راہ بھی میلی نہ ہونے دی اور شادی رچا بیٹھی"

دل ہی دل میں بل کھاتے ہوئے رتو نے سوچا۔ اسے بنجو سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ راجو کا دل توڑنے والی بے رحم لڑکی سے تو وہ پہلے ہی روٹھی ہوئی تھی۔

وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا جی چاہا ابھی جا کر بنجو کو جھنجھوڑ ڈالے۔ خوب لعنتیں دے۔ اس شادی کو بربادی کہے۔ جو بھائی کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی وہ رچا بیٹھی تھی۔

لیکن

وہ بنجو کے گھر کی طرف نہ گئی۔ ہولے ہولے چلتی اپنے گھر کو جانے لگی۔ لیکن وہ اپنے گھر بھی نہ گئی۔ اس کے کانوں میں بنسری کی درد بھری لے اترنے لگی۔ اس کا بھارا جو درختوں کے پار بنسری کا کلیجہ چیر کر فضا میں درد ہی درد بکھیر رہا تھا

اس کے قدم آپوں آپ اس طرف اٹھنے لگے۔
راجو ایک ٹنڈ منڈ درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بنسری بجا رہا تھا۔ بنسری کیا تھی نوحہ تھا۔ ساری فضا سوگوار تھی درد برس رہا تھا۔ دکھ بھری چاندنی پر سوپھیلی ہوئی تھی۔
راجو کو تو جیسے سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی اداسی تھی کہ دیکھنے والے کا صبر و ضبط لٹ جاتا تھا۔
رتو چپ چاپ اسے تکے گئی۔ اس کے دل کا درد پگھلنے لگا۔ اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

جب درد حد سے بڑھا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر بنسری راجو کے ہونٹوں سے جدا کر دی اور دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "بس بھا راجو بس ــــ"

راجو نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے رتو کو پا کر حیران ہوا "تو کب آئی رتو بھین ــــ"

"مجھ سے تیری حالت نہیں دیکھی جاتی بھا راجو" رتو پھر رو پڑی۔
راجو بڑا متاثر ہوا۔ اس معصوم سی لڑکی کی ہمدردی نے اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا۔ اس کے دل میں اس کے لئے عقیدت بھر گئی۔ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔
"تو روتی کیوں ہے بھین رتو ــــ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے"
"وہ بہت بری ہے۔ اس نے تمہیں غریب سمجھ کر چھوڑ دیا ہے نا"
راجو نے گہری سانس لے کر کہا "غریب ہی تو ہوں ــــ"
"یہ اسے پہلے نہیں پتہ تھا"

"چلو کیا ہوا ——"

"ہوا ہی کچھ نہیں۔ تیری زندگی برباد کردی اس نے۔ بہت بُری لگنے لگ
ہے مجھے"

راجو دھیرے سے مسکرایا —— یہ مسکراہٹ زخم خوردہ تھی۔

"ہاں سچ کہہ رہی ہوں میں"

"تو بہت غصے میں ہے رتو —— ورنہ یہ بات نہ بھولتی۔ کہ جو دل کو
پیارے ہوتے ہیں وہ کبھی بُرے نہیں لگتے ——"

"ہونھ"

"سچی بات ہے"

"نجو تجھے اب بھی اچھی لگتی ہے"

"نجو ——"

وہ چند لمحے چُپ رہا —— رتو جلدی سے بولی" دفع کر اسے۔ بہت
بُرا کیا اس نے تیرے ساتھ پہلے پیار کیا پھر دھتکار دیا ——"

"ہاں رتو بھین —— جانے اس نے ایسا کیوں کیا —— شاید کوئی مجبوری ہو
کوئی مصلحت ہو ——"

"ہائے ہائے اب بھی دل کو جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ بے وفا
نکلی ہے راجو بھا۔ اسی لئے تو میں اس سے بولتی نہیں ہوں۔ اس نے مجھے
ایک دو دفعہ بلا بھی بھیجا ہے پر میں گئی نہیں ——"

"کیوں"

"بس وہ قول کی جھوٹی نکلی۔ ایسی کڑی سے میں دوستی کیوں کروں"

"تجھے تو کچھ نہیں کہا نا اس نے —— دھتکارا تو مجھے ہے"

"میرے ساتھ کون سا اچھا بولتی ہے — پھر تمہیں جس طرح چھوڑ گئی ہے مجھے زہر لگتی ہے"

"نہ نہ رتو بھین — اگر تجھے اس سے واقعی پیار تھا۔ تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا —"

"کیوں نہیں ہو سکتا — دیکھ لے۔ میں اس سے بالکل نہیں ملتی اس کی شادی میں بھی نہیں جاؤں گی — اس لئے تو کہتی ہوں تو بھی اسے دفع کر صحت برباد کر لی ہے اتنا سا منہ نکل آیا ہے تیرا — چھوڑ دے اس کا خیال"

"رتو بھین" راجو نے کہا پھر چند لمحے چپ رہا۔ رتو اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ بڑے مستحکم لہجے میں بولا "نجو میرا سچا تے سچا پیار ہے بھین رتو — اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ چھوڑ دیا ہے — وعدے نہیں نبھائے۔ قول توڑ دئے۔ ساری باتیں بھلا بیٹھی — لیکن وہ میرے لئے اب بھی وہی ہے"

"تو بھی جھلا ہو گیا ہے" رتو چڑ کر بولی۔

راجو ہنس پڑا — پھر ہنسری دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے بولا "سجن وچھڑ جائیں نا۔ تو دل کے اور بھی قریب ہو جاتے ہیں۔ رتو بھین —"

رتو نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ بولا یہ پیار تو نہ ہوا نا۔ کہ سجنوں نے منہ موڑا۔ تو خود بھی منہ موڑ لیا — پیار سچا ہو گہرا ہو سچا ہو۔ تو مٹا کہاں ہے بی بی — یہ تو اپنی جڑیں من میں اور گہری کر لیتا ہے"

"ہائے ہائے پاگلوں والی باتیں کرتا ہے تو بھا راجو"

"تو نہ سمجھے گی رتو بی بی — دلاں دیاں لگیاں دلاں والے ہی جانتے ہیں —"

"ہوکھ" رتو نے بُرا سا منہ بنایا۔

"میری تو دُعا ہے نجو شاد و آباد رہے — جس مصلحت کے تحت بھی اس نے یہ فیصلہ کیا ہے اس میں کامیاب ہو۔ شاد آباد رہے۔ شاد و آباد —"

راجو کی آواز حلق میں پھنس گئی — رتو نے اس کی طرف دیکھا۔ ضبط کا یارانہ رہا — آنکھوں میں آنسو بھر آئے — اور آنچل میں انہیں جذب کرتی وہ واپس جانے کو مڑی۔

"اس کے ہاں ضرور جانا رتو — وہ تیرے بچپن کی سکھی ہے —" راجو نے کہا۔

رتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے چلتی چلی گئی۔

راجو کے ہونٹوں سے پھر بنسری کا چھلنی سینہ چھو لیا۔

اور

فضا میں پہلے سے بھی زیادہ درد بھرے نغمے بکھرنے لگے۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند
و ز جدائی ہا شکایت میکند

پہلاں والی کی فضا سوگوار تھی۔ اک غیر محسوس سی اداسی ہر دل میں اُتر رہی تھی ـــــ در و دیوار گم صم تھے۔ شجر و حجر چپ سادھے محسوس ہوتے تھے۔

آج نجو کی شادی تھی۔
ملک فضل کی بہن کی شادی تھی
لیکن
حویلی کے در و دیوار اُداس تھے۔ دالان صحن کوٹھے سب مہمانوں سے بھرے تھے۔ عورتوں لڑکیوں اور بچوں نے رنگا رنگ لباس پہن رکھے تھے۔ مردوں نے بھی نئے اور ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ گھر شادی والا گھر نہ لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی میت اُٹھنے والی ہے۔ لوگ فضل کو یاد کر رہے تھے۔
اس جواناں مرگ کو رو رہے تھے۔
نجو کے لئے آنسو بہا رہے تھے۔

آج اس اکیلی دھئی کا ڈولہ اُٹھنے والا تھا۔ باپ نہ تھا جس کے گھر کی دہلیز
اس نے چھوڑنا تھی۔ بھائی نہ تھا جس نے سر پہ ہاتھ پھیر کر اسے پرائی کرنا تھا
کوئی قریبی ماما چاچا بھی نہ تھا۔ جس نے یہ فریضہ ادا کرنا تھا۔
لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔

ادر

آنسو بہا رہے تھے۔

پھپھی سکینہ اپنی جھلّی دھئی کو فضل کے گھر لے کر آئی تھی۔ لوگ اس نامراد
کو دیکھ کر دھاریں مار مار کر رو رہے تھے۔

برات بڑی دھوم دھام سے آئی ـــــ سکھیروں کی خوشیوں کا ٹھکانہ
نہ تھا ـــــ وہ ناچ رہے تھے۔ گِدے ڈال رہے تھے۔ لڈیاں ڈالتے
ہوئے آئے تھے۔ بھنگڑہ ڈال رہے تھے۔ ان کی خوشیاں حق بجانب
تھیں۔ ان کے جذبات فاتحانہ تھے۔ ان کا ہاتھ اوپر تھا۔ ان کا سر اونچا
تھا۔ وہ اپنے جدی پشتی دشمنوں کی بیٹی بیاہ کر لے جا رہے تھے۔ اس بیٹی
کے باپ کو انہوں نے قتل کیا تھا ـــــ اور تاج جانتا تھا۔ کہ اس کے
بھائی کو قتل کرانے والا وہ خود ہی تھا۔

برات کی سج دھج بڑھانے کے لئے شہر سے سوہنی کا بینڈ آیا تھا۔ یوں
بھی ٹکڑیوں میں ڈھول باجے بج رہے تھے۔ کچھ مسخروں نے سوانگ بھرے
ہوئے تھے۔ کچھ کھیل تماشے دکھا رہے تھے۔

سکھیروں کی برات اس دھوم سے آئی کہ پپلاں والی کا ہر فرد مرعوب سا
ہو گیا ـــــ ہر کوئی داد دے رہا تھا۔

واہ واہ ہوئی۔

شاباشیں ملیں۔
ملکوں اور سکھیروں کے ملاپ پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔
لیکن
جو اُداسی دلوں میں اتر گئی تھی وہ اس سارے ہنگامے اور رنگا رنگ تفریحی پروگرام سے بھی دور نہ ہوئی۔
فضل کی شادی کا سانحہ اک زندہ المیہ تھا۔ بیگاں کی دیوانگی۔ نجو کا اکیلا پن اور کچھ رازدانوں کے لئے راجو کی ناکامی دکھ واذیت کا باعث تھی۔ رتو آج بھی اسی لئے نہیں آئی تھی۔
نجو نے سب سہیلیوں سے پوچھا تھا
"اسے بلالاؤ" اس نے شادو سے کہا تھا۔
"پھر یہ وقت کہاں آئے گا" اس نے چاچی سے کہا تھا۔
"اسے کہو مجھے اپنے ہاتھوں سے وہٹی بنائے۔ میرا شنگار کرے مجھے کپڑے پہنائے۔ میرے ماتھے پر ٹیکہ سجائے۔ میری بانہوں میں چوڑیاں بھر دے۔ میرے گلے میں کنٹھے اور مالائیں ڈالے" اس نے بڑے کرب سے جیلاں سے کہا تھا۔
لیکن
وہ کسی کے کہنے پر نہیں آئی تھی۔ اسے راجو کا دُکھ تھا۔
راجو جو بڑے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ اور جس کے پیار کی گہرائیوں اور گہرائیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔
راجو کی تڑپ سے بھی آگاہ تھی۔ وہ رات رات بھر ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ بانسری کے کلیجے سے دُکھ کے نغمے چیر کر نکالتا رہتا تھا۔

وہ نہیں آئی۔

بخو نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔

اس نے خود ہی کپڑے پہنے سنگار کیا۔ زیور پہنا اور گوٹے سے بھ
لال دوپٹہ اوڑھ بیٹھی

سہ پہر کو برات کی واپسی تھی۔ لال گوٹے کناری والے دوپٹے سے ڈھک
سرخ ڈولہ حویلی کے دروازے پر آگیا تھا۔

زرتار سنہری لڑیوں اور پھولوں سے بنا سہرا ڈالے کمخواب کی شیروانی
پہنے تاج ڈولے کے قریب کھڑا تھا۔

رخصتی کے لئے کہا جا رہا تھا۔ لوگ اُمنڈ اُمنڈ کر حویلی کے دروازے
کی طرف آ رہے تھے۔ سوہنی کا بینڈ الوداعی گیت کی دھن بجانے کو تیار
کھڑا تھا۔

رشتے کی بھابیاں پھپھیاں مامیاں بخو کو ڈولے تک لانے کے لئے
دالان میں گئیں — بخو پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر انوکھا سا
نکھار تھا — بڑا روپ آیا تھا۔

لیکن اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ وہ بالکل نہیں روئی تھی۔

"چلو بیٹی" کسی رشتے کی تائی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو تائی" بخو نے کہا

"کیوں"

"تم سب لوگ تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جاؤ"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بخو پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔

"جاؤ نا" پتھر کے بت کے ہونٹ ہلے۔

"کیوں" کسی نے کہا

"میں نے کہا نا جاؤ سب ——— جاؤ بھی ———" وہ درد بھرے التجا آمیز لہجے میں بولی

بادلِ نخواستہ سب کمرے سے جانے لگے۔ شادو اور بیگی پلنگ پر ہی بیٹھی رہیں"

"تم بھی جاؤ" نجو نے کہا۔

"بات کیا ہے نجو ———"

"بتاؤں گی۔ پہلے جاؤ باہر"

وہ دونوں بھی باہر چلی گئیں۔ نجو نے دالان کا دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ اپنے ویر کے خون آلود کپڑوں اور سر سے یوں لپٹ گئی۔ جیسے یہ بے جان چیزیں نہ ہوں ——— اس کا اپنا پیارا ویر فضل ہو ——— وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بڑی عقیدت سے سب چیزوں کو چوما آنکھوں سے لگایا ——— بکس کی طرف آئی ——— کوئی چیز نکال کر دوپٹے کے اندر کی۔

اور

دروازہ کھول دیا

عورتوں لڑکیوں بچوں کا ہجوم پل پڑا۔ رشتہ دار مرد بھی آگے بڑھے

کماروں نے ڈولہ حویلی کے صدر دروازے سے لگا دیا۔ تاج کمخواب کی اچکن پہنے بنارسی پگ پر بھاری پھولوں اور زرتار لڑیوں کا سہرا پہنے ڈولے کے قریب کھڑا تھا۔ ڈولے پر سرخ گوٹے سے بھری چادر ڈالی گئی تھی۔ اور پھولوں کی پتیاں بکھیری گئی تھیں۔

شادی کی ساری رسمیں انجام پا چکی تھیں۔ وقت رخصت قریب تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ برات کے ساتھ آئے لوگ گلی کھیتوں اور میدان میں منتظر کھڑے تھے۔ سوہنی کا بینڈ رخصتی دھن بجانے کے لئے تیار تھا۔

شور شرابے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر کوئی ڈیوڑھی اور گلی کی طرف لپک رہا تھا۔ نجو کو ڈولی میں بیٹھتے دیکھنے کے لئے لڑکیاں اور عورتیں تو امنڈی آ رہی تھیں۔

نجو دلہن بنی تھی۔ سرخ سلمے ستارے اور گوٹے کناری سے بھرے کپڑے پہنے تھے۔ لمبے بالوں میں سونے کی گھنگھریوں والا لال پراندہ ڈالا تھا۔

سر سے پاؤں تک بھاری بھاری زیور تھے۔

"جلدی کرو بھئی — ڈولہ آگیا ہے۔ براتی تیار کھڑے ہیں۔ دوسرے گاؤں پہنچنا ہے دیر ہو رہی ہے" کسی رشتے کے چاچا نے آکر لڑکیوں سے کہا۔ جو بنجو کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

بنجو

جو

وہاں تھی

لیکن نہیں تھی۔

رشتے کی بہنیں بھابیاں آگئیں۔ جل تھل آنکھوں سے بنجو کو دیکھا

"چلو بنجو —"

انہوں نے بنجو کو پلنگ سے اتارا۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھایا اور دلان سے باہر لے جانے لگیں۔

بنجو کا رخ دروازے کی بجائے دیوار کی طرف ہو گیا — وہ آہستہ آہستہ چلتی فضل کے سہرے اور کپڑوں کے قریب گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان بے جان چیزوں کو نہیں۔ جیتے جاگتے فضل کو تک رہی ہے۔ پھر اس نے سر بھی یوں جھکایا جیسے وقت رخصت بھائی کا پیار لے رہی ہو۔

ارد گرد کھڑی عورتیں اور لڑکیاں سسک اٹھیں — آنچلوں سے آنسو پونچھ پونچھ کر انہوں نے آنکھیں اور ناک سرخ کر لئے تھے۔

بنجو چند لمحے سہرے کی لڑیوں کو آنکھوں سے لگائے رہی پھر انہیں چوما اسی طرح فضل کے خون آلود کپڑوں کو بوسہ دیا۔ جانے کیا بڑبڑائی۔

بھابی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا رُخ اپنی طرف موڑتے ہوئے
چھوڑ دے جھلیئے — جا اپنے گھر — رب تجھے سدا راضی رکھے"
نجو کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ ہونٹ بھی
روکھے پھیکے تھے — آنکھوں میں اجنبیت کی دھند پھیلی تھی۔
عورتیں اسے دونوں بازوؤں سے تھامے دالان سے باہر لے آئیں۔
صحن میں کھڑی عورتیں نجو سے ملنے کو اس پر پل پڑیں۔ روتے ہوئے گلے
ملیں۔ سسکتے ہوئے دعائیں دیں۔
نجو
کی آنکھوں سے آنسو کا اک قطرہ نہ بہا۔ بابل کی دہلیز چھوڑتے وقت
تو کڑیاں رو رو کر بے حال ہو جاتی ہیں — جس نثار کا بھائی نہ ہو۔ وہ ایسے
وقت میں مجسم فریاد بن جاتی ہے۔
لیکن نجو چپ چاپ صحن پار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔
حتیٰ کہ جب رتو بے اختیار ہو کر آ گئی اور اس سے لپٹ کر تڑپ کر رو دی
جب بھی نجو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا قطرہ نہ ٹپکا۔
"غم سے بت بن گئی ہے"
"جی کو کچھ نہ ہو جائے"
"رو لیتی تو دل کا غبار نکل جاتا"
"ہائے وچاری"
عورتیں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کچھ ایسی بھی تھیں
جو سر جوڑے آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ نجو کو روتے
دھوتے ڈولے میں سوار ہونا چاہئے تھا۔ یہ بات تو انہیں عجیب سی

لگ رہی تھی۔

"جا بچے"

"تیرا رب رکھا دھئی"

"سکھی رہے"

"بابل کی حویلی اندھیری ہو گئی ہے۔ پیچھے کوئی نہیں رہا۔ آگے جا کر خدا تیرا گھر روشن رکھے"

آنسوؤں اور دعاؤں کے سہارے بنجو کو دروازے تک لایا گیا۔ تاج کو اس کے برابر کھڑا کیا گیا۔

بھابی رحمتے تھالی میں کچے چاول ڈال لائی۔ بنجو اور تاج کے سامنے کرتے ہوئے بولی "چاول اپنے پیچھے پھینکو"

یہ رخصتی کی رسم تھی۔ اک علامتی رسم تھی۔ کہ لڑکی کے جانے کے بعد بھی اس گھر میں رزق کی کمی نہ ہو۔ یہ رسم ہمیشہ ہنستے کھیلتے کی جاتی تھی۔ لیکن بنجو کا معاملہ اور تھا — پیچھے رد ہی کیا گیا تھا — لوگ رو رو کر بے حال ہو رہے تھے۔

ماسی رابو جیراں جیلاں جارو اور رقیہ تو ہچکیوں سے رو رہی تھیں بکو بھی بچوں کی طرح رو رہا تھا — ماسی رابو نے بنجو کو لپٹا کر پیار کیا۔ لڑکیاں بھی اس سے لپٹ گئیں بکو نے سر پہ ہاتھ پھیرا "جا دھئی گھر اپنے —"

سب نے مل کر بنجو کو ڈولے میں بٹھایا۔

بینڈ نے رخصتی دھن چھیڑ دی۔

سکھیروں نے ڈولے پر سے روپے اور چاندی کے پھول نچھاور کر کے

پھینکے۔ اور ڈولہ اٹھا لیا ——
لوگوں کی چیخیں نکل گئیں —— اتنا تو شاید لوگ فضل کی میت اُٹھنے پر بھی نہ روئے تھے۔ جتنا نجو کا ڈولہ اُٹھنے پر رو رہے تھے۔
ہڑیالے پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ اندھیرا اُتر آیا۔
لیکن
ہڑیالہ تو آج موقعہ روشنی تھی۔ اتنے گیس جل رہے تھے کہ شمار نہ کئے جا سکتے تھے —— آتش بازی چھوٹ رہی تھی مشعلیں جل رہی تھیں۔ مسرور ہنگامہ اور شور شرابا اتنا تھا۔ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ڈھولک پیٹی جا رہی تھی۔ ڈھول تاشہ بج رہا تھا۔
سوہنی کے بینڈ نے واپس ہونے سے پہلے سکھیرے کی حویلی کے بڑے پھاٹک پر سلامی کی مسرور سی دھن بجائی۔
مبارک سلامت کے فاتحانہ شور میں نجو نے ڈولے سے باہر قدم نکالا۔ گولے چھوڑے گئے۔ بھنگڑہ ڈالا گیا۔ پورا پنڈ اس خوشی میں شریک ہوا ——
رات نجو کو حویلی کے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ رنگین پایوں اور اونچے رنگین تکئے والے پلنگ پر جس میں گھنگھرو اور گھنٹیاں لگی تھیں۔ زربفت کی چادر اور تکئے پڑے تھے۔ نجو بھاری گوٹے والے دوپٹے کا گھونگٹ نکالے بیٹھی تھی۔
اس کمرے کو تاج نے بڑے چاؤ سے کچھ شہری طرز پر سنوارا تھا محرابی دروں والی کھڑکیوں اور دروازہ پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ قالین چمک رہا تھا۔ اور کونوں میں بڑی بڑی چمنیوں والے پیتل کے لیمپ

جگمگا رہے تھے۔ ایک طرف رنگین پیڑھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اور
تیل کے کام والی اونچی پیڑھیاں بھی پڑی تھیں۔
پلنگ کی سرخ زربفت کی چادر پر پھول بکھرے تھے۔ فضا خوشبو
سے معطر تھی۔

رات گئے دوستوں رشتہ داروں سے پلہ چھڑا کر تاج جھومتا ہوا کمرے
میں آیا —— نگاہِ شوق بے تاب تھی۔ دروازے کا کنڈہ چڑھا کر وہ
ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا پلنگ کے قریب آگیا۔
چند لمحے کھڑا رہا۔

وہ بے حد مسرور تھا۔
زندگی میں اس نے عورت کے مقابلے میں کبھی شکست نہ کھائی تھی۔
جسے چاہا تھا حاصل کر لیا تھا۔
اور
بخو
کو حاصل کرنا تو اس کی زندگی کی شاید سب سے بڑی فتح تھی۔
وہ فتح کے نشے سے ڈولتا پلنگ کے کنارے پر عین بخو کے ساتھ
بیٹھ گیا۔ شوق و تجسس سے چند لمحے اس چیلکی سی گٹھڑی کو تکتا رہا۔
"بخو" اس نے وفورِ شوق سے پکارا۔ وہ چپ رہی
"بخو" اس نے دوبارہ پکارا بخو کے وجود نے اضطراری سی
حرکت کی۔
آتشِ شوق بھڑک اٹھی تھی۔ تاج ذرا کھسک کر آگے ہوا۔ بخو کا
گھونگٹ الٹنے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"سکھیرے" نجو نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا گھونگٹ خود ہی اُلٹ دیا۔

تاج ششدر سا ہوا۔ نجو کے اس انداز کی سمجھ نہ آئی۔

وہ سراپا انتقام تھی ـــ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے جو [illegible] رہا تھا ـــ وہ مضبوط اور مستحکم آواز میں بولی "میرے دیر [illegible] قاتلا ـــــ"

نجو کا دوپٹے میں ڈھکا ہاتھ باہر نکلا ـــ اور تاج کے کچھ [illegible] سے پہلے اس ہاتھ میں پکڑا آبدار خنجر سکھیرے کی چھاتی میں اُتر گیا [illegible]

"آوخ ـــ خ ـــ خ ـــــ" تاج کو جھٹکا لگا [illegible] عجیب سی چیخ نما آواز نکلی ـــــ چھاتی سے خون اُبل پڑا۔ اس [illegible] ہاتھ چھاتی پر رکھ لیا۔

نجو نے خنجر کھینچا دوسرا وار کرنے کو تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود تاج خنجر پکڑنے کو جھپکا۔

شاید وہ خنجر جھپٹ کر نجو پر وار کر دیتا۔

لیکن

مزاحمت کے دوران سنسناتی ہوئی گولی آئی۔

اور

سکھیرے کے سینے کے پار ہو گئی۔

اک چیخ اُبھری اور وہ تیورا کر پلنگ سے گرا۔ دوہرا ہو کر قالین پر لوٹنے لگا۔

نجو

ے گولی والی سمت دیکھا۔
ھڑکی سے چھلانگ لگاکر اندر کود آئی۔
" نجو کے بے رنگ ہونٹوں سے صدا نکلی۔ اس کا خنجر
یا۔
وحشی درندہ لگ رہی تھی۔ اس نے تڑپتے سکھیرے کو ٹھوکر
حرامی — ام تم کو چوڑے گا کبھی — ؟ تکہ بوٹی
مارا " وہ آگے بڑھی

س پکڑے خنجر کو دیکھا۔

راس کے ہاتھ سے چھین کر بولی "یہ امارا ہاتھ سے مرے گا۔
گا — ام اس کا قیمہ کرے گا — تمارا بھائی کا بدلہ لے گا۔
لے گا "
ناج کے سینے پر خنجر سے وار کرنے لگی۔

پر گھر والے مہمان اور پنڈ کے لوگ اس کمرے کی طرف
ے ——— کھڑکیاں کھٹکھٹائیں۔

جب دروازے اور کھڑکیاں نہ کھلیں۔
تو
توڑ کر اندر آ گئے
انہوں نے
جو منظر دیکھا۔
سکتہ سا ہو گیا۔ سب کو
گل پردشے
سکھیرے کی خون میں لت پت لاش کے سینے پر دیوانہ وار
سے وار کر رہی تھی۔
اور
پلنگ کے قریب بجو
خون میں ڈوبے سکھیرے کے سر اور چہرے کو تکتے
تھپڑے لگا رہی تھی۔
چیخ و پکار سے جھنڈ عروسی ماتم کدہ بن گیا۔
لوگوں نے آگے بڑھ کر بڑی مشکلوں سے گل پردشے کو پکڑ لیا
جو خونخوار نظروں سے سکھیرے کو تکتے ہوئے پاگلوں کی طرح بو
جا رہی تھی۔
انہوں نے بجو کو بھی سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ جو دیوانہ وا
لگا رہی تھی۔
لوگ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ بھائی کا چرکہ کھانے کے بعد دولھا کا یہ بر
حشر دیکھ کر غم کی ماری لڑکی صدمے سے پاگل ہو گئی ہے

ی اپنے دیر کے سہرے کی خون میں ڈوبی لڑیاں دیکھتی.
ے اس میں اپنے دیر کا چہرہ نظر آنے لگتا تھا۔ یہ چہرہ
ا اور تاج سکھیرے کا چہرہ بن جاتا — پھر میں — میں
ے کی لڑیوں کو کپڑوں کو چوم کر قسم کھائی تھی۔ کہ اپنے دیر
ے سے اسی طرح لوں گی — میں اس طرح بدلہ نہ
ح کو قرار نہ آتا اور میں بھی ساری عمر تڑپتی رہتی۔
دلہ لے لیا —"

کے برسوں بعد جب بجو قانون اور کچہری کے چکروں
یں اس کی دلہن بن کر بیٹھی — تو راجو کے پوچھنے
ے سناتے ہوئے اپنی قسم کے متعلق بھی بتایا۔
وں ساز آنکھوں کو پھیلائے بت بنا اسے دیکھ

ہ چپ ہوئی تو اس نے بجو کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر

بے اختیارانہ انداز میں کہا " او تو کتنی خطرناک۔۔۔
بخو نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنا چہ
کر کہا " جس تن لگیاں۔ سو تن جانے ـــــ "
" لگیاں تو میرے تن بھی کچھ کم نہ تھیں ـــ بخو ـــ وہ پٹھانی
ثابت نہ ہو جاتی تو ـــــ "
" تو میں پھانسی چڑھ جاتی "
" بخو ـــ پھر میں کیا کرتا ـــــ "
" تو میری قبر کا مجاور بن کر ساری عمر گزار دیتا ـــــ "
وہ مسکرا دی اور راجو نے بے اختیاری سے اسے بازوؤں میں
لیا۔

رضیہ بٹ
۷، ڈی سی روڈ
گوجرانوالہ

Khuda Bakhsh Library
Acc. No 22934 19.12.92

KBOPL
U891.4393 R35Z
AC22934